یادوں کی کہکشاں

مادرِ ملتؒ کے ساتھ
گذرے ہوئے لمحات



ثریا کے ایچ خورشید



مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ

یادوں کی کہکشاں

مادرِ ملتؒ کے ساتھ فلیگ سٹاف ہاؤس میں گزرے ہوئے لمحے

ثریا کے ایچ خورشید



نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

کتاب	:	یادوں کی کہکشاں
مؤلف		ثریا کے ایچ خورشید
ناشر	:	نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن، لاہور
مطبع	:	نظریۂ پاکستان پرنٹرز، لاہور
زیرِ نگرانی		رفاقت ریاض
سرِ ورق	:	محمود حسن رومی' عمران اسحاق
مشاورت	:	ڈاکٹر سرفراز حسین مرزا' رضوان احمد مجاہد
سالِ اشاعت	:	مئی 2004ء
تعدادِ اشاعت	:	1000 کتب
قیمت		250 روپے

Published By

Nazaria-i-Pakistan Foundation

Madar-i-Millat Park, Shahrah-i-Quaid-i-Azam, Lahore.

E-mail: foundation@nazariapak.info *Web:* www.nazariapak.info

Ph. 9201213-9201214 *Fax.* 9202930

Printed at: Nazaria-i-Pakistan Printers
10-Mutlan Road, Lahore. Ph: 7466975

انتساب

اپنے مرحوم شوہرؒ کے ایچ خورشید کے نام
جنہیں 1944ء سے 1948ء کے تاریخ
ساز دور میں قائداعظم محمد علی جناحؒ کے
پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرنے کا
اعزاز حاصل رہا۔ بعدازاں آپ کئی سال
تک مادرِ ملتؒ کے ساتھ فلیگ سٹاف ہاؤس
میں مقیم رہے۔



فہرست

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

فہرست

ڈائری کے اوراق



مادرِ ملتؒ کے ایک خط کا عکس







K. H Khurshid

154 Gloucester Place

London

N.W.1.



that it was wrong on his part to have conveyed this wrong impression to you - I do not want you to feel that you are under any obligation to me whatsoever I have arranged to send you to England because I know Quaid-e-azam would have done something for you if he had been alive therefore in doing what I can for you is to fulfil his wish and beside you have served Quaid-e-azam & the nation well - I hope you will after you pass out and equip yourself will return & serve the nation & the country with double zeal & enthusiasm.

I have given instructions to Habib Bank to remit the allowance

---

Karachi
27th May 52

Dear Khurshed

From your letter of the 15th May I find that you are very much upset about the letter received from your friend Khurshid Ahmed - When I met him in Lahore he mentioned to me that you were writing Quaid-e-Azam's Biography I was rather surprised but told him I would write to you myself directly & enquire from you as I do not believe in sending messages as it might be misconstrued I did not do so as it escaped my mind and besides I did not believe him All I can say is

Karachi
27th May, 1952

Dear Khurshid,

From your letter of the 15th May I find that you are very much upset about the letter received from your friend Khurshid Ahmad. When I met him in Lahore he mentioned to me that you are writing Quaid-e-Azam's Biography. I was rather surprised but told him I would write to you myself directly and enquire from you as I do not believe in sending message, as it might be misconstrued. I did not do so as it escaped my mind and besides I did not believe him. All I can say is that it was wrong on his part to have conveyed this wrong impression to you. I do not want you to feel that you are under any obligation to me whatsoever. I have arranged to send you to England because I know Quaid-e-Azam would have done something for you if he had been alive therefore in doing what I can for you is to fulfill his wish and beside you have served Quaid-e-Azam and the nation well I hope you will after you pass out and equipped yourself will return and serve the nation and the country with double zeal and enthusiasm. I have given instructions to Habib Bank to remit the allowance to you from this month as mentioned in your letter. If there is any thing please write to them. Karachi is having a long spell of sweltering heat this year. Do write to me sometime to keep me in touch with the developments that take place there.

I hope you are keeping well.

Yours sincerely
Sd-
Fatima Jinnah

To,
K.H. Khurshid,
154-Gloucester Place,
London,
N.W.I.

to you from this month as mentioned in your letter If there is any thing please write to them

Karachi is having a long spell of sweltering heat this year Do write to me sometime & keep me in touch with the developements that take place there

I hope you are keeping well

Yours Sincerely
Fatima Jinnah

تمہیدی کلمات

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ابتدائیہ

2003ء سے قبل مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کی ہمشیرہ ہونے کے باوجود عوام کے حافظے سے اوجھل تھیں۔ اخبارات کے کچھ قاری اگر ان سے واقف بھی تھے تو ان کی معلومات بے حد محدود تھیں۔ وہ صرف یہ جانتے تھے کہ مادرِ ملتؒ قائداعظمؒ کی ہمشیرہ تھیں جو ان کے ساتھ رہتی تھیں تاکہ اپنے عظیم بھائی کا خیال رکھ سکیں کیونکہ بابائے قوم کی صحت ان کی بے پناہ سیاسی سرگرمیوں کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ مادرِ ملتؒ کے بارے میں لٹریچر نایاب تھا۔ تاہم سالِ رواں کو بطور سالِ مادرِ ملتؒ منانے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو بچے بچے کی زبان پر مادرِ ملتؒ کا نام آ گیا دوسرے ان کے بارے میں لٹریچر کی جو کمی محسوس ہو رہی تھی وہ دور ہو گئی اور ان کے بارے میں اتنی خوبصورت اور معلومات افزا کتابیں مارکیٹ میں آ گئیں کہ ان کی حیات و خدمات کے وہ گوشے منظرِ عام پر آ گئے جو ابھی تک عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔

"یادوں کی کہکشاں" مادرِ ملتؒ کے موضوع پر نفسِ مضمون کے لحاظ سے ایک منفرد کتاب ہے۔ اس کی مصنفہ محترمہ بیگم ثریا کے ایچ خورشید کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ خاصی مدت تک مادرِ ملتؒ کے ہمراہ فلیگ سٹاف ہاؤس (اب مادرِ ملتؒ ہاؤس) میں قیام پذیر رہیں۔ انہوں نے مادرِ ملتؒ کے روزمرہ کے معمولات کو نہایت قریب سے دیکھا۔ ان کی شخصیت اس لیے بھی سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نہایت اہم ہے کہ اگر انہوں نے مادرِ ملتؒ کے ساتھ ایک عرصہ گزارا تو ان کے شوہر کے ایچ

محمد طارق اقبال پاکستانی ریوائنڈ ڈاٹ کام

خورشید قائداعظم کے ہمراہ ان کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے رہے۔ جب محترمہ ثریا خورشید سٹاف ہاؤس میں رہائش پذیر تھیں تو کے ایچ خورشید بھی ان کے ہمراہ تھے۔اس طرح وہ بھی اس امر کے عینی شاہد تھے کہ قائداعظمؒ اور مادرِ ملتؒ کے مہ وسال کس طرح گزرتے تھے۔ کے ایچ خورشید کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ قوم سے جدا ہوگئے لیکن بفضلہ تعالیٰ ان کی بیگم محترمہ ثریا خورشید اپنی یادوں کے چراغ روشن کرکے قوم کے دلوں کو منور کرنے میں سرگرمِ عمل ہیں۔ پہلے یہ کتاب ''مادرِ ملتؒ کے شب و روز'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی اور کافی عرصے سے مارکیٹ میں دستیاب نہیں تھی۔ اب نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن نے سالِ مادرِ ملتؒ کے حوالے سے اس کتاب کا نظرثانی شدہ ایڈیشن بعض اضافوں کے ساتھ ''یادوں کی کہکشاں'' کے عنوان سے شائع کرکے ایک بہت اہم قومی ضرورت کو پورا کیا ہے۔

مادرِ ملتؒ پر اس سال کے دوران جو کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں ان میں زیادہ زور سیاسی اور سماجی معاملات پر ان کے بیانات اور تقریروں پر دیا گیا ہے۔لیکن اس کتاب ''یادوں کی کہکشاں'' میں بتایا گیا ہے کہ مادرِ ملتؒ کے شب و روز کس طرح گزرتے تھے۔محترمہ ثریا خورشید نے مادرِ ملتؒ کی دعوت پر فلیگ سٹاف ہاؤس میں رہ کر ان کے رہن سہن کو جس طرح دیکھا اور ان کی رات دن کی مصروفیات کا جس طرح مشاہدہ کیا اس کتاب میں انہوں نے اسے من و عن بیان کر دیا ہے۔ ان کے یہ مشاہدات سبق آموز بھی ہیں اور دلچسپ بھی۔ یقیناً اس کتاب کے بغیر محبانِ مادرِ ملتؒ اور مصنفین کی لائبریریاں نامکمل اور علمی لحاظ سے تشنہ رہیں گی۔

مجید نظامی

چیئرمین، نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن

حرفِ آغاز

مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ نے تحریک پاکستان کے دوران اور قیام پاکستان کے بعد ملک و قوم کی اُمنگوں اور آرزوؤں کی جس طرح آبیاری کی اور قائداعظمؒ کے افکار و کردار کا پرچم جس طرح سربلند رکھا اس کا عوامی سطح پر ادراک حال ہی میں ہوا ہے۔ اس کی اہم وجہ 2003ء کو سالِ مادرِ ملتؒ قرار دینا ہے۔ نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن کی تجویز پر وزیراعظم پاکستان میر ظفر اللہ خان جمالی نے جس گرمجوشی سے ملک بھر میں سالِ مادرِ ملتؒ منانے کے لئے احکامات جاری کئے وہ قابلِ ستائش ہیں۔ ان اقدامات کے سبب لوگوں میں مادرِ ملتؒ کی زندگی اور سرگرمیوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کا شوق بڑھا ہے۔

نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ایک ایسی کتاب کے نظر ثانی شدہ ایڈیشن کو شائع کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے جو مادرِ ملتؒ کے عادات و اطوار اور خیالات پر ایک مستند تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ فاضل مصنفہ، قائداعظمؒ کے مشہور سیکرٹری کے ایچ خورشید مرحوم کی رفیقۂ حیات ہیں۔ وہ 1956ء میں اپنی شادی کے فوراً بعد فلیگ سٹاف ہاؤس میں مادرِ ملتؒ کے ساتھ رہائش پذیر رہیں اور بعد ازاں ان کی وفات تک اپنے شوہر کے ہمراہ گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضر ہوتی رہیں۔ اس دوران اُنہوں نے باقاعدگی سے روزنامچہ لکھا جو نامکمل شکل میں 1976ء میں ایک مقامی پبلشر نے شائع کیا اور بعد ازاں خود مصنفہ نے اسے 1998ء میں طبع کیا۔ اب اس تصنیف کا نظرثانی شدہ ایڈیشن کئی اضافوں اور نئی ترتیب کے ساتھ نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن نے شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

یہ روزنامچہ بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں مادرِ ملتؒ ایک نہایت متوازن اور حالات و واقعات پر گہری نظر رکھنے والی شخصیت نظر آتی ہیں۔ خوددار اور باوقار، خوش پوش اور شگفتہ مزاج، لطافت اور نفاست کا پیکر، گھریلو معاملات سے لے کر ملکی سیاسیات پر پُرمغز اور مدلل گفتگو، سخن آرائی، سماجی خدمات کے لئے ہمیشہ کمربستہ، مشہور ملکی اور غیر ملکی شخصیات کی کردار شناس، کفایت شعار اور اسلامی شعائر کی پابند اور سب سے بڑھ کر قائداعظمؒ کے جمہوری اور عزتِ نفس سے لبریز اصولوں کی بے باک علمبردار!

مطالعہ کی سہولت کی خاطر زیرِ نظر تصنیف کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تمہیدی کلمات، یادوں کے جھروکے، ڈائری کے اوراق اور تصاویر۔ ڈائری کے اوراق کے عنوانات مندرجات کی مکمل عکاسی نہیں کرتے اس لئے کہ مادرِ ملتؒ کی باتوں اور تبصروں میں بہت تنوع تھا۔ یہ عنوانات گفتگو کے کسی نہ کسی پہلو کے حوالے سے محض علامتی ہیں لیکن ان میں مادرِ ملتؒ کے رواں دواں اور متحرک شب و روز کی جھلک نظر آتی ہے۔

نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن ثریا کے ایچ خورشید کی سپاس گذار ہے کہ انہوں نے قائداعظمؒ کی عظیم بہن سے متعلق اپنے ذاتی مشاہدات کو خوبصورت اور بے تکلفانہ ادبی انداز میں سپردِ قلم کر کے بیانیہ تاریخ نویسی میں ایک قابلِ قدر اضافہ کیا ہے اور موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے تحریکِ پاکستان کے ایک نہایت اہم کردار کی سرگرمیوں کو محفوظ کر دیا ہے۔

ڈاکٹر رفیق احمد
سیکرٹری

مستند روزنامچہ

کسی قوم کی سیرت و کردار کی تعمیر میں مشاہیرِ قوم کی شخصیت کا اثر و نفوذ بہت دخل رکھتا ہے۔ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کی شخصیت بلاشبہ پاکیزہ سیرت اور پختہ کردار کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ نابغہ روزگار بھی تھی۔ ان کی سیرت، شخصیت اور بلند و پاکیزہ خیالات کا مطالعہ ملک و ملت کی تعمیر و ترقی میں یقیناً مدد و معاون ثابت ہوگا۔

بظاہر یہ کتاب ان متفرق یادداشتوں کا ایک مجموعہ ہے جو آج سے کئی برس قبل روزنامچہ (ڈائری) کے طور پر لکھی گئیں، لیکن اس اعتبار سے کہ ان کا موضوع خاص کر محترمہ فاطمہ جناحؒ ہی کی شخصیت ہے محترمہ کی زندگی کے شب و روز کا تفصیلی جائزہ، ان کی زندگی کے خارجی، داخلی عوامل اور ان کے زمانے کے حالات و مسائل کی پرچھائیاں اس کتاب میں پائی جاتی ہیں جس سے کتاب کی اہمیت اور افادیت میں گرانقدر اضافہ ہو گیا ہے۔

آپ نے محترمہ فاطمہ جناحؒ کی شخصیت کے حقیقی خدوخال کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس سے وہ اور بھی دلکش اور پُرکشش نظر آتے ہیں۔ آپ نے مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اپنے کانوں سے ان کی باتیں سنیں، سالہا سال تک ان کا قرب آپ کو میسر آیا، اس بنیاد پر آپ نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اور اپنے تاثرات پیش کیے ہیں ان سے آپ کی اس تحریر کو محض ڈائری نہیں بلکہ محترمہ فاطمہ جناحؒ کی شخصیت پر ایک سیر حاصل مستند اور مستقل تصنیف کا درجہ مل گیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ محترمہ فاطمہ جناحؒ کو قدرت نے ذہن رسا عطا کیا تھا۔ وہ ہمہ جوئی اور ہمہ سوئی فکر کی حامل تھیں یہی سبب ہے کہ زندگی کے ہر شعبے پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ سیاسیات ہو کہ معاشیات، اقتصادی امور ہوں کہ معاشرتی مسائل وہ یکساں طور پر ایک ماہر علم وفن کی طرح مسائل کا حل پیش کرتے اور سوالات کا اطمینان بخش جواب دیتے دکھائی دیتی ہیں۔

میرے نزدیک شخصیت نگاری نہ تو ہجو گوئی کا نام ہے نہ قصیدہ خوانی کا بلکہ یہ ایک ایسی ادبی صنف ہے جس میں اپنے مشاہدے کی گہرائی، اظہارِ بیان کی توانائی اور گفتار و کردار کی پرکھ کو کام میں لایا جاتا ہے، جو بات جس ماحول میں کہی جاتی ہے یا جس فضا میں واقع ہوتی ہے وہ اسی طرح سے احاطہ تحریر میں لائی جاتی ہے۔ شخصیت نگار یہاں صرف ذات سے بحث کرتا ہے ذاتیات سے نہیں۔ اگر ذات اور ذاتیات باہم اس طرح مل جائیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہ کیا جا سکے تو پھر اسے شخصیت نگاری نہیں کہا جا سکتا۔ میں یہ دیکھ کر خوش ہوں کہ مصنفہ اس معیار پر بھی پوری اتریں اور شخصیت نگاری میں بھی کامیاب رہیں۔

یہاں میرا اشارہ روزانہ ڈاک کے ان خطوط کی طرف ہے جن میں کچھ حضرات نے محترمہ فاطمہ جناحؒ کو بعض اوقات مالی امداد کے لیے بھی لکھا تھا اور یہ بات ان کے لیے بڑی روحانی اور ذہنی کوفت کا باعث بنی۔ آپ نے اپنی کتاب میں جس طریقے سے اس بات کا ذکر کیا ہے اس سے محترمہ فاطمہ جناحؒ کی شخصیت مجروح ہونے کی بجائے اور نکھر کر سامنے آ گئی ہے اور ان کی شخصیت کا ایک پہلو اور نمایاں ہوا ہے اور وہ ہے EGO معرفت نفس خود اعتمادی اور خودداری۔

مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کا ماضی اب ایک حقیقت بن چکا ہے۔ بقول شخصے حقیقت ایک تراشے ہوئے ہیرے کی مانند ہوتی ہے اور ہر صاحبِ علم وفن اس کے کسی نئے پہلو کی طرف یا تو اشارے کنائے سے توجہ دلاتا ہے یا ایسی زبان میں بات کرتا ہے جس سے نفس مضمون فوراً ذہن میں آ جائے، آپ کی تحریر میں دونوں خوبیاں بدرجہ کمال موجود ہیں۔

خیر اندیش

چیف جسٹس (ر) سردار محمد اقبال

محمد طارق اقبال
پاکستانی ویو پوائنٹ
ڈاٹ کام

قابل ستائش کاوش

کسی نے کیا خوب کہا ہے اور سچ کہا ہے کہ بڑے لوگ کتابوں میں زیادہ اور زندگی میں کم ملتے ہیں۔ کے ایچ خورشید اور ان کی اہلیہ ثریا خورشید کی خوش بختی قابل رشک ہے کہ ایک کو نوعمری ہی میں قائداعظم نے اپنا سیکرٹری منتخب کر لیا اور یوں انہیں ایک عظیم منفرد مدبر سیاستدان اور تاریخ ساز شخصیت کا قرب حاصل ہوا اور ان سے فیض یاب ہونے کا موقعہ ملا تو دوسری طرف ثریا خورشید فلیگ سٹاف ہاؤس کراچی میں قائداعظمؒ کی ہمشیرہ اور زندگی کی ساتھی محترمہ فاطمہ جناحؒ کی سیاسی اور نجی مصروفیات میں معاونت کے لیے ان کے ساتھ رہیں۔ اس دوران انہوں نے مادرِ ملتؒ کی سیاسی سرگرمیوں اور ان کی گھریلو زندگی کے بارے میں انمول یادوں کو ڈائری کی صورت میں محفوظ کر لیا۔ یہ قابلِ قدر کاوش قابلِ ستائش ہے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں اور کامیاب ازدواجی گھریلو زندگی کے بارے میں مادرِ ملتؒ کا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ حیرت انگیز ہے۔ وہ سیاسی مصروفیات کے باوجود ایک خاتونِ خانہ کی حیثیت سے غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ اس سے استفادہ کر کے ایک اچھے صاف ستھرے معاشرے کا قیام عمل میں آ سکتا ہے اور زیرِ نظر کتاب کی مصنفہ کا مقصد بھی یہی ہے۔ ثریا خورشید کا اسلوب دلکش اور عام فہم ہے۔ ادب کا ذوق انہیں ورثہ میں ملا۔ کتاب ان کی ساتھی اور روزمرہ کی ڈائری لکھنا ان کی عادت۔

ڈیوس روڈ، لاہور پر واقعہ ہماری رہائش گاہ ممدوٹ ولا کو بابائے قوم بانی پاکستان محمد علی جناحؒ اور ان کی عظیم ہمشیرہ مادرِ ملتؒ کی متعدد بار قیام پذیری کا تاریخی

اعزاز حاصل ہے اور ہمارے خاندان کو ان کی مہمان داری کا شرف حاصل رہا ہے۔ میری خوش نصیبی ہے کہ میرا شمار اپنے خاندان کے ان چند افراد میں ہوتا ہے۔

محترمہ فاطمہ جناحؒ کی باتیں دلچسپ، غور طلب اور قابل تقلید ہیں۔ اگر آپ نے ان کے عنوانِ حیات کو اپنے لیے چراغ راہ بنایا تو سمجھئے آپ کی زندگی سنور گئی اور ثریا خورشید کی تمنا پوری ہوئی۔

محمد اسلم ممدوٹ
ممدوٹ ولا ۔ لاہور
5 فروری 1998ء

ڈائری---ایک معجزہ

"محترمہ فاطمہ جناحؒ کے شب و روز" بیگم ثریا خورشید کی یہ کتاب ایک معجزے کے طور پر رونما ہوئی۔

میری ملاقات ان سے 1956ء میں میرے ہی گھر پر ہوئی۔ ان دنوں ان کا قیام محترمہ فاطمہ جناحؒ کے ہاں فلیگ سٹاف ہاؤس میں تھا۔ ان ہی دنوں مجھے پتہ چلا کہ ثریا افسانہ نگار بھی ہیں اور ملاقات کے شوق میں میں نے اپنے گھر کے سالانہ مشاعرے میں ان کو مدعو کرلیا' لیکن اس وقت کی مصروفیت کے باعث میں ان سے باتیں نہ کرسکی۔

بعد کو کراچی میں ان کا قیام رہا اور کئی ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ عجیب سی بات تھی' نہ معلوم کیوں ثریا خورشید سے مل کر میں ان کے افسانوں کے متعلق پوچھنا بھول جاتی اور یہ سوچ کر کہ وہ کشمیر کے حسین شہر سرینگر کی رہنے والی ہیں اس وادی جنت نظیر کے لالہ زاروں میں کھو جاتی جہاں کبھی میرا بھی گزر ہوا تھا۔

"اوہ!" میں سوچتی "وہ کوہساروں کے حسین سلسلے' وہ بہتی اور شور مچاتی آبشاریں' وہ چاروں طرف بکھری ہوئی حسین پھولوں کی مہک' وہ ڈل جھیل کے دل آویز نظارے' وہ شکاروں پر سرسراتے ریشمی پردوں کے اندر مخملیں گدیلوں پر رنگین اور پُر شباب جوڑوں کی سرگوشیاں اور پھر ہر شام کنارے کھڑی ہاؤس بوٹوں کی روشنیاں جب ڈل جھیل پر عکس انداز ہوتیں تو تہہ آب ایک نیا جگمگاتا ہوا شہر نظر آتا۔ مانجھیوں کا تانیں لگانا اور پھر چنار کے وہ پُروقار درخت' کون کون سی چیز فراموش کی

جاسکتی ہے اور پھر اس حسین دیس کی رہنے والی ثریا خورشید جہاں ہر طرف حسن ہی حسن سا بکھرا رہتا۔

میری خاموشی ایک طرح بجا تھی وہ تو خود ہی ایک افسانوی حقیقت تھیں' اب ان کے افسانوں کے متعلق کیا پوچھوں' لیکن تب بھی ایک جستجو سی تھی اور اب ایک نامعلوم سی کیفیت کے تحت میں نے ان کے افسانے پڑھنے شروع کردیے۔ ان کے افسانوں کے کردار ہمیشہ ہی ایسے معلوم ہوتے جیسے کہ یہ حقیقی ہوں۔ تصنع اور بناوٹ سے پاک اور روزمرہ کی زندگی سے قریب۔ میں نے ان کے وہ مضامین بھی پڑھے جو کبھی کبھی انہوں نے تاریخ پر لکھے اور ان بناوٹی کہانیوں کو جو ہماری تاریخ کو مسخ کر کے پیش کرتی ہیں' اپنی تحقیق سے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ بعد کو مجھے پتہ چلا کہ وہ دراصل تاریخ کی طالبہ رہی ہیں اور تاریخ میں ایم اے ہیں۔

اس سب کے باوجود میں سوچتی کہ اب تک ثریا خورشید کی کوئی مکمل کتاب منظرِ عام پر نہیں آئی۔ پھر وہ لاہور رہنے لگیں اور اب فاصلہ بہت بڑھ گیا۔ لاہور اگر کبھی سال دو سال بعد آئی تو میں نے ان سے کہا بھی کہ "ثریا تم اپنی کوئی کتاب کیوں شائع نہیں کراتیں؟" وہ مسکرا کر ایک ہی جواب دے دیتیں: "جی' کبھی خیال ہی نہ آیا۔ میں تو شوقیہ کبھی کبھی لکھ لیتی ہوں۔"

آخر مجھے سوچنا پڑا کہ بعض لوگ نام و نمود کے شائق نہیں ہوتے' ان ہی میں سے ایک ثریا بھی ہیں اور ایسے لوگوں کو آمادہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ورنہ آج کل تو دھڑا دھڑ لڑکیوں کے نام سے ناول چھپ رہے ہیں اور بعض خواتین تو اب پیشے کے طور پر ڈرامہ نگاری کو اپنا چکی ہیں جو ایک اچھی چیز ہے کیونکہ ٹی وی' ریڈیو اور فلم ہر چیز میں افسانہ یا ڈرامہ درکار ہے۔ لیکن افسانے جاندار ہوں اور کردار حقیقی محسوس ہوں تب ہی نا۔

بہرحال ہم نے محسوس کیا کہ ثریا خورشید کو شہرت اور نام ونمود نہیں چاہیے۔ بس وہ تو افسانہ لکھ کر اپنے شوق کی تکمیل کر لیتی ہیں اور اب ہم نے ان سے اس موضوع پر بات کرنا ہی چھوڑ دیا۔ مگر...... اس دفعہ جو میں لاہور آئی تو میں اتفاق سے ان ہی کے گھر ٹھہری اور ایک روز باتوں باتوں میں ان کے منہ سے نکل گیا کہ محترمہ فاطمہ جناحؒ کے ہاں رہتے ہوئے میں ڈائری لکھا کرتی تھی۔

"ڈائری؟" میں نے حیرت سے کہا "کہاں ہے وہ ڈائری' ذرا دکھاؤ تو"۔

تلاشِ بسیار کے بعد وہ ڈائری ملی اور میں نے اسے پڑھنا شروع کیا۔ میں نے اس ڈائری کے ورق ورق میں دلچسپی محسوس کی اور بغیر ختم کئے نہ رہ سکی۔ کچھ تو محترمہ فاطمہ جناحؒ کا تذکرہ جن سے مجھے خود بھی والہانہ عقیدت ہے اور کچھ بیگم ثریا خورشید کا اندازِ بیاں...... اور پھر میں نے یہ بھی سوچا کہ وہ شادی کے بعد محترمہ ہی کے گھر آئی تھیں تو یہ ایک عروس نَو کے خیالات ہیں۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ کے لئے ایک ایسی لڑکی جو سہمی سہمی خود نئی زندگی سے دوچار ہوا اور انتہائی ناتجربہ کار بھی ہو اور محترمہ فاطمہ جناحؒ جیسی ٹھوس طبیعت اور سنجیدہ مزاج خاتون کے متعلق کیا لکھتی ہے۔

یہ وہ محترمہ فاطمہ جناحؒ ہیں جن کو کہ عوام میں بے حد سخت مزاج مشہور کیا گیا ہے۔ وہ عوام جو ان کی شخصیت کے اصل پہلو سے ناآشنا ہیں' یہ بے چارے کتنے بھولے ہیں کہ اپنے محبوب قائدؒ کی اس بہن کو جس نے بھائی کو کامیابیوں سے ہمکنار کرنے کی خاطر پوری عمر تج دی اب تک نہیں سمجھ سکے اور ان کی صاف گوئی کو بدمزاجی کے نام سے مشہور کر دیا گیا۔ کیونکہ یہ ڈائری ان تمام باتوں کا جواب ہے جو محترمہ فاطمہ جناحؒ کے لیے مشہور کی گئی ہیں۔ اس لیے میں نے بیگم ثریا خورشید کو مشورہ دیا کہ وہ ایک حقیقت کو پوشیدہ نہ رکھیں اور یہ ڈائری کتابی شکل میں شائع کر دی جائے۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ کتاب شائع ہو کر منظرِ عام پر آ رہی ہے۔

یہ ڈائری انہوں نے جن جذبات کے تحت لکھی ان پر غالب کا یہ شعر صادق آتا ہے:

وہی اک بات ہے' جو یاں نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ' باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

کتاب کے متعلق کچھ کہنا عبث ہے:

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

مگر یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ عبارت اور یہ تحریر ان کے ابتدائی دور کی تحریر ہے۔ اس ڈائری کو آج سے بیس سال قبل انہوں نے لکھا تھا۔

بیگم ثریا خورشید کے والد ڈاکٹر نور حسین جموں و کشمیر کے مشہور ڈاکٹر تھے' جو تقسیم ہند کے بعد سیالکوٹ میں بس گئے۔ وہ وہاں کے ایک اعلیٰ خاندان کے فرد تھے۔ 1956ء میں ثریا کی شادی بیرسٹر خورشید حسن سے ہو گئی جو ان کے چچا زاد تھے۔

اور اب ان کو محترمہ فاطمہ جناحؒ کے پاس کراچی جا کر فلیگ سٹاف ہاؤس میں رہنا تھا جن سے وہ کبھی ملی بھی نہ تھیں اور جن کی کبھی بچپن میں شبیہہ دیکھی تھی۔ وہ یہ سن کر ہی سراسیمہ تھیں کہ ان کو عظیم قائد کی پُروقار بہن کے ساتھ رہنا ہے۔

ایک الہڑ کشمیری دوشیزہ جو نئی نویلی دلہن ہو اور جو شادی کی چھپی چھپی خوشیاں دل میں لیے ایک ایسی جگہ جا رہی ہو جہاں قدم قدم پر لغزش پا کا ڈر ہو' اس کے تصورات کیسے ہوں گے؟ وہ کیا سوچتے ہوئے وہاں پہنچی ہو گی...... ثریا خورشید کے لیے یہ کچھ عجب سے امتحان کا موقع تھا۔

ساتھ ہی یہ اپنی نوعیت کا نئی وضع کا ہنی مون بھی تھا جس کا آج کل انگریزوں کی دیکھا دیکھی ہم میں بھی رواج ہو گیا ہے کہ آج کی دوشیزہ شوہر کے ساتھ ہنی مون

کے تنہا دن گزارنے کسی کوہسار کی سیر کے لیے جاتی ہے۔ مگر یہاں حسین سبزہ زاروں، کوہساروں اور آبشاروں میں پروردہ یہ سادہ سی لڑکی ایک ایسی خاتون کے زیرِ سایہ شادی کے پُرشوق دن گزارنے جا رہی تھی جو انتہائی مزاج دار اور سخت گیر مشہور تھیں۔ ایسے میں محترمہ کو بیگم ثریا خورشید نے جیسا پایا' وہ کتاب سے ظاہر ہے۔

مجھے ان کا اندازِ بیاں بے حد دلچسپ' شگفتہ اور معلومات افزا معلوم ہوا اور میں ان کی تحریر میں کوئی خامی نہ پا سکی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ میں خود اہلِ زبان نہیں ہوں اور اُردو کو میں ایک ایسی زبان سمجھتی ہوں جس میں انتہائی وسعت ہے اور جس میں ہر زبان کے الفاظ سموئے جا سکتے ہیں لیکن اگر اہلِ زبان حضرات کو اس کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو وہ بیگم ثریا خورشید کی پہلی کاوش سمجھ کر نظر انداز کر دیں۔

ساتھ ہی میں عزیزہ محترمہ کو نصیحت کروں گی کہ وہ کسرِ نفسی سے کام نہ لیں اور اپنی دیگر تخلیقات کو شائع کرائیں کیونکہ ان کی تخلیقات اُردو ادب میں ایک بیش قیمت اضافے کا باعث بنیں گی۔

نورالصباح بیگم

5 فروری' 1976ء

(نورالصباح بیگم تحریکِ پاکستان کی سرگرم کارکن تھیں' اب وفات پا چکی ہیں۔)



I

حیات وخدمات

حیاتِ مادرِ ملتؒ

چیدہ چیدہ سرگرمیوں پر ایک نظر

ابتدائی حالات

پیدائش	31 جولائی 1893 (کراچی)۔
والدہ	میٹھی بائی (وفات 14 اپریل 1894)۔
والد	جناح پونجا (وفات 17 اپریل 1901)۔
بھائی اور بہنیں	محمد علی، رحمت، بندے علی، مریم، احمد علی، شیریں، بچو۔
1902	کانوینٹ بورڈنگ سکول باندرہ (بمبئی) میں رجسٹریشن۔
1906	سینٹ پیٹرک ہائی سکول کھنڈالا میں داخلہ۔
1910	بمبئی یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔
1913	سینئیر کیمبرج کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔
1919	احمد ڈینٹل کالج کلکتہ میں داخل ہوئیں۔
1922	دندان سازی کا ڈپلومہ حاصل کیا۔
1923	عبدالرحمن سٹریٹ بمبئی میں اپنا کلینک قائم کیا اور میونسپل کلینک میں جزوقتی طور پر غریبوں کا علاج کرتی رہیں۔
1929	قائداعظمؒ کی بیگم مریم جناح (رتی بائی) کی وفات کے بعد اپنا کلینک

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

بند کر کے قائداعظمؒ کی قیام گاہ پر منتقل ہو گئیں اور بھائی کی زندگی کے آخری سانس تک ان کے ہمراہ رہیں۔

1930 قائداعظمؒ کے ہمراہ لندن میں ہونے والی پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت۔

1934-1931 قائداعظمؒ کے ہمراہ لندن میں قیام۔

قیام پاکستان سے پہلے

1938-1935 آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینا شروع کیا اور قائداعظمؒ کے ہمراہ مسلم لیگ کے جلسوں میں شریک ہونے لگیں۔ 1936ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ بمبئی' 1937ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ اور 1938ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ پٹنہ میں شرکت کی اور اسی اجلاس میں مسلم لیگ ویمن ونگ کی کنوینیز مقرر ہوئیں۔

1939 ویمن مسلم لیگ کی سب کمیٹی کی میٹنگ میں شرکت (قیصر باغ بمبئی)۔

1940 آل انڈیا مسلم لیگ کے ستائیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں قائداعظمؒ کے ہمراہ شرکت۔ اس اجلاس میں مشہور قرارداد پاکستان منظور ہوئی۔

1941 آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ مدراس میں شرکت۔

1942 ☆ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد میں شرکت۔

☆ بلوچستان کی مسلمان خواتین سے خطاب۔

1943 ☆ دہلی ویمن سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ اجلاس کی صدارت۔

☆ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی میں شمولیت۔

☆ قائداعظمؒ پر قاتلانہ حملہ۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ نے ابتدائی طبی امداد مہیا کی۔

☆ قائداعظمؒ کے ہمراہ کوئٹہ میں آمد۔

1946-44 کشمیر، شملہ اور بلوچستان کے دوروں میں قائداعظمؒ کے ہمراہ رہیں۔

1945 دہلی میں مسلم لیگ ویمن سب کمیٹی سے خطاب۔

1946 ☆ زنانہ مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ کراچی میں شرکت۔

☆ سندھ مدرسہ گرلز ہائی سکول کراچی کا سنگ بنیاد رکھا (17 جنوری)

☆ دہلی میں مسلمان خواتین کے عام اجلاس میں تقریر (27 جولائی)

قیام پاکستان کے بعد

1947 ☆ آزادیٔ پاکستان کی آمد کے موقعہ پر دہلی کو مستقل طور پر خیر باد کہہ کر قائداعظمؒ کے ہمراہ کراچی تشریف آوری (7 اگست)۔

☆ قائداعظمؒ کے ہمراہ لیڈی ہدایت اللہ کے ڈنر میں شرکت (19 اگست)۔ قائداعظمؒ نے محترمہ فاطمہ جناحؒ کو زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے یہ تاریخی الفاظ کہے "میری بہن میرے لیے امید اور حوصلہ افزائی کا مستقل سرچشمہ ہے۔ جن دنوں مجھے برطانوی حکومت کے ہاتھوں کسی بھی وقت گرفتاری کا خدشہ تھا تو ان

دنوں میری بہن ہی تھی جو میری ہمت بندھاتی تھی اور جب انقلاب میرے رو برو مجھے گھور رہا تھا، میری بہن جرأت آمیز باتیں کرتی تھی۔ وہ میری صحت کا مستقل خیال رکھتی ہیں''۔

☆ کراچی میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس میں شرکت (11 اگست)۔

☆ انتقال اقتدار کی تقریب میں، دستور ساز اسمبلی میں حاضری (14 اگست)۔

☆ گورنر جنرل کے کراچی کے گھر کا انتظام سنبھال کر کفایت شعاری کے اقدامات (14 اگست)۔

☆ گورنر جنرل ہاؤس میں یوم آزادی کے ڈنر اور قائداعظمؒ کی تقریب حلف برداری میں شرکت۔

☆ قائداعظمؒ کے اعزاز میں کراچی کارپوریشن کے عشائیے میں شرکت (25 اگست)۔

☆ لیڈی میکلیگن کالج لاہور میں خطاب (10 نومبر)۔

☆ لاہور میں انسداد تپ دق کانفرنس کا افتتاح (11 نومبر)

☆ ماما گرلز ہائی سکول کراچی میں جلسۂ تقسیم اسناد میں تقریر (25 نومبر)

☆ قائداعظمؒ کے ہمراہ کئی سرکاری اور غیر سرکاری تقاریب میں شرکت۔

☆ کراچی میں ویمن انڈسٹریل ہوم اور مسلم لیڈیز ٹیکنیکل اینڈ انڈسٹریل ہوم کا افتتاح۔

1948 ☆ 1948ء کے پہلے چند ماہ میں قائداعظمؒ کے ساتھ مشرقی پاکستان،

سرحد اور بلوچستان کے کئی دوروں میں شریک رہیں اور خواتین کے متعدد رفاحی اداروں، مدرسوں اور طالبات کی تنظیموں میں شرکت کر کے ان کو تعمیر پاکستان میں فعال کردار ادا کرنے کی ترغیب دیتی رہیں۔

☆ قائداعظمؒ کے ہمراہ بلوچستان کے سبی دربار میں شمولیت۔

☆ بچوں کی قومی کانفرنس کی صدارت قبول کی۔ اسی سال گورنر جنرل ہاؤس کراچی میں ریڈ کراس سوسائٹی کے اجلاس میں شریک ہوئیں۔ قائد آباد (کراچی) میں مہاجرین کے لیے ڈسپنسری کا افتتاح کیا۔

☆ کرزن ہال ڈھاکہ میں ڈھاکہ ڈسٹرکٹ زنانہ مسلم لیگ کے اجلاس سے خطاب۔

☆ زنانہ مسلم لیگ پشاور کے اجلاس میں تقریر۔

☆ قائداعظمؒ کے ہمراہ زیارت میں آمد۔ قائداعظمؒ کی علالت اور مادر ملت کی والہانہ تیمارداری۔

☆ قائداعظمؒ کو شدید بیماری کی حالت میں کوئٹہ سے کراچی لائیں۔ انتقال کے وقت مادرِ ملتؒ قائداعظمؒ کے ہمراہ تھیں۔

☆ قائداعظمؒ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد سماجی اور رفاحی کاموں میں دوبارہ سرگرم عمل۔ کشمیر ریلیف کمیٹی کو متحرک کیا۔ کراچی میں یوتھ کنونشن میں شرکت۔ کاروباری اداروں سے کشمیری مہاجرین کے لیے عطیات کا حصول۔ کراچی کے قائد آباد کے علاقے میں ڈسپنسری کا افتتاح۔

1949 ☆ کراچی میں بچوں کے ہفتے کا، مؤتمر عالم اسلامی کے اجلاس کا اور

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

لیڈیز انڈسٹریل ہوم کا افتتاح۔

☆ گول باغ لاہور میں یوم اقبال کی تقریب اور انجمن تحفظ حقوق نسواں کے اجلاس سے خطاب۔ اسی سال مظفر آباد میں جلسۂ عام سے خطاب کیا۔

☆ فاطمہ جناحؒ میڈیکل کالج لاہور میں سرپرست اعلیٰ کی حیثیت سے دورہ۔ بعد میں بھی متعدد مرتبہ تشریف لائیں۔

☆ قائداعظمؒ کی پہلی برسی پر نشری تقریر۔ کراچی میں جلسۂ عام سے خطاب اور عیدالفطر پر قوم کے نام پیغام۔

1950 یوم آزادی پر پیغام اور قائداعظمؒ کی دوسری برسی پر ریڈیو پاکستان کے ذریعے قوم سے خطاب۔

1951 کراچی میں ورلڈ مسلم کانفرنس کے زنانہ اجلاس میں تقریر، وائی ایم سی اے ہال کراچی میں ایس ایم سلطان کی منتخب تصاویر کی نمائش کا افتتاح اور قائداعظمؒ کی تیسری برسی پر ریڈیو پاکستان سے قوم سے خطاب۔

1952 بمبئی مسلم ایسوسی ایشن کی زنانہ شاخ کی طرف سے منعقدہ عیدالفطر کی تقریب میں شرکت اور خطاب۔ قائداعظمؒ کی چوتھی برسی پر پیغام اور رونق اسلام گرلز ہائی سکول کے جلسہ تقسیم انعامات میں شرکت۔

1953 قائداعظمؒ کی پانچویں برسی پر نشری تقریر، سندھ مسلم کالج ہسٹری سوسائٹی کی افتتاحی تقریب سے خطاب۔

1954 ☆ سوسائٹی آف اسلامک ہسٹری اینڈ کلچر کراچی یونیورسٹی کے اجلاس

سے، ڈھاکہ میں جلسۂ عام سے، زنانہ ڈی بیٹنگ سوسائٹی کراچی سے اور پہلے کیڈٹ ڈے کی تقریب سے خطاب۔

☆ قائداعظمؒ کی چھٹی برسی پر پیغام۔

☆ وائی ایم سی اے کراچی میں پہلی عالمی یوتھ فوٹو گرافک نمائش اور مہاجرین کی آبادکاری کی زنانہ کمیٹی کے زیر اہتمام گڑیوں کی نمائش کا افتتاح۔

☆ جامعہ تعلیم ملی، ملیر کراچی کے جلسۂ تقسیم انعامات میں شرکت۔ مسلمان عورتوں کے فنی اور صنعتی ادارے کی سالانہ تقریب سے خطاب۔ قائداعظمؒ کی ساتویں برسی پر نشری تقریر۔

1955 خاتونِ پاکستان ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر بورڈ ہائی سکول کا سنگ بنیاد رکھا۔ رضا علی سٹوڈنٹس یونین کی افتتاحی تقریب میں شرکت۔ کراچی میں خوجہ زنانہ یتیم خانے کے سالانہ اجلاس سے خطاب۔ مشرقی پاکستان کے صحافیوں کے وفد سے ملاقات۔ اردو کالج کراچی کے جلسہ تقسیم انعامات میں اور میرپور خاص میں شاہ عبداللطیف گورنمنٹ کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے افتتاحی اجلاس میں شرکت۔ قائداعظمؒ کی آٹھویں برسی پر نشری تقریر۔

1956 پاکستان سنٹرل ہومیو پیتھک میڈیکل کالج کے پہلے کنونشن سے اور سینٹ جوزف کالج کراچی کے طلباء و طالبات اور اساتذہ سے خطاب۔

1957 کراچی میں صنعتی نمائش کا افتتاح۔ جناحؒ کالج ناظم آباد کراچی کے جلسہ تقسیم انعامات سے، پشاور یونیورسٹی کی سٹوڈنٹس یونین سے،

فرنٹیئر کالج برائے خواتین پشاور سے ،اسلامیہ کالج برائے خواتین لاہور سے اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے جلسہ تقسیم انعامات سے خطاب۔ قائداعظمؒ کی نویں برسی اور قائداعظمؒ کے 81ویں یوم پیدائش پر نشری تقریر۔لالوکھیت کراچی میں جمعیت ہسپتال اور چائلڈ سینٹر کا سنگ بنیاد رکھا۔

1958 ☆ پاکستان کونسل آف گرل گائیڈز کے سالانہ اجلاس،سنٹرل گورنمنٹ کالج کراچی میں کُل پاکستان انٹر کالجیٹ ڈیبیٹ کے طالب علم شرکا، سندھ مسلم کالج کراچی کے سالانہ دن اور ڈاؤ میڈیکل کالج کے طلبا اور جوزف سکول برائے خواتین میں مدر ڈے کے موقع پر خطاب۔

☆ فیڈرل بی ایریا کراچی میں مشرقی پاکستان لائبریری اور جامعہ طیبہ شرقیہ کراچی کا افتتاح۔

☆ خاتونِ پاکستان گرلز ہائی سکول کراچی کے افتتاحی اجلاس،خواتین بزم میلاد النبیﷺ کراچی کی محفل،اور سرسید گرلز کالج ناظم آباد کراچی کی طلبا یونین کے افتتاحی اجلاس میں شرکت۔

1959 ☆ پولی ٹکنیک انسٹی ٹیوٹ کراچی کے سالانہ یوم طلبا کے اجلاس سے خطاب۔

☆ قائداعظمؒ کی برسی پر پیغام۔

☆ سندھ یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کا افتتاح۔

1960 کراچی میں قومی انسداد تپ دق ایسوسی ایشن کی سالانہ کانفرنس میں شرکت، ایس ایم لا کالج کے طلبا سے خطاب۔ جناح کالج سائنس یونین کی تقریب حلف برداری، کراچی ایتھلیٹک کلب کے سالانہ

ڈنر اور ویمنز ویلفیئر انڈسٹریل ہوم کے پہلے اجلاس سے خطاب۔

1961 ☆ قائداعظمؒ کی 13ویں برسی پر پیغام۔

☆ سینٹ پیٹرک کالج کراچی کے زیر اہتمام منعقدہ انٹر کالجیٹ فائن آرٹس اینڈ کرافٹس نمائش کا افتتاح۔

☆ سندھ مسلم سائنس کالج سٹوڈنٹس یونین کے افتتاحی اجلاس میں شرکت۔

1962 ☆ عیدالفطر کے موقع پر پیغام۔

☆ لاہور میں فاطمہ جناح کمیونٹی ہیلتھ سنٹر کی افتتاحی تقریب میں شرکت۔

1963 انجمن فیض الاسلام راولپنڈی کے سالانہ اجلاس میں صدارتی خطاب۔

1964 ☆ 17 ستمبر کو سیاسی جماعتوں کے متحدہ محاذ کی دعوت پر ملک کو آمریت سے نجات دلانے کے لیے صدارتی امیدوار بننا منظور کیا۔ اپنی انتخابی تقاریر میں سب سے زیادہ زور سلطانیٔ جمہور پر دیا۔

☆ مغربی پاکستان کے تمام بڑے شہروں کا طوفانی دورہ اور بڑے بڑے اجتماعات میں تقاریر۔

☆ وکلا کی غالب اکثریت کی حمایت۔

☆ مشرقی پاکستان کا دو مرتبہ انتہائی کامیاب دورہ۔ ساری آبادی استقبال کو ٹوٹ پڑی۔

☆ قائداعظمؒ کی پندرھویں برسی اور قائداعظمؒ کے سوانح حیات لکھنے کے بارے میں پیغامات۔ پشاور سے صدارتی انتخابی مہم کا آغاز۔ کراچی میں مہاجرین کے رہائشی منصوبے کا سنگ بنیاد۔

☆ ماڈل ٹاؤن لاہور میں خواتین کے اجتماع میں شرکت، صدارتی انتخاب کی مہم کے سلسلے میں راولپنڈی، حیدرآباد اور موچی دروازہ لاہور، پلٹن میدان ڈھاکہ، چٹاگانگ اور تیج گاؤں ریلوے سٹیشن پر عظیم الشان جلسوں سے خطاب۔

☆ آرمی سٹیڈیم راولپنڈی میں بی ڈی ممبروں اور چوک یادگار پشاور میں عام جلسے سے خطاب۔

1965 ☆ 3 جنوری کو ایوب خان کی کامیابی کا اعلان، تمام غیر جانبدار مبصرین کے مطابق انتخاب میں زبردست دھاندلی۔ حقیقت میں مادرِ ملتؒ ہی جیت رہی تھیں۔ صدارتی انتخاب کے بعد مادرِ ملتؒ کا مدبرانہ رویہ۔

☆ قصر فاطمہ میں متحدہ اپوزیشن لیڈروں کے اعزاز میں افطار ڈنر۔

1966 عید الفطر، عید الاضحیٰ، یوم آزادی اور قائداعظمؒ کی وفات اور پیدائش کے ایام پر پُرعزم بیانات۔

1967 ☆ عید الفطر (12 جنوری) اور عید الاضحیٰ (22 مارچ) کے موقعوں پر اہل اقتدار کو تنبیہ کی کہ وہ مادی اور مالی لالچ کے ذریعہ اپنی طاقت قائم رکھنے کی کوشش ترک کر دیں۔ اسلام کا انسان پرور نظام نافذ کریں۔ اہل پاکستان کو ان کے جمہوری حقوق واپس کریں۔ مطلق العنان پارلیمنٹ، آزاد پریس اور خود مختار عدلیہ قائم کریں۔ غربت کا قلع قمع کریں اور قائداعظمؒ کے ارشادات کی روشنی میں پاکستان کو اپنے ایمان، اپنے افتخار، اپنی عظمت اور اپنی تقدیر کا گہوارہ بنائیں۔

بھمبور، ٹھٹھہ اور کالری جھیل کا دورہ اور ٹھٹھہ کی شاہ جہاں مسجد کی مرمت کے کام کا معائنہ (13 فروری)

☆ میر جعفر خان جمالی کی وفات پر اظہار افسوس (18 اپریل)۔ میر جعفر خان موجودہ وزیراعظم میر ظفر اللہ خان جمالی کے تایا تھے۔

☆ اپنی رہائش گاہ قصر فاطمہ میں رات کو سوتے ہوئے وفات پا گئیں (9 جولائی)۔ ان کی عمر 74 سال تھی۔ مادرِ ملتؒ کی وفات پر سارا پاکستان سوگوار۔

☆ نماز جنازہ پولو گراؤنڈ کراچی میں مفتی محمد شفیعؒ نے پڑھائی۔ لاکھوں افراد کی شرکت۔ ان کی قبر مزار قائد سے قریباً 120 فٹ کے فاصلے پر ہے۔

درخشاں شخصیت

افکار و کردار میں قائداعظمؒ کی تصویر۔ جان نثار بہن، مدبر اور سیاسی بصیرت کی حامل۔ جمہوریت اور آزادیٔ افکار کی علم بردار۔ قرآن مجید کی تعلیم عام کرنے پر زور۔ اتحاد عالم اسلام کی شیدائی۔ بے باک رہنما، آزادیٔ کشمیر کی مجاہدہ، رفاہی اقتصادی نظام کی داعی، وضع قطع، چال ڈھال اور بات چیت میں اسلامی روایات کا وقار اور تمکنت۔ طالبات کے لیے رول ماڈل۔ مادرِ ملتؒ بے شمار سماجی اور رفاہِ عامہ کے ادارے قائم کرنے کے علاوہ اپنی جیب خاص سے ان کی اعانت کے لیے وقتاً فوقتاً کثیر رقومات بھی دیتی رہیں۔

مادرِ ملتؒ کی خدمات

آٹھ بہن بھائیوں کے خاندان میں محترمہ فاطمہ جناحؒ ساتویں نمبر پر تھیں۔ تاریخ نے قائداعظمؒ کو پاکستان کے خالق اور برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں کے لیڈر کی حیثیت سے ایک منفرد مقام سے نوازا جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ اور یہ کہنا بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ قائداعظمؒ کی طویل سیاسی اور نجی زندگی میں جو کردار محترمہ نے ادا کیا وہ بھی ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے......

قائداعظمؒ کے والد کا انتقال 1901ء میں ہوا۔ حالات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کمسن فاطمہ کی ساری ذمہ داری دوسری ذمہ داریوں کی طرح قائداعظمؒ کے کندھوں پر آ پڑی۔ وہ اس دور میں بھی بیدار مغز اور روشن خیال تھے۔ انہوں نے اپنی بہن کو 1902ء میں باندرہ کانونٹ سکول اور بعد میں سکول کی تعلیم ختم ہونے پر 1919ء میں کلکتہ کے ڈاکٹر احمد ڈینٹل کالج میں داخل کرا دیا۔ اس دور کے حالات کے پیش نظر یہ آسان کام نہیں تھا۔ خاندان اور اپنوں کی مخالفت درپیش تھی۔ مسلمان لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم اس زمانے میں بعید از قیاس سمجھی جاتی تھی۔ پڑھے لکھے مسلمان بھی اپنی لڑکیوں کو ابتدائی تعلیم کے لیے بھی سکول نہیں بھیجتے تھے۔ گھروں میں دینی تعلیم دینا ہی ان کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا۔ پھر کم سنی میں ان کی شادیاں کر دی جاتی تھیں اور وہ زندگی بھر ذمہ داریوں اور کام کے بوجھ تلے دب کر زندگی گزار دیتی تھیں۔ اگر شوہر اور سسرال قسمت سے اچھے مل جاتے تو زندگی آسان ہو جاتی ورنہ سسک سسک کر اور پریشانیوں میں وقت گزر جاتا۔ والدین بھی گویا بے بس تھے۔ معاشرہ اور

جہالت دیوار بن جاتے اور قبل از وقت بوڑھی ہو جانے والی لڑکیاں زندگی کے حسن سے لطف اندوز ہی نہ ہو سکتیں...... حالات اب بھی اتنے اچھے اور خوشگوار نہیں...... تقریباً ایک صدی پیشتر کیا ہوں گے!

اس دور میں ایک مسلمان لڑکی کا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا معمولی بات نہیں تھی۔ پھر قائداعظمؒ نے انہیں ڈینٹل سرجن بن جانے پر بمبئی میں انہیں اپنا کلینک بھی کھول کر دیا۔

قائداعظمؒ کی اہلیہ مریم جناح (رتن بائی) کا انتقال 1929ء میں ہوا۔ ان کی چند سالوں کی رفاقت تھی اور پھر قائداعظمؒ تنہا رہ گئے۔ محترمہ فاطمہؒ اپنے بھائی کے گھر گئیں اور اس دن سے اس طویل رفاقت کا آغاز ہوا جو قائداعظمؒ کے انتقال تک رہا۔ بیس سال کے طویل عرصہ میں وہ برصغیر کے اس عظیم لیڈر کی بہترین معاون ثابت ہوئیں۔ گھرداری، مہمان نوازی کے سارے فرائض نبھانے کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھ شریکِ سفر بھی رہیں۔ ویسے تو بہن بھائی کی رفاقت تقریباً تیس (30) سال کے عرصہ پر محیط ہے لیکن زندگی کے آخری بیس سال جب برصغیر میں آزادی کی تحریک کی صبر آزما اور کٹھن جنگ لڑی جا رہی تھی، محترمہ قائداعظمؒ کی ہم سفر اور معاون تھیں۔ بہت ذرائع سے اس بات کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ قائداعظمؒ سیاسی امور میں اور مسلم لیگ کے انتظامی امور میں بہن کے ساتھ گفتگو کیا کرتے تھے۔ کھانے کے اوقات میں اکثر یہ باتیں ہوتی تھیں۔ محترمہ کو بھی سیاست سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس دور کے بڑے لیڈروں سے ملاقاتیں، گھر کا سیاسی ماحول، قائداعظمؒ کا تدبر اور برصغیر میں آزادی کی جنگ، یہ سب بہت اہم باتیں تھیں۔ شاید اس لیے ایک بار قائداعظمؒ نے اپنی بہن کے لیے ان خیالات کا اظہار کیا تھا:

''وہ میرے لیے اس وقت امید، ہمت اور معاونت کا ایک مستقل

ذریعہ ثابت ہوئیں جب ہم ایک بڑے انقلاب سے ہمکنار
ہو رہے تھے۔''

محترمہ فاطمہ جناحؒ 31 جولائی 1893ء کو پیدا ہوئیں اور قائداعظمؒ کے ساتھ رہنے کی وجہ سے کم عمری میں ہی سیاست کے پیچ وخم، لگن اور برصغیر میں آزادی کی جنگ میں ہر محاذ پر شریک رہیں۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل تھیں۔ بات فوراً سمجھ جاتیں۔ ذہانت کا یہ عالم تھا کہ سیاسی امور پر قائداعظمؒ کو مشورے بھی دیتیں جو بارہا قابلِ قبول ہوتے۔ خواتین کے حقوق اور خواتین کی ذمہ داریوں سے وہ خوب آگاہ تھیں اور کبھی کسی موقع پر اس مشن سے نہ ہٹیں۔ قائداعظمؒ بھی ''آزادیٔ نسواں'' کے زبردست حامی تھے۔ عورتوں کو سیاست میں حصہ لینے کی بھی وہ ہمیشہ ترغیب دیتے۔ اس تحریکِ آزادی میں بے شمار خواتین نے کام کیا۔ مردوں کے ساتھ پردے کے باوجود سیاسی جلسوں، جلوسوں اور تحریک کے دوسرے کاموں میں حصہ لیتیں۔ یہاں یہ کہنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ 1946ء میں سول نافرمانی کی تحریک میں لاہور کے سیکریٹریٹ پر جھنڈا بھی ایک خاتون نے گاڑا تھا۔ بہت سی نوجوان طالبات جنہیں یہ سعادت نصیب ہوئی ان میں ایک نام فاطمہ بھی تھا۔

قائداعظمؒ جب گول میز کانفرنس میں شریک ہونے لندن گئے تو محترمہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ 1934ء کے سیشن کے بعد جب قائداعظمؒ مسلم لیگ کے صدر بنے تو محترمہ فاطمہ جناحؒ نے اپنے عظیم بھائی کے ساتھ ایک عظیم جہاد کا آغاز کیا۔ سیاسی شعور اور سیاسی جدوجہد کی وجہ سے وہ 1939ء میں بمبئی مسلم لیگ کی صوبائی مجلس عاملہ کی رکن منتخب ہوئیں۔ اس کے بعد انہوں نے مسلم لیگ، تحریکِ پاکستان اور خواتین کو منظم کرنے کے لیے سارے برصغیر کا دورہ کیا۔ جلسے کئے، تحریکِ آزادی

کے مقاصد سمجھنے اور انگریز اور ہندو کی سازش سے پردہ میں رہنے والی خواتین کو روشناس کرایا۔ 1940ء میں قراردادِ لاہور پاس ہونے کے بعد تحریکِ پاکستان ایسے مراحل میں داخل ہوگئی جس کے لیے دن رات کام اور جہاد کرنے کی ضرورت تھی۔ محترمہ کا کردار 1940ء سے 1947ء تک ناقابلِ فراموش ہے۔ اپنے عظیم بھائی کے ساتھ جو دس کروڑ مسلمانوں کے لیڈر تھے، ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ ہر جگہ ان کے ساتھ گئیں، ان کی قابلِ اعتماد رفیق اور بہترین ساتھی تھیں۔ گھرداری کے فرائض کے ساتھ ان کی صحت اور آرام کا بھی انہوں نے ایک ماں کی طرح خیال رکھا۔ دن رات کام کرنے سے جب وہ تھک جاتے، نڈھال ہو جاتے تو ان کے لیے وہ مسیحا بن جاتیں۔ اگر مسلمانوں کا اتنا عظیم لیڈر ایک عام آدمی نہیں تھا تو مادرِ ملت بھی ایک عام عورت نہیں تھیں۔

1934ء میں مسلم لیگ کے سیشن کے بعد جب قوم کی قیادت قائداعظمؒ نے سنبھالی تو محترمہ بھی ساتھ تھیں۔ 1939ء میں وہ بمبئی مسلم لیگ کی صوبائی مجلسِ عاملہ کی رکن بھی منتخب ہوئیں۔ خواتین کی تنظیم اور مسلمان عورت کو خواب اور جہالت سے جگانے کے لیے انہوں نے ایک مشن کے طور پر خواتین کے اجلاس کیے۔ اس دور کی عورتیں جو زیادہ تر پردے میں رہتی تھیں اور باہر جانے آنے میں بھی پابندیاں حائل تھیں، ان کی آمد پر گھروں سے نکلتیں اور ان کی تقریریں سنتیں۔ یہ حقیقت ہے کہ تقسیم سے پہلے جس طرح خواتین نے تحریکِ پاکستان میں اپنا کردار ادا کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے اور اس کا سہرا محترمہ کے سر پر ہے۔ انہوں نے ہی خواتین کو منظم کیا اور ان کا حوصلہ بڑھایا۔ قائداعظمؒ کے افکار ان تک پہنچائے۔ اپنے عظیم بھائی کے عظیم جہاد میں انہوں نے خواتین کو بتایا کہ کس طرح آزادی کے حصول کے لیے اپنے

تشخص کے لیے اپنی عزتِ نفس کے لیے اپنی بقا کے لئے انگریز اور ہندو کی سازش کو ناکام بنانا ہے گاندھی اور نہرو کی سیاست کو بے نقاب کرنا ہے ''اکھنڈ بھارت'' کا خواب توڑنا ہے اور آئینی طریقوں سے ملک حاصل کرنا ہے۔ یہ ایک مشن تھا ان کی زندگی کا...... اور انہوں نے اس میں ایک بھرپور کردار ادا کیا۔ وہ قائداعظمؒ کی طرح جمہوریت کی علم بردار تھیں۔ جمہوریت اور آئین سے ہی مسلم لیگ میں عہدہ لیا اور دن رات کام کیا۔ قائداعظمؒ جب فاتح کی حیثیت سے پاکستان تشریف لائے تو وہ ان کے ساتھ تھیں۔ پاکستان بن جانے اور قائداعظمؒ کی وفات کے بعد انہوں نے حکومت میں کوئی عہدہ قبول نہ کیا۔ لیکن قوم اور ملک کے لیے کام کرتی رہیں۔ خواتین کی بہتری کے لیے کام کرتی رہیں۔ اپنی ذہانت، علم اور سیاسی بصیرت کی روشنی پھیلاتی رہیں۔ قوم کی بدحالی اور پاکستان میں مشکلات اور مسائل کے سیلاب سے افسردہ اور دکھی بھی ہوتی رہیں۔ ایک بار باتوں باتوں میں انہوں نے ذکر کیا کہ 1946ء میں انگریزوں نے قائداعظمؒ کو قید کرنے کا ایک منصوبہ بنایا تھا۔ ان دنوں تحریکِ پاکستان کے لیے وہ دن رات مصروف تھے۔ اگر جیل میں ڈال دیئے جاتے تو آزادی کی منزل بہت دور چلی جاتی۔ قائداعظمؒ کو بھی تھوڑا سا خدشہ محسوس ہوا لیکن انہوں نے ان کا حوصلہ بڑھایا اور حالات کا مقابلہ کرنے کا پورا عزم کیا۔ وہ الگ بات ہے مشکل ٹل گئی لیکن وہ ثابت قدم رہیں۔ شاید یہ ان کے عظیم بھائی کی رفاقت کی وجہ تھی کہ وہ بھی ان کی طرح مدبر، عقلمند اور ایک سمجھدار سیاست دان تھیں۔

قائداعظمؒ کو زندگی نے مہلت نہ دی، وہ پاکستان کے قیام کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہ رہے۔ ان کی زندگی کی آخری سانسوں تک محترمہ نے ان کا ساتھ دیا۔ ان کی خدمت کی، ان کی دیکھ بھال کی، ہر ممکن طرح سے خیال رکھا اور یہ احساس نہ ہونے دیا

کہ وہ اتنے علیل ہیں حالانکہ وہ خود بھی اپنی علالت کو سمجھتے تھے۔ لیکن وہ ایک شفیق ماں کی طرح ایک شفیق بہن کی طرح انہیں تسلی دیتی رہیں۔ ان کی صحت کے لیے دعا کرتی رہیں اور زندگی کے آخری لمحوں تک ان کے ساتھ رہیں۔

قائداعظمؒ کی وفات کے بعد وہ عملی سیاست سے الگ ہوگئیں۔ حاکمان وقت نے بھی اس بات کا خیال نہ کیا کہ قائداعظمؒ کی عظیم بہن جن کا پاکستان بنانے میں ایک عملی اور بھرپور کردار ہے، انہیں وہ ملک کا سب سے بڑا عہدہ خود پیش کرتے، ان کی خدمات اور قابلیت کا اعتراف کرتے اور ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے۔ لیکن شاید یہ ایک سازش ہے جو قائداعظمؒ کے انتقال کے ساتھ ہی ملک میں شروع ہوگئی کہ اچھے، قابل اور مخلص لوگ ملک کی قیادت نہ سنبھالیں اور آگے نہ آئیں۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ ایسے ایسے لوگوں نے ملک کی قیادت سنبھالی جن کا تحریکِ پاکستان یا تحریک کے کسی شعبہ سے کوئی تعلق نہ تھا، کوئی خدمات نہ تھیں۔ شاید اس لیے پاکستان کے قیام کے بعد طویل مدت تک ملک میں مارشل لاء رہا اور فوج نے حکومت کی۔

محترمہ فاطمہ جناحؒ مسلم لیگ سے تاحیات وابستہ رہیں۔ عملی سیاست میں پاکستان بننے کے بعد ایک بھرپور کردار بھی انہوں نے ادا کیا جب 1964ء میں صدارتی انتخابات میں ایوب خان کے خلاف ''متحدہ محاذ'' کے مشترکہ اُمیدوار کی حیثیت سے انہوں نے قوم کے اصرار پر حصہ لیا۔ اس وقت بھی ملک میں جمہوریت ختم ہوچکی تھی، مایوسی چھائی ہوئی تھی، آمریت کا اندھیرا چھایا ہوا تھا اور تحریکِ پاکستان کے بنیادی اصول پس پشت ڈال دیئے گئے تھے۔ اس دور میں محترمہ نے قومی رہنمائی کا بیڑا ایک بار پھر اٹھایا۔ اپنی پوری قوت، ہمت اور جذبے سے الیکشن کیلئے ملک بھر کا دورہ کیا۔ مشرقی پاکستان بھی گئیں۔ جلسوں اور جلوسوں میں ان کی موجودگی اور ان کی

شخصیت نے ملک میں ایک تازہ روح پھونک دی۔ یوں لگتا تھا قائداعظمؒ سے لوگوں کی عقیدت اس طرح لوٹ آئی ہے جس طرح تحریکِ پاکستان کے ایام میں تھی۔ ایوب خان ان دنوں ملک کے صدر تھے سرکاری ذرائع ان کے ساتھ تھے۔ اس کے باوجود محترمہ کے جلسوں میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی۔ حکومت یہ خطرہ بھانپ گئی کہ ان کی کامیابی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے' عوام ان کے ساتھ ہیں۔ عوام قائداعظمؒ ان کی بہن اور پاکستان سے محبت کرتے ہیں اور ہر طرح انہیں کامیاب بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ زبردست دھاندلی سے محترمہ کو ہرا دیا گیا۔ کاش! ایسے نہ ہوتا...... آج ہمارے ملک کی تقدیر یہ نہ ہوتی جو آج ہے۔ وہ چند سال بھی پاکستان کی قیادت کرتیں تو جمہوری طریقِ کار کا ایک ایسا عمل شروع ہوتا جو ہمارے ملک کی جڑیں کھوکھلی نہ کرتا' عوام کبھی بھی برے نہیں ہوتے انہیں لیڈر گمراہ کرتے ہیں۔ عوام ہی کی مدد سے قائداعظمؒ کی قیادت میں پاکستان حاصل ہوا تھا۔ جب ہندو سے مقابلہ تھا جو شاطر ہے' انگریز سے مقابلہ تھا جو مسلمان کا ازلی دشمن ہے...... لیکن قیادت بے لوث تھی' نڈر تھی' مخلص تھی اور ایک جذبے کے تحت تھی تو عوام نے بھرپور ساتھ دیا اور برصغیر کے نقشے پر 1947ء میں دو ملک بنے جو ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

لیکن بدقسمتی تو یہ ہے کہ خودغرض لوگ ایسا نہیں سوچتے۔ انہیں صرف اپنی ذات سے دلچسپی ہوتی ہے' اپنی کرسی سے غرض ہوتی ہے' اپنی جاہ وحشمت سے دلچسپی ہوتی ہے حالانکہ عوام کی کرسی پر صرف اس کا حق ہوتا ہے جو ایماندار ہو' مخلص ہو' قوم کا ہمدرد ہو' قابل ہو اور بغیر کسی غرض سے قوم اور ملک کی خدمت کرے۔ ملک میں اچھے اور قابل لوگوں کی کمی نہیں' عوام بھی سادہ اور مخلص ہیں۔ دکھ تو یہ ہے کہ انہیں اچھی قیادت نصیب نہیں ہوئی! یہ ایک المیہ ہے جس کا شکار ہم ہوتے رہے ہیں۔

قوم نے محترمہ کو مادرِ ملتؒ کا خطاب دیا' یہ ان کے بے مثال کردار کی وجہ سے ایک ایسا اعزاز تھا جس کی وہ حقدار تھیں۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان میں ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے۔ لیکن ان کی نجی اور سیاسی زندگی پر سے کبھی کسی تاریخ دان' اہلِ قلم نے پردہ نہیں اٹھایا تا کہ آئندہ نسلوں کے لیے یہ تحریریں ایک تاریخ بن جاتیں کہ وہ عورت جس کا نام فاطمہ جناح تھا' اور وہ عورت جس نے معمارِ پاکستان کے ساتھ ملک بنانے میں ایک بھرپور کردار ادا کیا...... کتنی عظیم تھی' کتنی قابل تھی' کتنی منفرد تھی اور کتنی سچی تھی!

وہ جانتی تھیں کہ 1965ء کے الیکشن میں انہیں جان بوجھ کر صاحبِ اقتدار لوگوں نے ہرا دیا تھا لیکن ان کی شکست دراصل جمہوری طاقتوں کی شکست تھی جس کے بعد مارشل لاء اور آمریت کی تاریک رات قوم کا مقدر بن گئی۔ اگر مادرِ ملتؒ پاکستان کی صدر منتخب ہو جاتیں تو پاکستان کی تاریخ اور جغرافیہ بہت مختلف ہوتا۔



II

یادوں کے جھروکے

محمد طارق اقبال
پاکستانی ورائٹی ڈاٹ کام

تدوین کتاب کا پس منظر

گذشتہ سال مجھے رابرٹ ملی گن امریکی فلم ڈائریکٹر سے جو قائداعظم پر فلم بنا رہے تھے' ملنے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے بتایا قائدؒ پر فلم بنانے کے دوران انہیں ان کی بہن کے حالاتِ زندگی جاننے کی ضرورت تھی جنہوں نے تقریباً زندگی کے تیس سال ان کے ساتھ گذارے۔ لیکن ہمارے سفارت خانہ کی لائبریری یا منسٹری آف انفارمیشن کے کسی شعبے میں کوئی ایسی کتاب نہ مل سکی جو محترمہ کی زندگی پر روشنی ڈالتی۔ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ قائداعظمؒ کی بہن جن کی ان کے ساتھ طویل رفاقت رہی اور جو تاریخ کے اس اہم وقت کی ایک اہم گواہ ہیں' ان کے متعلق قوم زیادہ نہیں جانتی۔ اگر آج کی نسل کچھ نہیں جانتی تو آئندہ آنے والی نسلیں تو مستقل اندھیرے میں ہوں گی۔

چنانچہ میں نے یہ طے کیا کہ اس سلسلے میں محترمہ کے متعلق جو کچھ میں جانتی ہوں اسے قوم کی ایک امانت کے طور پر ضرور تحریر کروں۔ دراصل یہ تحریر اس دور کی میٹھی یادیں ہیں جب مجھے اور میرے شوہر کے انچ خورشید کو ان کے ساتھ' ان کے گھر میں رہنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ مجھے اس زمانے میں ان کی رفاقت میسر آئی جس دور کی یادیں بڑی دلکش ہوتی ہیں۔ فلیگ سٹاف ہاؤس کے قیام میں محترمہ کی شفقت اور محبت شامل تھی۔ ہمارا یہ قیام بڑا پُر لطف تھا۔ اس زمانے میں وہ بہت متحرک تھیں۔ ملک کے سارے سیاست دان' پرانے مسلم لیگی لیڈر اور دوسرے لوگ انہیں صبح شام ملنے آتے تھے۔ مجھے بھی ایسے لوگوں کو ملنے کا اتفاق ہوا جن سے

ویسے ملنا ناممکن تھا۔ میرے لیے یہ بڑا انوکھا اور دلچسپ تجربہ تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے اس قیام کو ڈائری کی صورت میں محفوظ کرلیا۔ میں ڈائری لکھنے کی عادی ہوں۔ چنانچہ میں ان کی باتیں' سیاست پر ان کے نظریے اور گھر میں آنے والے لوگوں کے متعلق لکھ لیتی۔ احباب کے اصرار پر اس ڈائری کے کچھ حصے حذف کر کے میں نے ''محترمہ فاطمہ جناحؒ کے شب وروز'' کے نام سے 1976ء میں کچھ مواد چھپوایا۔ لیکن ڈائری کا زیادہ حصہ شائع نہ کروایا۔ اب اتنے سالوں کے بعد محسوس کیا کہ جو کچھ میرے پاس محفوظ ہے وہ چھپ جانا چاہیے۔ شاید یہ تحریر آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے ان کے ساتھ گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے طویل عرصہ گزارا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے ہم دونوں میاں بیوی کو اپنی بھرپور شفقت سے نوازا۔ ان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے میری زندگی کا ایک خوبصورت سرمایہ ہیں۔ میری یہ تحریر ان ہی دنوں کی یادیں ہیں جن میں ایک لفظ کا ردوبدل میں نے نہیں کیا۔ صرف چند یادیں ہیں جو ایک ہستی کے متعلق ہیں' جن کا مجھے احترام بھی تھا اور جن کی شخصیت سے میں بے حد متاثر تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں ان کی ہر بات' ہر نصیحت کو اپنے لیے مشعلِ راہ سمجھ کر ذہن میں محفوظ کر لیتی تھی۔ اس سے زندگی میں میں نے بہت کچھ سیکھا۔

شاید محترمہ فاطمہ جناحؒ کی شخصیت کے اوجھل پہلو قوم کی نوجوان نسل کے لیے کارآمد ہوں جن کے ساتھ ہماری اُمیدیں وابستہ ہیں۔ زندہ قومیں اپنے رہنماؤں کی زندگی سے بہت کچھ سیکھتی ہیں۔ اس دور میں جب نفسانفسی کا عالم ہے اور انسانی قدریں بہت حد تک بھلا دی گئی ہیں' ایسی تحریریں ظلمت میں روشنی کی ایک کرن ثابت ہوسکتی ہیں۔ کیونکہ جب گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا ہے تو ماچس کی ایک

تیلی جلانے سے بھی روشنی مل جاتی ہے۔ شاید اس دور کی محترمہ کے ساتھ وابستہ میری یادیں اور ان کی باتیں ایک تابندہ مستقبل کی ضمانت ثابت ہوں۔

قوم نے انہیں ''مادرِ ملت'' کا خطاب دیا۔ یہ ان کے بے مثال کردار کی وجہ سے ایسا اعزاز تھا جس کی وہ حقدار تھیں۔ انہوں نے تحریک پاکستان میں ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے۔ لیکن ان کی نجی زندگی اور ان کی سیاسی زندگی پر سے کبھی کسی تاریخ دان' اہلِ قلم نے پردہ نہیں اٹھایا تاکہ آئندہ نسلوں کے لیے یہ تحریر ایک تاریخ بن جاتی کہ وہ عورت جس کا نام فاطمہ جناحؒ تھا اور جس نے معمارِ پاکستان کے ساتھ ملک بنانے میں ایک اہم کردار ادا کیا' کتنی عظیم تھی' کتنی منفرد تھی' کتنی سچی تھی......!

قائداعظم محمد علی جناحؒ کو اہلِ جموں وکشمیر سے بے حد محبت وعقیدت تھی اور اسی طرح باشندگانِ ریاست کو بھی قائداعظم کی ذات والا صفات سے بے پناہ عشق تھا اور یہ اسی عشق کا اعجاز تھا کہ انہوں نے اپنی ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے ضمن میں علمِ بغاوت بلند کردیا اور اب تک ان کی تحریک جاری وساری ہے۔ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ریاست کا پاکستان کے ساتھ الحاق نہیں ہو جاتا۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ کی ہمشیر مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کو بھی اہلِ جموں وکشمیر سے بے حد انسیت رہی اور انہوں نے پیرانہ سالی کے باوجود آزاد جموں وکشمیر کے دورے کئے اور جہاں مجاہدین کشمیر کے حوصلے بڑھائے وہاں لٹے پٹے مہاجرین کی امداد و اعانت بھی کی۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ اپنی زندگی میں چار بار کشمیر گئے پہلے سفر میں ان کی اہلیہ محترمہ مریم جناحؒ ان کے ساتھ تھیں۔ دوسرے سفر میں آپ اکیلے تھے البتہ تیسرے اور چوتھے سفر میں آپ کی ہمشیر محترمہ فاطمہ جناحؒ آپ کے ساتھ تھیں۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ کا آخری سفر کشمیر 1944ء میں ہوا۔ یہ وہ ایام تھے جب ماہ اپریل 1944ء میں سیالکوٹ میں صوبائی مسلم لیگ کا تاریخی اجتماع ہوا تھا جس میں ہندوستان کے تمام مسلم لیگی لیڈر جمع ہوئے تھے۔ اجلاس کی صدارت سردار عبدالرب نشتر مرحوم نے کی تھی اور اس اجلاس میں قائداعظم محمد علی جناحؒ نے سر خضر حیات خان ٹوانہ سے سیاسی قطع تعلق کیا تھا اور اسی اجتماع میں سردار شوکت حیات یونینسٹ وزارت چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔ سیالکوٹ کے اسی اجلاس سے فارغ ہو کر قائداعظم محمد علی جناحؒ ریاست جموں و کشمیر کے دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ ان کو کشمیر کے سیاسی عمائدین کے علاوہ حکومت کشمیر نے بھی مدعو کیا تھا۔ یہ دورہ براستہ جموں ہوا تھا اور سیالکوٹ سوچیت گڑھ سرحد سے لے کر شہر جموں تک فضا پھولوں کی خوشبو سے مہک اٹھی تھی اور یہ حقیقت ہے کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ کا اتنا شاندار استقبال ہوا تھا کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ قائداعظمؒ کے اس سفر میں آپ کی ہمشیر محترمہ ہمراہ تھیں۔ جونہی آپ کی موٹر ریاست کی سرحد میں داخل ہوئی پوری فضا نعرہ تکبیر اللہ اکبر' اسلام زندہ باد' قائداعظمؒ زندہ باد اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔

قائداعظمؒ کو ایک کھلی کار میں بٹھایا گیا جس کو محمد اسلم خان ٹھیکیدار ڈرائیو کر رہے تھے۔ چودہری غلام عباس آپ کے ہمراہ تھے لیکن محترمہ فاطمہ جناحؒ کو ایک دوسری موٹر میں سوار کر کے قائداعظمؒ کی قیام گاہ ڈاک بنگلہ جموں بھیج دیا گیا۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ نے تمام راستہ کو سجے ہوئے دیکھ کر فرمایا تھا کہ میں نے ایسا منظر آج تک نہیں دیکھا۔ رات کو مسلم لیگ کانفرنس کا جلسہ عام ہوا جس میں قائداعظمؒ نے انگریزی زبان میں ولولہ انگیز تقریر کی جس کا ترجمہ مسلم کانفرنس کے لیڈر چودہری

حمید اللہ خان مرحوم نے کیا تھا۔ ڈاک بنگلہ میں محترمہ فاطمہ جناحؒ نے خواتین کے ایک وفد کو شرفِ باریابی بخشا تھا۔ دوسرے روز قائداعظم محمد علی جناحؒ سرینگر روانہ ہوئے تھے۔ سرینگر میں محترمہ فاطمہ جناحؒ نے مسلم خواتین سے رابطہ قائم کیا اس سلسلہ میں انہوں نے آغا شوکت علی جنرل سیکرٹری مسلم کانفرنس کی والدہ ماجدہ اور اہلیہ کے ساتھ کشمیری خواتین کو تحریک پاکستان میں شمولیت کی دعوت دی۔ یہ انہی کا اثر تھا کہ سرینگر میں مسلم خواتین نے بیگم آغا شوکت علی اور بیگم برجیس غنی کی قیادت میں تحریک پاکستان کو آگے بڑھایا اور ازاں بعد 1947ء کے آخر میں انہی خواتین نے ادارہ اقوام متحدہ کے کشمیر کمیشن ہندو پاک کے سامنے مظاہرہ کیا اور گرفتار ہوئیں اور کشمیری عوام کے حقیقی جذبات واحساسات سے آگاہ کیا تھا۔

1947ء میں جب جنگ آزادی کشمیر کا آغاز ہوا تو محترمہ فاطمہ جناحؒ نے کشمیر فنڈ قائم کیا اور اس فنڈ سے کشمیری مجاہدین کی مالی امداد کی۔ آپ خود محاذِ جنگ پر تشریف لے گئیں اور مجاہدین کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ آپ نے کشمیری مہاجرین کے کیمپوں کا بھی دورہ کیا اور کشمیری قربانیوں اور خدمات کو سراہا۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ مسئلہ کشمیر کو کس قدر اہمیت دیتے تھے۔ بلکہ یہ روایت محترمہ فاطمہ جناحؒ ہی سے منسوب ہے کہ دمِ واپسیں قائداعظم محمد علی جناحؒ کے لبوں پر جو الفاظ تھے وہ کشمیر کے تھے اور پھر دورانِ علالت میں ہی آپ نے محترمہ فاطمہ جناحؒ سے کہا تھا کہ آج تو مجھ سے کشمیر کمیشن کے اراکین نے ملنے آنا تھا ان کا کیا ہوا؟

مادرِ ملتؒ اکثر ہم سے کشمیر کا ذکر کرتی تھیں اور کشمیر کے پاکستان کے ساتھ تعلقات کو ضروری جانتی تھیں۔ کشمیری خواتین کو کام اور کام کرنے کا درس عمل دیتی تھیں ان کا خیال تھا کہ کشمیری خواتین کی ایک تنظیم ہونی چاہیے۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ نے آزاد

کشمیر کو ایک مثالی خطہ بنانے کا مشورہ دیا تھا ان کا استدلال تھا کہ جب یہ خطہ جمہوری اقدار کی پاسداری کرے گا اور سماجی و اقتصادی اعتبار سے ترقی کرے گا تو یہ بات مقبوضہ جموں و کشمیر کے عوام کے لیے باعثِ کشش ہوگی۔

آپ نے ہمیشہ آزاد کشمیر کی ترقی کے لیے کام کرنے پر زور دیا اور نوجوانوں کو بے لوث طریقہ سے سیاست کرنے کا مشورہ دیا۔ کراچی میں محترمہ فاطمہ جناحؒ جن خواتین کو کبھی کبھار مدعو کرتی تھیں ان میں سے اکثر کا تعلق کشمیر سے ہوتا تھا۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ جن ایام میں آزاد کشمیر کے صدر سردار محمد ابراہیم خان تھے' آزاد کشمیر کے دورے پر تشریف لے گئی تھیں۔ کشمیری باشندگان نے ان کا والہانہ استقبال کیا اور اپنی روایتی محبت وخلوص کا مظاہرہ کیا۔

محترمہ فاطمہ جناحؒ نے اس وقت حکومت آزاد کشمیر کی لیڈر شپ سے یہ کہا کہ وہ کوئی تعلیمی وطبی منصوبہ بنائیں اور وہ اس کی تکمیل کے لیے مالی امداد دیں گی۔ یہ منصوبہ ایک مدت تک مادرِ ملت کو پیش نہ کیا گیا لیکن جب مسٹر کے ایچ خورشید حکومت آزاد کشمیر کے صدر بنے تو انہوں نے مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کی خواہش و ہدایت کے مطابق ایک منصوبہ بنایا اور کراچی میں ان کی خدمت میں پیش کیا۔ اس منصوبہ کو محترمہ فاطمہ جناحؒ نے پسند فرمایا اور اس کے لیے گیارہ لاکھ روپے (1960-61ء میں) عطا کئے۔ چنانچہ ڈھیر کوٹ' چمپائی اور کھڑک میں جو سکول قائم ہیں وہ اس منصوبہ سے مکمل ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مدارس محترمہ فاطمہ جناحؒ کے نام سے منسوب ہیں۔ مظفر آباد کے سی ایم ایچ میں جو زنانہ حصہ تعمیر ہوا ہے وہ بھی محترمہ فاطمہ جناحؒ کی مالی امداد سے بنا تھا۔ چنانچہ اس یونٹ کا نام بھی محترمہ فاطمہ جناحؒ کے نام پر رکھا گیا اور آج بھی اس عظیم بھائی کی عظیم بہن کی یاد دلاتا ہے۔

محترمہ فاطمہ جناحؒ جب سیالکوٹ میں انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے صدر خواجہ حاکم الدین مرحوم کی دعوت پر جناحؒ اسلامیہ کالج کے افتتاح کے لیے تشریف لائیں تو منجملہ دیگر مصروفیات کے انہوں نے کشمیری لیڈروں کے ایک وفد سے بھی ملاقات کی اور مہاجرین کے کوائف وحالات دریافت کیے۔

محترمہ فاطمہ جناحؒ بنیادی طور پر ایک جرأت مند مسلم خاتون تھیں جو جمہوری اقدار پر یقین رکھتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ کشمیری عوام کو بھی ان کا حق خود ارادی ملے اور وہ ریاست کا الحاق پاکستان سے کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ محترمہ فاطمہ جناحؒ کی وفات سے نہ صرف اہلِ پاکستان ایک عظیم المرتبت اور جلیل القدر رہنما سے محروم ہوئے بلکہ کشمیری عوام بھی اپنی ایک عظیم محسنہ اور ہمدرد خاتون کی قیادت اور رہنمائی سے تہی دامن ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جوار رحمت میں جگہ دے اور آسمان ان کی قبر پر تا قیامت شبنم افشانی کرتا رہے (آمین ثم آمین) یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جب محترمہ فاطمہ جناحؒ نے پاکستان کے صدارتی انتخابات میں صدر ایوب خان کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا تو جموں و کشمیر کے تمام لیڈروں نے جن میں چودھری غلام عباس مرحوم' مسٹر کے ایچ خورشید اور سردار ابراہیم خاں' پروفیسر محمد اسحاق قریشی وغیرہ شامل تھے' محترمہ فاطمہ جناحؒ کا بھرپور ساتھ دیا بلکہ مسٹر کے ایچ خورشید تو ان کے الیکشن ایجنٹ تھے اس سے کشمیریوں کی مادرِ ملتؒ سے ارادت کا پتہ چلتا ہے۔

حسین یادیں

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے اس عمر میں مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کے ساتھ رہنے کا موقع ملا جس دور کی یادیں بہت دلکش ہوتی ہیں۔ میرے شوہر قائداعظمؒ کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ 1944ء میں جب قائداعظمؒ تفریح کی غرض سے کشمیر تشریف لائے تو خورشید ان دنوں بی۔اے کے طالب علم تھے۔ لیکن چونکہ سیاست سے دلچسپی رکھتے تھے اس لیے مسلم سٹوڈنٹس یونین کے کشمیر میں جنرل سیکرٹری تھے جو 1940ء میں معرضِ وجود میں آئی تھی۔ دراصل اس زمانے میں کچھ علی گڑھ پلٹ نوجوانوں نے کشمیر میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی لیکن چند ہی ماہ بعد سب سرکاری ملازمتوں میں چلے گئے تو اس کے بعد مسلم سٹوڈنٹس یونین ہی تھی جو سرینگر میں اجتماعات اور پبلسٹی کے ذریعے پاکستان اور قائداعظمؒ کی حمایت میں ہندو نواز شیخ عبداللہ کے پراپیگنڈے کا مقابلہ کرتی تھی۔ خورشید کی اپنی زبانی ان کے ایک انٹرویو کے حوالے سے میں چند سطور لکھتی ہوں:

''قائداعظمؒ سے میری پہلی ملاقات نومبر 1942ء میں جالندھر میں ہوئی۔ ملاقات سرسری تھی لیکن یادیں ابھی بھی تازہ ہیں۔ قائداعظمؒ ان دنوں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سالانہ اجلاس کے افتتاح کے لیے جالندھر تشریف لائے تھے۔ میں اسی فیڈریشن کی طرف سے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ جالندھر گیا تھا۔ ہماری تنظیم کو اعلیٰ کارکردگی کی بنا پر پرچم دیا گیا جو قائداعظمؒ نے اپنے ہاتھوں سے مجھے عطا کیا۔''

اورینٹ پریس آف انڈیا کی نمائندگی بھی سرینگر میں خورشید کرتے تھے۔ اس حوالے سے قائداعظمؒ سے اکثر ملنے کے لیے جاتے۔ برصغیر کے مسلمانوں کے عظیم لیڈر اور تحریکِ پاکستان سے محبت کا یہ عالم تھا کہ خورشید ایک نوجوان اخبار نویس کی حیثیت سے قائداعظمؒ کے پاس جانے کے بہانے ڈھونڈتے۔ خورشید نے ایک بار انٹرویو بھی کیا۔

''اس زمانے میں سرینگر سے صرف دو ہی روزنامے نکلتے تھے مگر یہ اخبار آل انڈیا ریڈیو کی خبریں نقل کیا کرتے تھے۔ لاہور اور دہلی کے اخبار دو ایک روز تاخیر سے پہنچتے تھے۔ ان میں لاہور کے ٹریبیون، ملاپ، زمیندار، انقلاب اور احسان شامل تھے۔ ڈان اور سٹیٹسمین دہلی سے آتے تھے اس لئے قائداعظمؒ خبروں کے متعلق تشنہ ہی رہتے تھے۔ افسوس ناک بات یہ ہوئی کہ قائداعظمؒ نے جو مجھے پہلا اخباری بیان دیا وہ نواب بہادر یار جنگ کی وفات کے متعلق تھا......''

قائداعظمؒ کے سیکرٹری کی تقرری کے سلسلے میں ایک بار خورشید نے کہا ''میں بیان کی ٹائپ شدہ کاپی لینے کے لیے رکا۔ اس موقعہ پر قائداعظمؒ نے میری فیملی اور مالی حالات دریافت کرنے کے بعد فرمایا آپ میرے ساتھ بمبئی کیوں نہیں چلے جاتے! میں نے عرض کیا میں سوچوں گا۔ ارشاد ہوا آپ سوچیں اور جتنی دیر میں سرینگر میں ہوں، آپ عارضی طور پر میرے ساتھ کام کیا کریں۔''

خورشید کو زندگی میں اتنا بڑا اعزاز ملا اور اس کم عمری میں۔ 1944ء سے 1947ء کا طویل سیاسی سفر جس میں پاکستان معرضِ وجود میں آیا، ان کی زندگی کا

بہترین دور تھا۔ جب وہ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتے تھے۔ بابائے قوم جو اپنی کمزور صحت کے باوجود مسلسل کام کرتے تھے‘ ان کے ساتھ تحریکِ پاکستان کی جنگ لڑنا ایک ایسا قابلِ قدر اثاثہ تھا جو نہ صرف قابلِ فخر ہے بلکہ قابلِ ستائش بھی ہے اس لیے کہ پاکستان حاصل کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ قائداعظمؒ کی جنگ نہ صرف ہندوؤں اور انگریزوں سے تھی بلکہ نیشنلسٹ مسلمانوں سے بھی تھی‘ جو قدم قدم پر ان کے لیے مشکلات پیدا کرتے تھے۔ پاکستان بنا اور برصغیر کے نقشے پر دو آزاد مملکتیں معرضِ وجود میں آئیں۔ یہ حیران کن تھا اس لیے کہ سوائے قائداعظمؒ اور ان کے چند مخلص ساتھیوں کے کسی کو یقین نہیں تھا کہ شاعرِ مشرق کا یہ خواب حقیقت بن سکتا ہے۔

خورشید کہتے ہیں ''20 ستمبر 1947ء کو قائداعظمؒ سے میری آخری ملاقات ہوئی۔ میں سرینگر جانے کے لیے رخصت ہونے لگا تو انہوں نے حسبِ معمول کشمیری امور میں گہری دلچسپی لی اور مسلمان کشمیری لیڈروں کے نام پیغامات بھی بھیجے۔ اس طرح قدرت نے مجھے وہ عہد پورا کرنے کی توفیق بخشی جو 26 جولائی 1944ء کو میں نے اپنے دوستوں سے باندھا تھا کہ اب کشمیر اس وقت آؤں گا جب پاکستان بن چکا ہوگا۔''

لیکن خورشید کو کشمیر حکومت نے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت نومبر میں گرفتار کرلیا۔ تیرہ ماہ کی سخت قید کے بعد دسمبر 1948ء کو جیل سے رہائی ملی اور جنوری 1949ء میں وہ پاکستان آ گئے۔ اس عرصہ میں قائداعظمؒ کا انتقال ہو چکا تھا اور حکومت پاکستان نے خورشید کی ملازمت خود ہی ختم کردی تھی۔ پاکستان واپس آنے پر وہ جب لیاقت علی خان اور دوسرے اہم لوگوں سے ملے تو انہیں دوبارہ اس ملازمت پر بحال کرنے کی پیشکش ہوئی لیکن خورشید نے اس کے بعد کوئی سرکاری عہدہ یا نوکری زندگی

بھر قبول نہیں کی۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ کو جب کراچی جا کر ملے تو انہوں نے خورشید کو بار ایٹ لاء کرنے کے لیے لندن جانے کی ترغیب دی اور اس سلسلے میں ان کے سارے اخراجات بھی خود برداشت کرنے کی حامی بھری۔ انہیں احساس تھا کہ وہ قائداعظمؒ کے ایما پر کشمیر گئے تھے اور وہاں جاتے ہی جیل کی چار دیواری میں ڈال دیئے گئے تھے۔ محترمہ نے خود بھی بارہا بعد میں جب مجھے ان کے پاس رہنے کا شرف حاصل ہوا‘ یہ ذکر کیا تھا کہ قائداعظمؒ کو بھی اس کا قلق تھا کہ خورشید بغیر وجہ جیل میں ہے۔

بریگیڈیئر ریٹائرڈ این اے حسین سابق اے ڈی سی قائداعظمؒ نے اپنی کتاب ''دی گریٹ لیڈر'' میں لکھا ہے: ''ایک روز محترمہ فاطمہ جناحؒ نے قائداعظمؒ سے کہا پتہ نہیں خورشید کس حال میں ہے۔ جانے وہ اسے کب رہا کریں۔'' بعد میں مظہر اور میں متجسس ہوئے کہ یہ خورشید کون ہیں جن کا ذکر محترمہ فاطمہ جناحؒ اور قائداعظمؒ بڑی ہمدردی سے فرما رہے تھے۔ پتہ چلا کہ وہ کے ایچ خورشید ہیں جو قائداعظمؒ کے سیکرٹری تھے۔ پاکستان بننے کے بعد چھٹی لے کر اپنے گھر سرینگر گئے جہاں کشمیر گورنمنٹ نے انہیں گرفتار کرلیا۔ قائداعظمؒ اور محترمہ جب بھی بلکہ اکثر کے ایچ خورشید کا ذکر فرماتے تو ان کے لہجے میں شفقت‘ محبت اور ہمدردی ہوتی اور وہ اس بات پر خاصے فکرمند ہوتے کہ کہیں کشمیر گورنمنٹ ان پر تشدد نہ کر رہی ہو۔

خورشید 1951ء میں محترمہ فاطمہ جناحؒ کے کہنے پر بار ایٹ لاء کرنے انگلینڈ چلے گئے۔ نومبر 1954ء میں لاء کی ڈگری کے ساتھ واپس آئے۔ چند دن ایک دوست کے ہاں ٹھہرے اور جب محترمہ کو ملنے گئے تو انہوں نے اصرار کیا کہ وہ ان کے پاس آ کر رہیں۔ فلیگ سٹاف ہاؤس میں ایک حصہ انہوں نے اپنے دفتر کے لیے مخصوص کر دیا تھا جہاں ان کا سیکرٹری اور عملہ بیٹھتا تھا۔ محترمہ نے دفتر دوسرے

کمروں میں منتقل کر دیا اور وہ سارا حصہ خورشید کی رہائش گاہ میں تبدیل کر دیا۔ وہ ان کے ساتھ بہت شفقت سے پیش آتیں۔ قائداعظمؒ کے متعلق بھی یہ کہا جاتا ہے کہ زندگی میں ایک ہی نجی خط انہوں نے پنڈت نہرو کو لکھا جو خورشید کی رہائی کے متعلق تھا جس میں تحریر تھا: ''میرے پرائیویٹ سیکرٹری کی عدم موجودگی سے میرے کام میں حرج ہو رہا ہے' اسے آپ رہا کر دیجئے۔'' اور پنڈت نہرو نے جواب دیا تھا: ''اسے حکومتِ کشمیر نے گرفتار کیا ہے' ہمارا کوئی دخل نہیں۔''

خورشید بتاتے تھے کہ انگلستان کے قیام کے دوران محترمہ انہیں باقاعدگی سے خط لکھتی تھیں کبھی کبھی کھانے کی چیزیں بھی بھجواتی تھیں۔ خورشید بھی اپنی ہر مصروفیت اور پڑھائی سے انہیں آگاہ کرتے۔ ایسا لگتا ہے دونوں کا ماں بیٹے کا مقدس رشتہ تھا۔ خورشید کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے برصغیر کے سب سے بڑے لیڈر کے ساتھ ملک کی آزادی کے لیے کام کیا اور ان کا قرب انہیں حاصل رہا۔ گھر کے ایک فرد کی حیثیت حاصل رہی جو ان کی زندگی کا بہترین سرمایہ ہے۔

1956ء کے اوائل میں مجھے بھی یہ شرف حاصل ہوا کہ میں شادی کے بعد ان کے ساتھ فلیگ سٹاف ہاؤس میں قیام پذیر ہوئی۔ اس میں ان کی شفقت اور محبت شامل تھی کہ انہوں نے اصرار سے ہمیں وہاں رکھا۔ مہمان خانے کے کمرے تو پہلے ہی خورشید کے پاس تھے۔ میرے آنے پر انہوں نے سب کمروں کو از سرِ نو ترتیب دیا' فرنیچر پالش کرایا' پردے' قالین بدلوائے اور چند اور چیزیں بھی ضرورت کی وہاں رکھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہماری رہائش گاہ فلیگ سٹاف ہاؤس کے مین گیٹ سے داخل ہو کر دائیں طرف تھی۔ لمبا سا لکڑی کا جالی دار برآمدہ تھا جس میں چند سیڑھیاں بھی تھیں۔ برآمدے کے بعد ایک نشست گاہ تھی جس میں پائین باغ کا

نظارہ بہت خوبصورت لگتا تھا۔ بڑے بڑے فرانسیسی دریچے تھے جنہیں کھولنے سے یہ احساس ہوتا تھا کہ باغ میں بیٹھے ہیں۔ محترمہ کو پھول اور پودوں سے بہت شغف تھا۔ باغ میں دو مالی ہر وقت کام کرتے تھے۔ موسم کے پھولوں کی بہتات رہتی تھی اور سبز مخملیں گھاس رنگ برنگے پھولوں کی کیاریوں کے ساتھ ہم آہنگ معلوم ہوتی تھی۔ ہماری نشست گاہ پر بیلے اور چنبیلی کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں...... جن کی مہک سے فضا معطر رہتی تھی۔ نشست گاہ کا ایک دروازہ سونے کے کمرے میں کھلتا تھا' یہ کمرہ گول تھا۔ کونے میں بڑی بھاری لکڑی کی گول نشست گاہ تھی جس پر فان رنگ کے گدے اور گدیاں پڑی ہوتی تھیں۔ اس کی نشست پر بڑی بڑی فرانسیسی طرز کی کھڑکیاں تھیں جو اس صحن میں کھلتی تھیں جہاں دو نوکروں کے دس بارہ کوارٹر تھے۔ خوب بات ہے کہ اس صحن میں ایک طرف چیڑ کے بڑے بڑے تین درخت بھی تھے۔ کراچی میں چیڑ کا درخت نہیں ہوتا۔ اپنے طویل قیام میں مجھے یہاں بڑے بڑے گھروں میں جانے کا اتفاق ہوا لیکن چیڑ کا درخت کبھی کہیں نظر نہیں آیا۔ اصفہانی صاحب' نواب بھوپال' نواب بہاولپور' نواب جوناگڑھ' لیڈی ہدایت اللہ' سر عبداللہ ہارون کراچی کے صاحب ثروت لوگ تھے اور محل نما گھروں کے مکین تھے ان کے گھروں کے باغ نہایت خوبصورت تھے۔ کلیوں' پھولوں اور درختوں سے لدے ہوئے لیکن چیڑ کا درخت کہیں نہیں دیکھا۔ فلیگ سٹاف ہاؤس میں یہ درخت نہ صرف گھنیرے اور سایہ دار تھے بلکہ اونچے بلند قامت اور سرسبز تھے۔

سونے کے کمرے میں آبنوس کی لکڑی کے بھاری پلنگ تھے۔ ویسی ہی بھاری میز اور ایک طرف بیٹھنے کے لیے کالی لکڑی کا کندہ کیا ہوا صوفہ سیٹ تھا۔ بعد میں مجھے محترمہ نے بتایا کہ یہ سارا سامان اورنگ زیب روڈ دہلی سے قائداعظمؒ کے گھر سے یہاں

آیا تھا اور اکثر اشیاء قائداعظمؒ کی اپنی مرضی اور خواہش سے بنی ہوئی تھیں۔ چار چھوٹے قالینوں کے ٹکڑے بھی بچھے ہوتے تھے جو بڑے ہی قیمتی معلوم ہوتے تھے۔ ساتھ ڈریسنگ روم تھا جس میں بڑا قدِ آدم شیشہ، لمبی ڈریسنگ ٹیبل اور کپڑوں کی الماری تھی۔ ساتھ غسل خانہ تھا۔ سونے کے کمرے کے ساتھ ایک اور کمرہ تھا جسے بعد میں خورشید نے اپنی سٹڈی بنایا۔ اس میں ایک چوکور پڑھنے کی میز تھی اور چند کرسیاں بیٹھنے کے لیے پڑی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک غسل خانہ تھا۔ بڑی کھلی اور آرام دہ جگہ تھی۔

میری شادی سیالکوٹ میں 31 دسمبر 1955ء کو ہوئی۔ محترمہ نے خورشید سے کہا تھا کہ وہ ضرور شریک ہوں گی۔ چنانچہ میرے ابا نے ان کی رہائش کے لیے بڑا بندوبست کیا تھا۔ لیکن وہ بوجہ سردی کے نہ آ سکیں۔ ان دنوں پنجاب میں سردی بھی بہت پڑتی تھی۔ شروع کے چند سال سردی کے یاد آتے ہیں تو یقین نہیں آتا کہ ایسا جاڑا بھی ہوتا تھا۔ مسلسل بارش ہوتی تھی، صبح شام سخت کہر پڑتی تھی۔ بھاری گرم کپڑوں کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اور آتش دانوں میں صبح سے شام تک آگ جلتی تھی جو بڑی افسانوی لگتی تھی۔

محترمہ نے خورشید کے لیے شادی کا جوڑا خود بنایا جو انہوں نے بارات کے دن پہنا۔ براؤن رنگ کی شیروانی، جناح کیپ، لٹھے کی ڈوریوں والی شلوار اور سفید سلک کی قمیض تھی۔ شیروانی تو ابھی بھی میرے پاس محفوظ پڑی ہوئی ہے۔ میرے لیے ولیمے کا لباس انہوں نے بنوا کر بھیجا۔ سفید فرانسیسی ساٹن پر کامدانی کا کام تھا، بہت بھاری نہیں تھا لیکن بہت خوبصورت تھا۔ کامدانی کے ساتھ سفید بڑے بڑے موتی بھی لگے ہوئے تھے۔ سفید فرنچ شفون کے دوپٹے پر کامدانی کے ساتھ لپا اور کرن لگی ہوئی تھی۔ آج کل شادیوں کے لباس اتنے بھاری بنتے ہیں کہ ذرا بھی اچھے نہیں لگتے۔ ہر بات

میں تصنع اور بناوٹ زیادہ ہے جو مصنوعی لگتی ہے کچھ سال پہلے میں نے اپنی بری کا یہ سوٹ ایک غریب لڑکی کی شادی پر دے دیا۔ مجھے بڑے خوشی ہوئی جب میں نے اپنی اتنی قیمتی چیز کسی ضرورت مند کو دی۔ شاید مجھے یہ جوڑا اپنے پاس ہی رکھنا چاہیے تھا۔ محترمہ کی محبت اور لمس اس میں شامل تھے۔ پھر شاید وہ سوٹ تاریخ کا ایک حصہ بن جاتا۔ لیکن اس وقت میں نے ایسے نہیں سوچا۔

میرے لیے انہوں نے سونے کا بنا ہوا ایک بڑا خوبصورت سیٹ بھی بھیجا جس میں نیکلس، کانوں کے آویزے اور انگوٹھی تھی۔ مجھے محترمہ نے بعد میں بتایا کہ ایسے تین سیٹ قائداعظمؒ نے دہلی سے خود خریدے تھے جن میں دو سیٹ انہوں نے اپنی بھانجی کو شادی میں تحفہ میں دیئے اور تیسرا سیٹ انہوں نے مجھے دیا۔ میرے لیے کتنے فخر کا مقام تھا کہ قائداعظمؒ کے ہاتھ کا خریدا ہوا سیٹ مجھے ملا۔ وہی سیٹ میں نے اپنی بہو یاسمین کو شادی میں دیا اور مجھے یقین ہے کہ وہ اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھے گی کیونکہ اسکی اہمیت وہ جانتی ہے۔

محترمہ کے ساتھ فلیگ سٹاف ہاؤس میں میرا قیام نہایت پرلطف تھا۔ وہ دن میری زندگی کا اثاثہ ہیں، بہترین اثاثہ جن کی یادیں بڑی ہی دلکش ہیں۔ اس زمانہ میں وہ بہت متحرک تھیں۔ ملک کے سارے نامور سیاست دان، مسلم لیگی لیڈر اور دوسرے اہم لوگ انہیں ملنے صبح و شام آتے تھے۔ سیکرٹری اوقات مقرر کرتا، انہیں صبح مطلع کرتا تھا اور اس طرح نشست گاہ لوگوں سے آباد رہتی۔ میں بھی صبح کا زیادہ وقت محترمہ کے ساتھ گزارتی تھی۔ اس طرح مجھے بھی موقع ملا کہ ایسے لوگوں کو قریب سے دیکھوں اور ملوں جن سے ویسے ملنا قطعی ناممکن تھا۔ میرے لیے یہ بڑا انوکھا اور دلچسپ تجربہ تھا۔ اس نوعمری میں بڑے لوگوں کا قرب ایسی عجیب بات تھی کہ میں پہروں سوچتی کہ کیا یہ

حقیقت ہے' خواب تو نہیں کہ میں محترمہ کے قریب ہوں' ان کی باتیں سنتی ہوں' ان کے خیالات جانتی ہوں۔ ان کے شب و روز کی مصروفیات دیکھتی ہوں اور پھر ایسے لوگوں سے ملتی ہوں جن کا صرف نام ہی سنا ہوا تھا۔

محترمہ کی عادت تھی کہ رات کے کھانے پر اکثر دو چار اور بعض اوقات زیادہ لوگوں کو بلا لیتیں۔ کھانے سے پہلے اور بعد میں باتیں ہوتیں ملک کی سیاست پر' تحریکِ پاکستان پر' مسلم لیگ کے نظریے پر' قائداعظمؒ کے ارشادات پر' ان کی حکمت عملی پر اور پھر محترمہ کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کرتیں' دوسرے لوگ بھی بولتے۔ محترمہ کبھی اختلاف کرتیں' کبھی ہامی بھرتیں۔ لیکن اتنا ہے کہ ان کے دلائل' ان کی رائے' ان کے خیالات کے سامنے کسی کو دم مارنے کی گنجائش نہ ہوتی۔ ان کی سوچ بڑی وزن دار ہوتی' کھل کر رائے کا اظہار کرتیں پھر اس پر قائم رہتیں۔

اگر قائداعظمؒ عام آدمی نہیں تھے تو یقیناً محترمہ بھی ایک عام عورت نہیں تھیں۔ قائداعظمؒ جیسے لوگ صدیوں میں ایک بار پیدا ہوتے ہیں' محترمہ بھی کچھ ایسی ہی خوبیوں کی حامل تھیں۔ اتنی طویل زندگی کے برس انہوں نے قائداعظمؒ کے ساتھ گزارے۔ ملک کو بنتے دیکھا' تحریک کے پُرخار راستے میں قائداعظمؒ کا بھرپور ساتھ دیا۔ ان لمحات' ان واقعات کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ قائداعظمؒ کا مکمل خیال رکھا۔ مہمان داری کے فرائض انجام دیئے' ہر جگہ ان کے ساتھ گئیں۔ مسلم لیگ میں شعبہ خواتین کی اہم ذمہ داریاں ادا کیں۔ قائداعظمؒ کی زندگی اور پاکستان کی زندگی میں محترمہ نے ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا۔ لیکن حیرت ہے کہ وہ سارے لوگ' وہ سارے کردار جو ایک تاریخ ساز کردار جو تحریکِ پاکستان میں ان کے ساتھ تھے' کسی کو یہ خیال کیوں نہ آیا کہ ان کے حالاتِ زندگی پر بھی کچھ لکھا جائے۔ ان کے اس اہم رول پر قلم

اٹھایا جائے جو مادرِ ملت کی حیثیت سے بابائے قوم کے قریب رہ کر انہیں حاصل تھا۔ وہ تحریکِ پاکستان کی روحِ رواں تھیں۔ گرل گائیڈ' مسلم لیگ اور دوسرے فلاحی کاموں میں انہوں نے ایک بھرپور کردار ادا کیا۔ پاکستان بننے اور قائداعظمؒ کے انتقال کے بعد بھی ان کا کردار ایک افسانوی کردار ہے جس میں رنگ بھرے ہوئے ہیں جس میں کہنے کو' لکھنے کو' محسوس کرنے کو بہت کچھ ہے۔

خورشید نے جب تحریکِ پاکستان اور پاکستان کے ان لوگوں کے متعلق لکھنے کا ارادہ کیا تو سب سے پہلے انہوں نے محترمہ فاطمہ جناحؒ پر کتاب لکھنے کا ارادہ کیا۔ ان کے المناک حادثے کے بعد ان کے کاغذوں میں ایک کاپی مجھے ملی جس میں وہ لکھتے ہیں:

DATE: 21.06.1983

WHEN I PURCHASED THESE NOTE BOOKS (4 IN NUMBER) I HAD A VAGUE IDEA OF WRITTING ABOUT THE QUAID'S COLLEAGUES. I HAVE IN MIND BIOGRAPHICAL SKETCHES WITH PARTICULAR EMPHASIS BASED UPON MY PERSONAL OBSERVATIONS. I HAD IN MIND THE (NAMES OF) LIAQUAT ALI KHAN MR. ABDUR RAB NISHTER AND MR. M.A.H. ISHPHAHANI TO BEGIN WITH. BUT MEETING WITH WAJID ALI OF OUP HAS GIVEN DEFINITE SHAPE OF MAY VAGUE IDEAS. I ALTOGETHER STILL HAVE THE SAME PROJECT TO WRITE ABOUT. MISS FATIMA JINNAH THE QUAID'S GRACIOUS SISTER'S NAME CAME ON THE TOP.

کاش خورشید ایسا کرتے۔ اگلے چند صفحات میں انہوں نے محترمہ کے متعلق وہ تمام حوالے درج کئے ہیں جن سے ان کی زندگی پر لکھنے کے لیے مدد مل سکتی ہے۔ چند مضامین اور ایسی تحریروں کا بھی ذکر ہے جو اس سلسلے میں مشعلِ راہ ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہمت دی کہ میں نے اس کتاب کو مکمل کیا۔

میں نے فلیگ سٹاف ہاؤس میں قیام کے دوران ان چند باتوں کو ڈائری کی صورت میں محفوظ کر لیا تھا جو محترمہ کی ذات کے ساتھ وابستہ تھیں یا ان کے پاس آنے والے لوگوں کے لیے مجھے محسوس ہوتی تھیں۔ میں اکثر ڈائری لکھا کرتی ہوں۔ شاید اسی عادت کی وجہ سے میں ان کی باتیں' سیاست پر ان کے نظریے اور رائے کے متعلق لکھ لیتی تھی جنہیں احباب کے اصرار پر ان کے کچھ حصے حذف کر کے 1976ء میں' میں نے ''محترمہ فاطمہ جناحؒ کے شب و روز'' کے عنوان سے چھپوایا۔ یہ مختصر سی کتاب جس میں ان کی مصروفیات اور ان کے پاس آنے والے لوگوں کے متعلق تحریر ہے' پڑھنے والوں کو بہت پسند آئی۔ کراچی میں خاص طور پر یہ کتاب بہت بکی اور مقبول ہوئی۔ مجھے ایسے خطوط بھی ملے جن میں ان کے عقیدت مندوں نے کہا تھا کہ محترمہ کے متعلق غالباً یہ پہلی کتاب ہے جس کے مطالعہ سے ان کی ذات کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ عام تاثر تو یہی تھا کہ وہ قائداعظمؒ کے ساتھ ہر وقت رہتی تھیں' ان کا خیال رکھتی تھیں' مہمان نوازی کے فرائض انجام دیتی تھیں۔ ایک ایسی خاتون کے متعلق یہ رائے درست نہیں ہوگی جس نے زندگی کے اتنے طویل سال بابائے قوم کی خدمت کی۔ تحریکِ پاکستان کو شروع سے دیکھا' مسلم لیگ کے لیے کام کیا۔ فلاحی اداروں کے لیے دن رات ایک کیا اور برصغیر کے تاریخ ساز دور میں دنیا کے ایک عظیم سیاست دان کے ساتھ جو اس کا بھائی ضرور تھا لیکن ایک ایسا مفکر' ایسا سیاست دان تھا

جس نے بہت مشکل اور کٹھن حالات میں اپنے لوگوں کو آزادی دلوائی۔ اس لیے محترمہ کا رول آسان نہیں تھا۔ لیکن تاریخ دان اور لکھنے والے کتنی جلدی بھول گئے کہ اس عظیم عورت کی قربانی' ایثار اور خدمت معمولی بات نہیں تھی۔ کبھی کسی کو خیال نہ آیا کہ ان کی زندگی کے نشیب و فراز پر لکھے' ان کے خلوص کو پرکھے' ان کی خدمت کو منظر عام پر لائے۔ وہ خاتون جس کا نام فاطمہ جناحؒ تھا اور جس نے اپنے بھائی کے ساتھ پاکستان حاصل کرنے کی جنگ لڑی' عورت کی حیثیت سے کس کردار کی حامل تھیں! ان کی خدمات کیا ہیں؟ ان کا رول کیا ہے؟ وہ ساری باتیں جو ان کی ذات سے وابستہ ہیں' یہ سب آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ہوں گی۔

مجھے فخر ہے کہ میں نے ان کے ساتھ گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے ایک طویل عرصہ گزارا ہے اور ان کی متعلق بہت کچھ جانتی ہوں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے مجھے اپنی بھرپور شفقت سے نوازا۔ ان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے میری زندگی کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ آئندہ صفحات میں' میں اپنی ڈائری کے مندرجات پیش کرنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ اُمید ہے کہ اس سے مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کی زندگی کے بہت سے اہم گوشوں پر روشنی پڑے گی۔

مادرِ ملتؒ اور قائداعظمؒ

محترمہ فاطمہ جناحؒ اکثر باتوں میں اپنے بھائی کا بڑی محبت سے ذکر فرماتی تھیں۔ زندگی کے 30 سال انہوں نے آپ کے ساتھ گذارے۔ گھر داری کے علاوہ ان کی سیاست میں بھی وہ ان کی ہم سفر تھیں۔ تحریکِ پاکستان کے کٹھن دور کی عینی شاہد تھیں۔ پھر وہ خود قائداعظمؒ کا پرتو تھیں۔ اُن کی طرح سوچتی تھیں اور ان کی طرح نڈر، مخلص اور سچی تھیں۔ ایسے لوگ بے خوف ہوتے ہیں کیونکہ ان کے ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مسلسل کام اور محنت سے جب قائداعظمؒ نڈھال ہو جاتے تو محترمہ فکرمند ہو جاتیں کہ ان سے اصرار کرتیں کہ چند دنوں کے لئے چھٹی کر کے آرام کریں۔ کام نہ کریں تو قائداعظمؒ انہیں بڑی محبت سے سمجھاتے' ان حالات میں تھکن نہیں۔ لیکن تم نے سنا ہے کہ جنگ کے دنوں میں کوئی جرنیل چھٹی پر چلا جائے۔ اس وقت ہم اسی صورت سے دوچار ہیں۔ مسلمانانِ ہند کے لئے بڑا کڑا امتحان ہے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ کیسے آرام کروں؟ یہ احساسات تھے کہ ملک بن گیا۔ ورنہ یہ ممکن نہیں تھا۔ قائداعظمؒ نے تو اپنی بیماری بھی سب سے پوشیدہ رکھی۔ دن رات کام کیا اور پاکستان حاصل کیا۔ پاکستان کا بننا ایک معجزہ تھا۔ قائداعظمؒ نے نہ صرف مسلمانوں کو آزادی دلائی بلکہ ایک ملک تشکیل دیا جس کی مثال نہیں ملتی۔

قائداعظمؒ اپنے ارادوں میں اٹل تھے۔ ایک بار فیصلہ سوچ کر کر لیتے تھے تو پھر پلٹ کر نہیں دیکھتے تھے۔ محترمہ یہ بھی ذکر کرتی ہیں کہ انہیں کن کن طریقوں سے قائل کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہر طرح کے لالچ دیئے گئے لیکن وہ پاکستان کے حصول

کیلئے اپنے ارادوں، اپنی کوشش اور اپنی تگ ودو سے کبھی پیچھے نہ ہٹے۔ اس لئے ملک بنا ورنہ یہ بڑا مشکل اور کٹھن کام تھا۔

سچائی' ایمانداری' قوت ارادی محنت' حب الوطنی اور خلوص اُن کی زندگی کے اُصول تھے اور اس لئے آزادی کی کٹھن راہوں میں وہ کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔

محترمہ فاطمہ جناحؒ فرماتی تھیں کہ کیسے کیسے طریقوں سے انگریز اور ہندوؤں نے انہیں اپنے مقصد سے دور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن قائداعظمؒ بکنے والے نہیں تھے۔ اپنے ارادوں کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا کا بڑے سے بڑا لالچ بھی انہیں خرید نہیں سکتا تھا اس لئے ملک بنا اور مخالفوں کو شکست ہوئی۔

کبھی یہ بھی نہیں ہوا کہ ان کے قول و فعل میں کوئی تضاد ہو۔ یہ بات مخالفین بھی جانتے تھے کہ ذاتی زندگی بھی اُن کی آئینے طرح شفاف تھی۔ اس لئے کوئی اُنگلی نہ اُٹھا سکا۔ ورنہ مخالفین تو ان کی ذرا سی لغزش کو پہاڑ بنا سکتے تھے۔ لیکن آپ صاف ستھرے ارادوں کے ساتھ ___ ان کی زندگی برف کی طرف صاف و شفاف تھی اور یہ معمولی بات نہیں۔ اس کا اعتراف تو اُن کے مخالفین کو بھی تھا جو اُن کی ہر بات پر نظر رکھتے تھے۔

کاش! قوم انکے کردار کی بنیادی باتوں کو یاد رکھتی اور جن لوگوں نے ان کے بعد ملک کی باگ ڈور سنبھالی، قائد کی زندگی کے سنہری اصولوں کو اپنایا ہوتا تو ملک کا یہ حال نہ ہوتا جو ہم نے دیکھا۔ ہماری کوتاہیوں سے آدھا ملک ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا۔ ہم حریفوں میں دبتے چلے گئے۔ سرکاری عہدوں' پبلک عہدوں اور اختیارات کا ناجائز استعمال کیا گیا۔ قوم کا روپیہ اپنی ذات پر خرچ کیا گیا حالانکہ قائداعظمؒ نے بڑی آرام دہ زندگی گذاری۔ لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ انہوں نے اپنی ذات کے لئے صرف اپنی محنت سے کمایا ہوا پیسہ ہی خرچ کیا۔

قوم کے خزانے سے ایک روپیہ لینے والا قائد اور جو رات کو گورنر جنرل ہاؤس کی بتیاں بجھانے کا بھی حکم دیتے تھے۔ ان کی زندگی تو قوم کے لئے مشعل راہ ہے۔ اگر ان قدروں کو اپنایا جاتا تو آج ہمارا یہ حال نہ ہوتا! ابھی بھی وقت ہے کہ قائداعظمؒ کی زندگی کے وہ تمام پہلو اپنے لئے مشعل راہ بنائے جائیں جن سے اُنہوں نے پاکستان حاصل کرنے کی طویل جدوجہد میں قوم کو ایک لائحہ عمل دکھایا۔

کشمیر کو وہ پاکستان کی شہ رگ کہتے تھے۔ برصغیر کی تقسیم آبادی کی بنیاد پر ہوئی۔ کشمیر 80,000 سے زائد مسلمان آبادی کا ملک تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر وہ پاکستان کا حصہ تھا۔ قائداعظمؒ کو اس بات کا قلق تھا کہ ایسا کیوں ہوا۔ مسلمانوں کا قتل عام اور کشمیر کا اُلجھتا ہوا مسئلہ ان کے لئے بڑی پریشانی کا باعث تھا۔ مہاجرین کی آبادکاری اور ایسے حالات نے اُن کی صحت پر بہت برا اثر کیا۔ حصولِ پاکستان کی کٹھن تگ و دو میں دن رات کام کرنے سے اُن کی صحت بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ ان حالات نے انہیں اور آزردہ کیا۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ فرماتی تھیں کہ زیارت میں اپنی جان لیوا بیماری کے دوران بھی بے ہوشی کی حالت میں اُن کی زبان پر یہی الفاظ تھے کہ آج کشمیر کمیشن کے ارکان نے مجھ سے ملنے آنا ہے۔

گویا کشمیر بیماری کے دوران قائداعظمؒ کے اعصاب پر تھا۔ محترمہ نے فرمایا کہ قائداعظمؒ نے صحافت کو ایک مقدس پیشہ سمجھا جو ملک کی تعمیر کے لئے اہم ہے۔ صحافیوں سے ملتے اور ان کے خیالات سنتے۔ خورشید صاحب بھی ایک نوجوان صحافی کے طور پر کشمیر میں قائداعظمؒ سے متعارف ہوئے تھے جہاں 1944ء میں وہ آرام کی غرض سے گرمیوں میں گئے تھے۔ خورشید صاحب سناتے تھے کہ ایک دن حسب معمول جب وہ قائداعظمؒ سے ملنے گئے تو آل انڈیا ریڈیو کے حوالے سے اُنہوں نے

قائداعظمؒ کو بہادر یار جنگ کی وفات کی خبر سنائی۔ قائداعظمؒ یہ سن کر یکدم چپ ہو گئے اور پھر کہنے لگے کہ یہ خبر غلط بھی ہو سکتی ہے۔ خورشید نے جب آل انڈیا ریڈیو کا حوالہ دیا تو فرمانے لگے ایک بار اُنہوں نے میری رحلت کی خبر بھی نشر کی تھی بلکہ سندھ میں تو ایک قرارداد بھی اس سلسلے میں پاس ہوئی تھی۔ اس لئے اس کا بھروسہ نہیں۔ کچھ دیر بعد جب خبر کی تصدیق ہوئی تو اُنہوں نے تعزیتی بیان ریکارڈ کرایا۔

''آپ کو یاد ہوگا کہ اجلاس پٹنہ میں ہم نے خواتین کی ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ ہمارے لئے یہ بہت اہمیت کی بات ہے' کیونکہ میں اس کا قائل ہوں کہ ہمارے لئے یہ ازبس ضروری ہے کہ ہم اپنی خواتین کو اپنی زندگی کی جدوجہد اور کام میں ہر موقع مہیا کریں۔ خواتین گھروں اور پردے میں رہ کر بھی بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ ہم نے یہ کمیٹی اس لئے مقرر کی تھی کہ وہ بھی لیگ کے کام میں حصہ لے سکیں' اس مرکزی کمیٹی کے یہ اغراض و مقاصد تھے (۱) صوبائی اور ضلعی مسلم لیگوں کی تنظیم (۲) بڑی تعداد میں خواتین کو مسلم لیگ کی رکن بنانا (۳) سارے ہند میں مسلم خواتین میں زبردست نشر و اشاعت کرنا تاکہ ہماری خواتین میں زیادہ سیاسی شعور اور بیداری پیدا ہو سکے۔ یاد رکھئے کہ آپ کے بچوں کے لئے فکر اور تردد کی کوئی بات نہیں ہو گی (۴) مسلم معاشرے کی ترقی کے ضمن میں ان امور کے بارے میں ان کی رہنمائی کرنا اور مشورہ دینا جن کا زیادہ تر انہیں پر دارومدار ہوتا ہے۔''

کہنے لگیں خواتین کی حوصلہ افزائی کے لئے خواتین پر ایک بار دہلی عریبک کالج میں صرف خواتین کے ایک جلسے سے اُنہوں نے خطاب کیا تھا۔ جس میں ہزاروں خواتین شریک ہوئیں۔ قائداعظمؒ نے اُردو میں تقریر کی۔ ان کے کام کو سراہا اور انہیں منظم اور ثابت قدم رہنے کی تلقین کی۔

میری دلچسپی اور حیرانی بڑھی جب محترمہ نے فرمایا کہ ہماری چند خواتین لیڈی کرپس اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن کو بھی ملی تھیں اور پاکستان کے قیام کی اہمیت کا اُنہیں بتایا تھا اور انہیں اپنے موقف سے قائل کیا تھا۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن مسلمان عورت کے جذبے سے کافی متاثر ہوئی تھی۔

تقسیم سے پہلے بھی ہندو مسلم فسادا کثر ہو جاتے تھے۔ محترمہ نے فرمایا وہاں بھی ہماری عورت نے اپنا رول ادا کیا۔ چندہ جمع کیا' زخمیوں کی مرہم پٹی کی۔ کھانے پینے کا انتظام کیا۔

کہنے لگیں ایک بات تعریف کے قابل تھی کہ اس دور میں لالچ اور پیسہ حاصل کرنے کی ناجائز خواہش کسی میں نہ تھی۔ ایک جذبے کے تحت ایمانداری اور لگن سے کام ہوتا تھا۔ جس سے ملک تشکیل ہوا اور آزادی حاصل ہوئی۔ ہندو اور انگریز کی تمام تر کوششوں سے یہ تحریک نہ دب سکی۔

اس جذبے کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ میں یہ باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔ محترمہ فرمانے لگیں اب تمہاری نوجوان نسل کا یہ فرض ہے کہ اس کہانی کی تکمیل کرو۔ آزادی کا سفر یہاں ختم نہیں ہوا۔ استحکام کی ضرورت ہے۔ ملک کو بنانا ہے، قائم رکھنا ہے۔ قائداعظمؒ کا قول ہے کہ ”کام کام اور صرف کام“ اس کے ساتھ ملک کی ترقی کی راہوں پر گامزن کرنا ہے۔۔۔۔ ہم سب باتوں میں بہت پیچھے ہیں۔ اپنی ذات سے ہٹ کر ملک کے استحکام کا سوچنا چاہیئے۔“ میں جب وہاں سے اُٹھی تو حب الوطنی کے جذبات سے زیر لب خود سے کہا۔ محترمہ ہم آپ کو اور قائداعظمؒ کی روح کو مایوس نہیں کریں گے۔ آپ کا مشن آگے بڑھائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ سے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ ”مجھے اور میری قوم کے دوسرے افراد کو اس قابل کرے کہ پاکستان کے وجود کا ننھا پودا ایک تن آور درخت بن جائے۔

مجھے یاد ہے جب ہم محترمہ کے پاس رہتے تھے تو کئی بار وہ صبح 11 بجے میرے کمرے میں آجاتی تھیں۔ خورشید صبح 8 بجے عدالت میں چلے جاتے تھے۔ میں اپنا کمرہ اور سب چیزیں درست کر کے کپڑے بدل کر تیار ہو جاتی تھی۔ میں آگے بڑھ کر انہیں صبح بخیر کہتی تھی۔ تھوڑی دیر میں سامنے فرانسیسی دریچے کے فان آور گرے رنگ کے صوفے پر بیٹھی تھیں۔ ایک اچٹتی ہوئی نظر کمرے پر ڈالتی تھیں اور فرماتی تھیں۔۔۔ میں خوش ہوں۔ تم ORGANIZED ہو۔ تمہارا کمرہ اور ہر چیز ترتیب سے ہوتی ہے۔ گرد وغبار کہیں نظر نہیں آتا۔ تم تو پھول ہی سجانے کی شوقین ہو۔ یہ اچھی بات ہے۔ ان دنوں اوپر کے کام کے لئے ان کے پاس ایک ایبٹ آباد کا نوجوان لڑکا تھا۔ جس کا نام اسحاق تھا۔ وہ ہی صبح ہمارے کمرے میں ناشتہ لاتا تھا اور اس کے ذمہ ہی ہمارے کمرے کی صفائی اور جھاڑ پونچھ تھی۔ بہت باتونی تھا۔ کام سے زیادہ باتیں کرتا تھا۔ میں نے اسے کہہ دیا کہ زیادہ جھاڑ پونچھ نہ کیا کرے۔ شاید محترمہ کو معلوم نہیں تھا۔ کہنے لگیں۔ اسحاق نہایت کام چور اور نکما ہے۔ صرف باتیں کرتا ہے اور طبیعت کا ہنس مکھ ہے۔ جب تم نہیں آئی تھیں تو میں کبھی کبھی خورشید کے کمرے میں آتی تھی تو میں اسے ڈانٹتی تھی کہ کمرہ صاف نہیں۔ چیزیں جگہ پر نہیں۔ اب ایسا نہیں۔ یہاں آتے ہی احساس ہوتا ہے کہ THERE IS A WOMAN'S HAND۔ میں خوشی سے جھوم گئی۔ محترمہ کا ایسے کہنا میرے لئے باعث فخر ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میری تربیت ایسی ہوئی ہے کہ مجھے ان باتوں کا احساس ہے۔ اور یہ سب باتیں کتنی چھوٹی ہیں لیکن زندگی میں ان کی کتنی اہمیت ہے۔

سوچتی ہوں اُنہوں نے قائداعظمؒ کے ساتھ زندگی کے اتنے طویل برس گزارے ہیں۔ گھر داری، مہمان نوازی کے ساتھ ان کا کتنا خیال رکھا۔ واقعی اگر وہ قائداعظمؒ کی زندگی میں نہ آتیں تو ان کے لئے اتنا کام اور پاکستان کا حصول کتنا مشکل

ہو جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک اچھی عورت کسی بھی رشتے میں مرد کی زندگی بہت آسان کر دیتی ہے۔ اس لئے اس کا ذہن بہتر باتوں اور خاص کاموں کے لئے تازہ رہتا ہے۔

"فلیگ سٹاف ہاؤس" کے باغ میں ہر موسم کے پھول ہوتے ہیں۔ اگر کبھی پھول کم ہوتے تو میں سرسبز پتیاں اور پتے ہی گلدانوں میں سجا دیتی تھی۔ ہماری نشست گاہ کی دیوار جالی دار لکڑی کی بنی ہوتی تھیں۔ اس پر بیلے اور چنبیلی کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں جو خوبصورت بھی تھیں۔ لیکن ان کی مہک بڑی افسانوی تھی یوں لگتا تھا گویا کمرے میں چاروں طرف پھول برس رہے ہوں۔ میں پھولوں کے دیس کی رہنے والی ہوں۔ شاید اس لئے مجھے پھولوں سے محبت ہے۔ میں نے بارہا خوبصورت پھول محترمہ کی نشست گاہ میں بھی سجائے ہیں۔

فلیگ سٹاف ہاؤس-ایک افسانوی عمارت

نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن کی تجویز پر حکومت پاکستان نے سال 2001ء کو قائداعظمؒ کے 125ویں سال ولادت کی مناسبت سے سال قائداعظمؒ قرار دیا تھا۔ اس سال کے اختتام پر 25دسمبر 2001ء کو مزار قائداعظمؒ میں قائداعظمؒ کے افکار و کردار پر ایک سیمینار منعقد کیا گیا۔ اس سلسلے میں میں کراچی گئی تو خواہش پیدا ہوئی کہ فلیگ سٹاف ہاؤس ضرور جاؤں جسے قائداعظمؒ ہاؤس کہا جاتا ہے۔ اس جگہ کے ساتھ جو بانی پاکستان کا ذاتی گھر ہے میری بڑی جذباتی اور حسین یادیں وابستہ ہیں جن پر عرصہ گزر جانے پر بھی کوئی دھول نہیں پڑی، کوئی مٹی نہیں پڑی، کوئی آنچ نہیں آئی۔

زرد پتھروں سے بنی ہوئی وکٹورین سٹائل کی یہ عمارت انیسویں صدی کے آخری سالوں میں تعمیر ہوئی۔ اس کا ڈیزائن برطانوی حکومت کے ایک ماہر آرکیٹیکٹ جے ایچ سوماک (J.H.SOMAK) نے بنایا تھا۔ اندازہ یہی ہے کہ 10241 مربع گز پر پھیلی ہوئی یہ افسانوی عمارت 1865ء کے قریب تیار ہوئی۔ مشاہدات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قائداعظمؒ نے تحریک پاکستان کے فیصلہ کن دنوں میں یہ عمارت 1943ء میں کراچی کے ایک سابق میئر سہراب جی کاؤس جی سے خریدی تھی۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ بتایا کرتی تھیں کہ چونکہ قائداعظمؒ بمبئی اور پھر دہلی میں رہے اس لئے انہیں اس شاندار گھر میں رہنے کا موقعہ نہیں ملا۔ صرف چند بار آئے۔ پاکستان بن جانے کے روح افزا خیال سے قائداعظمؒ کو پاکستان میں اپنا ذاتی گھر خریدنا یقیناً بڑا اچھا لگا ہوگا اور شاید ذہن میں یہ خیال بھی ہو کہ وہ اپنے اس خوبصورت

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

گھر میں قیام کریں گے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ گورنر جنرل ہاؤس میں آ کر قیام پذیر ہوئے اور زندگی نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنی محنت کی کمائی سے خریدے ہوئے اس خوبصورت گھر میں قیام کرتے۔ لیکن تقسیم کے بعد دہلی میں ان کے گھر 10 اورنگزیب روڈ کا سارا سامان اسی گھر میں آیا۔

پرانے ریکارڈ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ 1940ء میں یہ گھر برٹش انڈین آرمی نے کرایہ پر حاصل کیا تھا۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد 13 ستمبر 1948ء کو اپنے اس شاندار گھر میں آئیں اور 1965ء تک اس میں رہیں۔ اس کے بعد موہٹہ پیلس منتقل ہو گئیں۔ لیکن وہاں انہیں زیادہ عرصہ رہنے کا موقع نہ ملا۔ صرف دو سالوں کے بعد وہ وفات پا گئیں۔ مجھے یاد ہے وہ کہا کرتی تھیں کہ ان کا اس بڑے گھر میں دل نہیں لگتا۔ فلیگ سٹاف ہاؤس انہیں بھی بہت پسند تھا۔

محترمہ کی وفات کے بعد حکومت کو یہ خیال آیا کہ قائداعظمؒ کے اس ذاتی گھر کو قومی ورثے کے طور پر محفوظ کرنا چاہیے۔ شروع میں تو محکمہ آثارِ قدیمہ نے اس عمارت کی دیکھ بھال کی لیکن 1985ء میں حکومت نے اس قیمتی عمارت کو 'قومی یادگار' کے طور پر اپنی تحویل میں لینے کا فیصلہ کیا۔ قائداعظمؒ کی جائیداد کے منتظمین نے یہ تاریخی عمارت اکاون لاکھ سات ہزار روپے میں حکومت کو بیچ دی تا کہ قومی ورثے کے طور پر قائداعظمؒ کے ذاتی گھر کی حیثیت سے اس کی شان برقرار رہے اور آنے والی نسلیں' قائداعظمؒ کے ذاتی گھر کو بابائے قوم کی پُر نفاست زندگی کے نمونے کے طور پر ہمیشہ یاد رکھیں۔

جیسا کہ میں بیان کر چکی ہوں اس بار کراچی آنا قائداعظمؒ کی 125 سالگرہ کی تقریب کے حوالے سے تھا۔ قائداعظمؒ، محترمہ فاطمہ جناحؒ اور پھر فلیگ سٹاف ہاؤس سب میرے ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔ یادوں کے جھروکوں سے بھی وہی دن یاد آ

رہے تھے جب میں پہلی بار اس افسانوی عمارت میں داخل ہوئی تھی' جہاں میرے شوہر کے ایچ خورشید کا قیام تھا اور اب مجھے بھی یہاں رہنا تھا۔ محترمہ نے نہایت شفقت سے خورشید کو انگلینڈ سے بار ایٹ لاء کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے گھر میں رہنے کی دعوت دی تھی اور اصرار کیا تھا کہ شادی کے بعد وہیں رہیں۔ اُنہوں نے بڑی شفقت کا مظاہرہ کیا تھا جس کی تپش اتنے برس گزر جانے کے بعد اب بھی محسوس ہوتی ہے۔

انہی خوبصورت یادوں کے ساتھ جب میں نے اس عمارت میں قدم رکھا تو یوں لگا کہ سالوں کا فاصلہ لمحوں میں ختم ہو گیا ہے۔ عرصہ گزر جانے کے باوجود وہی ابتدائی دن میری یادوں میں تازہ ہیں گویا میں ابھی اُسی دور میں ہوں۔ عقیدت سے میری نگاہیں جھک گئیں۔ قائداعظمؒ کا گھر اور محترمہ فاطمہ جناحؒ کی رہائش گاہ جو وقت گزرنے کے باوجود اُسی حسن اور جاذبیت سے استادہ تھی۔ شروع میں گیٹ کے پاس وہی ایک قطار میں استادہ پیپل کے تین بڑے بڑے درخت اور وہی پتھروں کی حسین عمارت، ملحقہ برآمدے کے ساتھ ہماری رہائش گاہ تھی جہاں اب محکمہ نے لائبریری بنا دی ہے۔ ان کمروں کے ساتھ لکڑی کی جالی کا برآمدہ تھا جو اب دیوار بن گئی ہے۔ ساتھ کے کمرے کو 'ریکارڈ روم' کے طور پر بدل دیا گیا ہے۔ برآمدے سے باہر نکل کر کوٹھی کے پچھواڑے میں سرونٹ کوارٹرز کی لمبی قطاریں تھیں۔ وہ اب بھی وہیں ہیں اور ویسی ہی ہیں۔ صرف رنگ و روغن پہلے سے نہیں ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ محترمہ کبھی کبھی مجھے وہاں جانے کیلئے کہا کرتی تھیں تا کہ ملازموں کے متعلق انہیں سکون رہے۔ ان کے بچوں کی خیریت دریافت کرتی تھیں اور اگر ان کے مسائل ہوتے تھے تو اُنہیں بھی سنتی تھیں۔

اس عمارت میں وہی جلال تھا' وہی وجاہت تھی، کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ البتہ لوگ وہ نہیں تھے۔ صرف ذہن میں بسے ہوئے تھے اور ان کے وجود کا احساس ان

کمروں میں ہوتا تھا۔ لگتا تھا ابھی بھی وہی مانوس چہرے نظر آئیں گے۔ میرے ذہن میں محترمہ کا سراپا بسا ہوا تھا۔ ان کا بے شکن سفید اُجلا ریشم کا لباس، سبک رفتار سراپا اور دل نشیں گفتار۔ لیکن یہ تو ذہن تھا، خیالات تھے جو ماضی کے جھروکوں میں ہم سے اوجھل ہو گئے تھے۔ کاش ایسے نہ ہو، لیکن ہوتا تو ایسے ہی ہے۔

میں ایک ایک کمرے سے دوسرے افراد کے ساتھ گذر رہی تھی۔ وہی سامان، وہی آرائش، بھاری لکڑی کا فرنیچر، آبنوس اور شیشم کی لکڑی کا خوبصورت فرنیچر کھانے کے کمرے میں وہی میز اور وہی کرسیاں۔ مجھے یاد ہے ہم تینوں جب اکٹھے کھانا کھاتے تھے تو کونے میں چار افراد کی ایک چھوٹی میز پر بیٹھتے تھے۔ دعوت یا مہمانوں کی آمد کے موقع پر بڑی میز استعمال ہوتی تھی۔ الماریوں میں وہی مانوس چائنا سیٹ پڑا تھا۔ اکثر کریم رنگ کے ڈنر سیٹ میں کھانا کھایا جاتا تھا لیکن دعوت کے موقع پر قرمزی شیشے والا ڈنر سیٹ استعمال ہوتا تھا۔ وہی فرانسیسی شیشے کے لمبے گلاس جو کھانے کے کمرے کی الماری میں سالوں کے بعد بھی وہیں ویسے ہی تھے۔ صرف انسان وہ نہیں رہے۔ زندگی سے بھی نکل جاتے ہیں۔ لیکن ضرورت کی اشیاء ان اچھے ایام کی یادیں ضرور تازہ کر دیتی ہیں۔ بڑی نشست گاہ کے ساتھ چھوٹی نشست گاہ میں وہی سامان پڑا ہوا تھا۔ ساتھ وہ چھوٹا کمرہ بھی مجھے یادوں میں ویسا محسوس ہوا جہاں صبح کے وقت محترمہ اپنے سیکرٹری کے ساتھ روز کی ڈاک اور اخبارات دیکھتی تھیں۔ اور ساتھ ملاقات کے لئے آنے والے لوگوں کا وقت تعین کرتی تھیں۔ عقب میں کھلا چوڑا برآمدہ وہی نظارہ دے رہا تھا جو اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی ویسا ہی تھا۔ تصور میں وہاں آنے جانے والے لوگوں کو دیکھتی رہی جو آج صرف یادوں میں بسے ہوئے ہیں اور اُفق کی بلندیوں میں کھو گئے ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ کھانے کے کمرے

کی پشت پر مختصر برآمدے کے بعد کچن تھا جہاں اب محکمے کا دفتر ہے اور جہاں وہ رجسٹر بھی پڑا ہوا تھا جس پر آنے والے لوگوں کے تاثرات قلمبند کروائے جاتے ہیں۔ میرے ذہن میں اُسی عبدل نامی میمن باورچی کا عکس اُبھرا جو ان دنوں محترمہ کا کھانا پکاتا تھا اور جس کی سندھی بریانی انہیں بہت پسند تھی۔ بڑا باتونی تھا اور اپنے کھانے کی تعریفیں بھی بہت کرتا تھا۔

کھانے کے کمرے اور نشست گاہ کے درمیان زینہ اوپر جاتا ہے جہاں ہم محترمہ کو ہر شب سونے کے لئے جانے سے پہلے شب بخیر کہا کرتے تھے۔ بھاری لکڑی کا خوبصورت زینہ اوپر کی منزل پر یوں کھلتا ہے جس کے دونوں اطراف محترمہ اور قائداعظم کی خواب گاہیں ہیں۔ محترمہ کی خواب گاہ میں وہی پلنگ پڑا ہوا ہے جس پر وہ سوتی تھیں۔ پلنگ کو دیکھ کر میں آبدیدہ ہو گئی کیونکہ اُسی پلنگ پر اُنہوں نے نیند میں جان دی۔ حیرت ہے کہ ان کے ساتھ کیا ہوا؟ نہ حکومت وقت نے تحقیقات کروائی، نہ پوسٹ مارٹم ہوا، حالانکہ بیمار نہیں ہوئیں اور اُسی شب وہ حیدرآباد کے میر لائق علی کی بیٹی کی شادی میں شریک بھی ہوئی تھیں۔ معمول کے مطابق اُوپر گئیں اور بیدار نہ ہوئیں۔ ان کے ساتھ کیا ہوا؟ یہ قوم کے لئے ایک معمہ ہی رہا۔ وہ تو روز تنہا اُوپر سوتی تھیں اور یہ ان کی زندگی کے معمول تھے جنہیں وہ نہایت ثابت قدمی سے نبھا رہی تھیں۔ اس شب ان کے ساتھ کیا ہوا؟ اگر دل کا دورہ تھا تو اکیلے ہی اُنہوں نے وہ لمحے اذیت کے ساتھ وہیں گزارے۔ قوم کی محسنہ کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا، کوئی تو ساتھ ہوتا۔ میں بارہا ان کے ڈریسنگ روم میں سوتی تھی جب خورشید مقدمے کی پیروی کیلئے لاہور جاتے تھے۔ کاش اُس رات میں وہاں ہوتی۔ اتنے سالوں کے بعد میں یہ سوچ کر آبدیدہ ہو گئی۔

ساتھ والی خوابگاہ قائداعظمؒ کی ہے جو انہوں نے خواب گاہ کے طور پر کبھی استعمال نہیں کی۔ لیکن اورنگزیب روڈ دہلی سے ان کی خواب گاہ کا سامان اس کمرے میں رکھا گیا تھا۔ مجھے یاد ہے محترمہ تین چار ماہ کے بعد ان کی خواب گاہ صاف کرواتی تھیں۔ اس روز بڑی آزردہ ہوجاتی تھیں۔ ہم 11 بجے کی چائے اس دن وہیں کھلے برآمدے میں پیتے تھے جو دونوں خواب گاہوں کے درمیان بنا ہوا ہے۔ اس دن اس برآمدے میں کھڑے ہوکر نیچے کشادہ لان میں وہی شمع جمہوریت میری نظروں میں گھوم گئی جو 1965ء کے الیکشن کے دوران کراچی کے شہریوں کی طرف سے فلیگ سٹاف ہاؤس کے کشادہ لان میں روشن ہوئی تھی۔ کئی فٹ اونچی یہ شمع جمہوریت کا سمبل تھی جو ایوب خان جیسے آمر کے ساتھ الیکشن کا مقابلہ کرنے کے لئے محترمہ نے روشن کی تھی۔ یہ گھر 1965ء کے تاریخ ساز دور میں سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بھی رہا جب قوم کے اصرار پر متحدہ محاذ کے اُمیدوار کی حیثیت سے محترمہ نے ملک اور قوم کو قائداعظمؒ کی جمہوریت کا سبق یاد دلایا تھا جس کی بنیاد پر پاکستان حاصل کرنے کی فیصلہ کن جنگ لڑی گئی تھی۔ کاش! محترمہ الیکشن جیت جاتیں تو ملک کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔ وہ دھاندلی کی وجہ سے جیتا ہوا الیکشن ہار گئیں اور ایوب خان پھر ملک کا صدر بن گیا۔ آنے والے ابتر حالات سے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ اگر محترمہ صدر بن جاتیں تو پاکستان کی ساکھ کو نقصان نہ پہنچتا۔ جمہوریت کی بحالی ہوتی۔ مشرقی پاکستان ہمارے ہاتھ سے نہ جاتا اور ایوب خان کے بعد یحییٰ خان اور ضیاالحق جیسے فوجی ڈکٹیٹر ملک کے سیاہ وسفید کے مالک نہ ہوتے۔ تاریخ میں بعض فیصلے بڑے اہم ہوتے ہیں جن سے ملک کی تقدیریں بدل جاتی ہیں اور حالات ایسے کروٹ لیتے ہیں جو انسان کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتے۔

لوگ آجا رہے تھے۔ میں محترمہ کے وجود کے احساس میں گم تھی۔ گھر کے باہر دونوں گیٹوں پر مجھے پولیس کا وہی پہرہ یاد تھا جو محترمہ کو ناگوار لگتا تھا۔ حکومت کی طرف سے پولیس کا تعین وہ پسند نہیں کرتی تھیں۔ اُنہوں نے بارہا کہا تھا کہ یہ گارڈ ہٹا دی جائے لیکن حکومت قائداعظمؒ کی بہن کی حفاظت کے لئے گارڈ کو رکھنے پر اصرار کرتی تھی۔ محترمہ تو کہا کرتی تھیں کہ یہ پہرہ یہاں صرف اس لئے ہے کہ ہر آنے جانے والے شخص پر نظر رکھی جائے ورنہ اس کی ضرورت وہ محسوس نہ کرتے۔ وہ خود تو بے خوف وخطر ہر جگہ جایا کرتی تھیں اور لوگ بڑی عقیدت سے ان سے محبت کا اظہار کرتے تھے۔ کہا کرتی تھیں مجھے ایسے لوگوں سے تو کوئی ڈر نہیں اور اسی سے حکومت ڈرتی ہے کہ قائداعظمؒ کی بہن کو وہ چاہتے ہیں۔

قائداعظمؒ کی بہن سے چاہت تو قوم کو ہونا ہی چاہیے تھی اسکی وہ مستحق تھیں۔ میرے ذہن میں محترمہ کا روسی کتا زرغون بھی گھوم رہا تھا جو محترمہ کے ساتھ ساتھ رہتا تھا اور ان کے خواب گاہ کے باہر رات کو سوتا تھا۔ بارہا کہا کرتی تھیں کتا انسانوں سے زیادہ وفادار ہوتا ہے۔

قائداعظمؒ ہاؤس سے ماضی کی پیاری یادیں سمیٹے ہوئے جب گیٹ سے باہر نکلی تو میرے ذہن میں یہ بات پہلے سے بھی زیادہ موجزن تھی کہ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے بابائے قوم کی عظیم بہن کا قرب حاصل ہوا جو اپنے بھائی کا پرتو تھیں اور ان کے جہادِ پاکستان میں پوری طرح شریک تھیں۔ زندگی کے تقریباً تیس برس اُنہوں نے قائداعظمؒ کے ساتھ گزارے، گھرداری کے ساتھ ان کا ہر طرح خیال رکھا، ان کی صحت کی طرف توجہ دی ورنہ قائداعظمؒ کی جو مصروفیات تھیں انہیں کہاں اپنا فکر رہتا اگر فاطمہ جیسی بہن ان کے ساتھ نہ ہوتیں۔ ان کے سیاسی سفر میں بھی وہ ان کی معاون رہیں۔ قائداعظمؒ نے ہی اپنی بہن کے متعلق ایک بار کہا تھا:

"میرے لئے وہ اس وقت معاون ثابت ہوئیں جب ہم ایک بہت بڑے انقلاب سے ہمکنار ہو رہے تھے۔"

سیاست کے پیچ وخم سے وہ آگاہ تھیں۔ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کی ممبر تھیں۔ خواتین مسلم لیگ کو انہوں نے منظم کیا۔ گھر گھر پاکستان کے قیام اور قائداعظمؒ کے پیغام کو پہنچایا۔ قدرت کا یہ کیسا انمول تحفہ تھا کہ ایک ہی گھر میں محمد علی جناح اور فاطمہ جناحؒ پیدا ہوئے جنہوں نے تاریخ میں نام پیدا کیا۔

قدم قدم چلتی ہوئی فلیگ سٹاف میوزیم سے جب میں باہر نکلی تو ماضی کی ان خوبصورت یادوں کے ساتھ محترمہ کا پرخلوص چہرہ میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا اور ان کی باتیں مجھے یاد آرہی تھیں۔ بار ہا کہا کرتی تھیں۔ "پاکستان نوجوان نسل کی محنت کا ثمر ہے۔ بزرگوں کے ساتھ ان کا کام اور ساتھ بڑا اہم تھا۔ اب بھی ہمیں نوجوانوں پر بھروسہ ہے کہ وہی یہ شمع لے کر ملک کی بقا اور ترقی کے لئے قائداعظمؒ اور ان کے ساتھیوں کے نقش قدم پر چلیں گے۔"

یہ پیغام اب بھی اتنا ہی مؤثر ہے جتنا پہلے تھا۔ نوجوان نسل ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں اور انہیں صحیح سمت میں جانے کی ضرورت ہے۔ اسی میں ہی ہماری بقا ہے اور ہماری ترقی واستحکام کی ضمانت ہے۔

قائداعظمؒ میوزیم ہاؤس کو اس سال موجود حکمت نے فاطمہ جناحؒ ہاؤس کا نام دے دیا ہے۔ یہ نام بھی اتنا ہی اہم اور خوبصورت ہے۔ کاش! پاکستان قائداعظمؒ، مادر ملتؒ اور ان کے پرخلوص ساتھیوں کی اُمنگوں اور خواہشات کا مسکن بن جائے۔

باغِ قائداعظمؒ کا میوزیم

25 دسمبر 2001ء کو قائداعظمؒ کے 125ویں یوم پیدائش کے سلسلے میں شرکت کے لئے جب مجھے کراچی آنے کا دعوت نامہ موصول ہوا تو اس تقریب میں شمولیت کے ساتھ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ اس موقع پر قائداعظمؒ کے وہ کپڑے بھی حکومت کے حوالے کروں جو عرصہ سے میں نے بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔ کئی سالوں سے میں ہر حکومت کو کہتی رہتی تھی کہ قوم کی اس قیمتی امانت کو وہ مجھ سے لے کر بابائے قوم کی دوسرے اشیاء کے ساتھ محفوظ کر لیں۔ لیکن بار بار کہنے کے باوجود کسی نے اس بات کی اہمیت کو نہ سمجھا کہ قائداعظمؒ کی یہ اشیاء ہمارے لئے کتنی قیمتی ہیں اور قوم کا نایاب ورثہ ہیں۔

قائداعظمؒ پیپرز کے انچارج ڈاکٹر زوار زیدی جنہوں نے قائداعظمؒ کے اہم کاغذات کو اکٹھا کر کے پانچ جلدوں میں شائع کروا کر ایک مشکل لیکن نہایت اہم کام سرانجام دیا ہے مجھے کہا کہ میں وہ کپڑے کراچی ساتھ لے آؤں تاکہ انہیں قائداعظمؒ میوزیم میں پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ کراچی میرا جانا اس لحاظ سے ایک تاریخی اور قومی اہمیت کا حامل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنی بڑی ذمہ داری سے سرخرو کیا۔

میرے پاس قائداعظمؒ کا ایک اوورکوٹ اور دو سلک کے سوٹ تھے جو انہوں نے میرے شوہر کے ایچ خورشید کو ان کے ذاتی استعمال کے لئے دیئے تھے۔ خورشید جولائی 1944ء میں کشمیر سے قائداعظمؒ کے پرائیوٹ سیکرٹری کی حیثیت سے آئے تھے۔ قائداعظمؒ کشمیر آرام کی غرض سے گئے تھے۔

مشہور گاندھی جناحؒ ملاقات دہلی میں 1944ء میں ہوئی تھی جو ناکام ہو گئی تھی۔ خورشید سناتے تھے کہ جس روز گاندھی نے قائداعظمؒ کو ملنے آنا تھا قائداعظمؒ نے خورشید سے پوچھا کہ تمھارے پاس کوئی سوٹ ہے؟ خورشید نے کہا سر سوٹ تو کوئی نہیں ہے۔ وہ اپنی زین کی پتلون اور کاٹن کی قمیض پہنے ہوئے تھے۔ قائد نے اپنے گوا کے بیرے کو کہا کہ انہیں سوٹ وارڈ روم سے نکال کر لا دے۔ قائداعظمؒ کے بیرے اکثر گوا کے عیسائی ہوتے تھے جو اپنے کام میں بڑے ہوشیار اور چاق و چوبند تھے۔ چنانچہ خورشید نے وہی سوٹ پہنا اور وہ کئی سالوں تک بڑی احتیاط سے وہی سوٹ بعد میں بھی استعمال کرتے رہے۔

اوورکوٹ 1946ء میں لندن جانے سے پیشتر انہیں قائداعظمؒ نے دیا جہاں وہ کانگرسی لیڈروں کے ہمراہ برصغیر کے سیاسی حل کی اہم گفت وشنید کے لئے گئے ہوئے تھے۔ ریکارڈ کے مطابق قائداعظمؒ 5 دسمبر 1946ء کو لندن گئے اور 21 دسمبر کو واپس آئے۔ خورشید بتاتے تھے کہ وفاتِ قائداعظمؒ کے بعد بار ایٹ لاء کے سلسلے میں انگلینڈ میں چار سالہ قیام کے دوران اُنہوں نے یہی اوورکوٹ استعمال کیا۔

میں جانتی تھی کہ یہ کپڑے قائداعظمؒ کے ذاتی استعمال میں تھے۔ جو اُنہوں نے ازراہ محبت خورشید کو اپنے ذاتی استعمال کے لئے دیئے تھے۔ ان کپڑوں کو دیکھ کر قائداعظمؒ کی کمی محسوس ہوتی تھی اور جب یہ خیال آتا تھا کہ یہ کپڑے اُنہوں نے پہنے تھے تو انہیں چھو کر بڑا اچھا اور جذباتی احساس بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ عرصہ سے میں نے بھی اسے بڑی احتیاط سے رکھا ہوا تھا۔ الگ الگ ململ کے کپڑے میں ایک الگ بکس میں انہیں میں قوم کی ایک امانت کے طور پر سنبھالتی تھی۔ سال میں دو بار دھوپ لگواتی تو فنائل کی گولیاں ڈال کر پھر بکس میں بند کر دیتی۔ گرمی کے موسم میں ایسے کپڑوں کی بڑی احتیاط کرنا پڑتی ہے۔ کیڑا لگنے کا ڈر ہوتا ہے۔ اس لئے بھی زیادہ خیال کرنا پڑتا ہے۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس اہم ذمہ داری سے بھی فارغ ہوئی۔ 26 دسمبر کی صبح کو میں ڈاکٹر زوار زیدی اور پریس کے لوگوں کے ساتھ قائداعظمؒ کے مزار کے میوزیم میں گئی۔ روزنامہ جنگ کے مدیر سلیم قریشی صاحب بھی ساتھ تھے۔ کراچی میں بابائے قوم کی یادگار کے طور پر اس وقت چار میوزیم ہیں۔ ایک کھارادر میں، جہاں قائد پیدا ہوئے، دوسرا فلیگ سٹاف ہاؤس میں، تیسرا مہوٹہ پیلس میں اور چوتھا باغِ قائداعظمؒ میں جہاں وہ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ اندازے کے مطابق سب سے زیادہ لوگ مزار کے میوزیم میں آتے ہیں۔ شاید اس لئے بھی کہ کراچی میں زیادہ آبادی فلیٹس میں رہتی ہے۔ یہاں آنے سے انہیں باغ کی کھلی ہوا نصیب ہوتی ہے اور سرسبز روشوں میں وہ اپنے بچوں کے ساتھ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس بات کا سہرا بھی موجودہ حکومت کے سر ہے کہ اُنہوں نے چند مہینوں کی محنت سے مزار قائد کے وسیع باغ کو اتنا اچھا بنا دیا ہے ورنہ سالوں سے محسن قوم کے مزار کے ارد گرد کی ساری زمین ویران پڑی تھی جہاں گندگی کے ڈھیر تھے اور کوئی پرسان حال نہ تھا۔ سابقہ حکومتوں نے کبھی اس بات کی اہمیت کو نہ سمجھا کہ مزار قائد کو ان کے شایان شان بنایا جائے۔ جس محسن کی شب و روز کی محنت سے مسلمانوں کو ایک الگ خطہ زمین حاصل ہوا جہاں وہ عزت اور وقار سے آزاد شہری کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں، جہاں قدرت نے انہیں بیشمار نعمتوں سے نوازا ہے، جہاں سب کچھ ان کا اپنا ہے اور اغیار ان پر مسلط نہیں، جہاں وہ اپنی تہذیب و تمدن اور روایات کے مطابق پوری شان سے آباد ہیں۔ ایسے خطۂ آزاد کے خالق کی ابدی جگہ کی اہمیت کو بھی نہ جانیں کتنے دکھ کا مقام ہے۔

باغ قائداعظمؒ کے وسیع و عریض خطے کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ جو قطعہ زمین عرصہ سے غیر ہموار زمین کی شکل میں موجود تھا اسے پاکستان کے انجینئروں اور

اعلیٰ افسروں نے نہایت محنت سے صرف نو ماہ میں مکمل کر لیا۔ اس کی تعمیر میں حصہ لینے والے پانچویں کور کے انجینئر اور اس سے منسلک اعلیٰ فوجی افسروں اور تعمیرات کے غیر فوجی ماہرین نے بڑی انتھک کوشش اور محنت سے اس منصوبہ کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ درختوں کی قطاریں بڑی خوبصورتی سے لگائی گئی ہیں۔ جب یہ بڑے ہو جائیں گے تو اس باغ کی خوبصورتی بڑی دوبالا ہو جائے گی۔ پھول ہر قسم کے نہایت آرائش سے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ ابھی سے سبزہ اور پھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ گھاس کے قطعے حد نگاہ تک سرسبز دکھائی دیتے ہیں۔ خوبصورت بیلوں کی بھی بھرمار ہے۔ کراچی میں سبزہ، پھول اور بیلیں بڑی جلدی پروان چڑھتی ہیں۔ ابھی سے وہاں بہار کا احساس ہونے لگا ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ وسیع باغ بہت خوبصورت ہو جائے گا۔ بابائے قوم کی آرام گاہ سے ملحق باغ کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ قائداعظمؒ کا آخری مسکن صاف ستھرا، ہرا بھرا اور خوبصورت ہے۔ اب تو وہاں میوزیم بھی بن گیا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگوں کی دلچسپی بڑھ رہی ہے۔ اپنی محسن کے لئے جب وہ دعائے خیر کیلئے ہاتھ اُٹھاتے ہیں تو ان کی تصویریں، استعمال کی چیزیں اور تحریک پاکستان کی نشانیاں دیکھ کر ان کا دل خوش ہوتا ہے۔ پھر کھلے سبزہ زار میں بیٹھ کر اُن کی تفریح بھی ہو جاتی ہے۔

روزنامہ جنگ کراچی نے 24 ستمبر 2001ء کو اس تقریب کے حوالے سے نہایت اچھے انداز سے ایک خصوصی رپورٹ پیش کی اور اکابرین کے عقیدت سے پُر بیانات چھاپے۔ مثلاً صدر مشرف کا یہ بیان کہ باغ قائداعظمؒ پاکستان کی تاریخ میں بابائے قوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کا عظیم مظہر ہے، گورنر سندھ کا یہ بیان کہ باغ قائداعظمؒ سے آلودگی کے خلاف تصور اُبھرتا ہے۔ لفٹیننٹ جنرل طارق وسیم گور کمانڈر

سندھ کا یہ بیان کہ باغ قائداعظمؒ کا کام خود ایک بہت بڑا اعزاز ہے جس پر ہم تمام لوگ نازاں ہیں۔ ایس ایچ ہاشمی مینیجنگ ڈائریکٹر اورینٹ ایڈورٹائزنگ کا یہ بیان کہ باغ قائداعظمؒ میں آڈیو ویژل ہال کی تعمیر سے مزار کی دلکشی میں اضافہ ہو گا اور مینجنگ ڈائریکٹر اور چیف ایگزیکٹو آف سوئی سدرن گیس کا یہ بیان کہ باغ قائداعظمؒ کے لئے ہم کام نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا؟ نجی اور سرکاری شعبوں کو آگے آنا چاہیے اور دوسری تحریروں کے علاوہ داؤد میڈیکل کالج کی ایک طالبہ ڈاکٹر غزل کا محترمہ فاطمہ جناحؒ کی یادداشتوں کے حوالے سے ان کی کتاب ''میرا بھائی'' سے مسحور کن اقتباسات کا اعادہ کیا۔ حضرت قائداعظمؒ کی ذات سے ہم محترمہ فاطمہ جناحؒ کی ذات کو الگ نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی زندگی، ان کی جدوجہد، ان کی کوشش اور ان کے عظیم کاموں میں وہ برابر کی شریک تھیں۔ قوم کو محترمہ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اگر وہ قائداعظمؒ کے ساتھ نہ ہوتیں تو اُن کا خیال کون رکھتا۔ ایک شفیق بہن، ایک شفیق ماں کی طرح اُنہوں نے بابائے قوم کو ہر طرح سے بھرپور توجہ دی۔ گھرداری اور دوسری ذمہ داریاں نہایت احسن طریقے سے سنبھالیں۔ قائداعظمؒ کی بہن ایک عظیم خاتون تھیں۔ میوزیم کے انچارج مسٹر عارف اور ان کے عملے نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ پریس کے کچھ لوگ بھی موجود تھے۔ میں نے سوٹ اور اوورکوٹ ڈاکٹر زیدی صاحب کو دیئے۔ جنہوں نے قائد کی تصویر کے ساتھ اپنی اور کپڑوں کی تصویر اُترائی۔ میں بھی کھڑی تھی۔ ایک سوٹ اور اوورکوٹ ہنگرز میں لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے بھی ایک طرف سے ان کا سرا پکڑا۔ میوزیم میں تحریک پاکستان، قائداعظمؒ مسلم لیگ کے قائدین محترمہ فاطمہ جناحؒ، رتی جناحؒ، دینا جناحؒ اور دوسرے مشاہیر کی بے شمار تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ ان کے درمیان قائداعظمؒ کے ملبوسات کو لے کر کھڑا ہونا اچھا لگا۔ میوزیم میں قائداعظمؒ کی اور بھی کئی

چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ان کے استعمال کی ذاتی چیزیں، ضروری کاغذات، تحریک پاکستان کی اہم دستاویزات اور بے شمار ایسی چیزیں جن کا تعلق تحریک پاکستان سے تھا۔

حکومت کا یہ قدم بڑا حوصلہ افزا ہے کہ محسنِ قوم کے مزار کے باغ کو خوبصورت اور پُر فضا بنایا جائے۔ یہاں پاکستان میں بسنے والے ان کے بے شمار ہم وطن خراج عقیدت پیش کرنے آتے ہیں۔اس روز بھی یہاں بہت لوگ تھے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ طلبا اور نوجوان لوگوں کی تعداد زیادہ تھی جو بڑی دلچسپی سے قائداعظمؒ کی ایک ایک چیز اور تحریک پاکستان کی تصویروں کو بڑی محبت اور عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔اس نسل ہی کو تو پاکستان کے وجود، ان کے خالق کے عزم، ان کے ساتھیوں کی قربانی اور تقسیم کے روح فرسا واقعات سے روشناس کروانے کی ضرورت ہے۔نوجوان ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں۔قائداعظمؒ تحریک پاکستان کے مصروف ترین دنوں میں بھی نوجوانوں کو ہمیشہ شرف باریابی بخشتے تھے۔ جب بھی نوجوان انہیں ملنے آتے ہزار مصروفیات کے باجود انہیں وقت دیا جاتا اس لئے کہ پاکستان حاصل کرنے کی مشکل مہم میں نوجوانوں کا کردار بڑا نمایاں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ نوجوانوں میں ہمت کے ساتھ ولولہ اور جوش بھی ہوتا ہے۔اگر انہیں صحیح قیادت نصیب ہو تو کارہائے نمایاں سرانجام دے سکتے ہیں۔

جب مجھے محترمہ فاطمہ جناحؒ کے ساتھ رہنے کا شرف حاصل ہوا تو ان کا طریقہ کار بھی یہی تھا۔ وہ بھی نوجوانوں کو ہمیشہ ملتیں' ان کے مسائل سنتیں اور انہیں نصیحت کرتیں اور ملک وقوم سے محبت کا درس دیتیں۔سکولوں اور کالجوں کی تقریبات میں ہمیشہ جایا کرتیں' ان کا حوصلہ بڑھاتیں اور اپنی مختصر مگر جامع تقریر میں انہیں محنت اور کام کرنے کا درس دیتیں۔تحریک پاکستان کے خالق کا بھی یہی منشور تھا کہ قوم کام

اور مسلسل کام کی طرف توجہ دے کیونکہ محنت اور کام سے ہی قوم کی تقدیر بدلتی ہے اور ہم بجا طور پر اس بات پر فخر کر سکتے ہیں کہ مسلسل محنت سے ہم نے قوم اور ملک کی بہبود کے لئے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اتنی خرابیوں کے باوجود ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اگر ہم اپنی صلاحیتوں کو یکجا کر کے محبت وخلوص سے کام کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان ترقی کی سربلندیوں کو نہ چھوئے جس کا خواب قائداعظمؒ اور ان کے ساتھیوں نے دیکھا تھا۔ بے شمار قربانیوں سے یہ ملک ہمیں حاصل ہوا ہے۔تحریک کے دنوں میں لوگوں کی قربانیاں اور پھر تقسیم کے وقت آبادی کے تبادلے کے ساتھ کشت وخون' انسانیت سوز مظالم اور کسمپرسی کے روح افزا واقعات سب ایک آزاد خطہ زمین کو حاصل کرنے کا نتیجہ تھے۔لوگوں نے اپنے آبائی گھر چھوڑے۔ مال ومتاع چھوڑا۔ ہجرت کی، جوان بیٹیوں کے اغوا ہوئے۔ جوانوں کا خون بہا۔ بے سروسامانی کی حالت میں پاکستان کی حدود میں لاکھوں کی تعداد میں منتقل ہوئے۔ سوچا جائے تو یہ قربانی معمولی نہیں۔ پھر اس کے عوض کیوں نہ اس ملک کو ویسا بنایا جائے جس کا تصور قائداعظمؒ اور ان کے مخلص ساتھیوں کے ذہن میں تھا۔ اگر تحریک پاکستان کے بنیادی خدوخال یاد رکھے جائیں تو پاکستان ایک ایسا فلاحی، خوشحال اور امن پسند ملک بن سکتا ہے جس کا تصور قائداعظمؒ کے ذہن میں تھا۔

قائداعظمؒ کا فرمان ہے۔ ''پاکستان قائم رہنے کے لئے بنا ہے اور اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں توڑ سکتی''۔ قائداعظمؒ نے نہ صرف مسلمانوں کو آزادی دلوائی بلکہ ایک خطہ زمین تخلیق کیا جہاں مسلمانوں کی تہذیب وتمدن اور ماضی کی اعلیٰ اقدار کے فروغ کے امکانات تھے۔ اس پاک سرزمین میں بڑی زیادتیاں ہوئیں' ہمارے حکمرانوں کی غفلت اور نالائقی سے آدھا ملک ہاتھوں سے نکل گیا۔ بنیادی باتوں کو بھلا

دیا گیا۔ چوری ڈاکے، راتوں رات امیر بننے کے بیہودہ خواب' اخلاقی بے راہ روی،
بے ایمانی، رشوت، سرکاری عہدوں کا غلط استعمال، اقربا پروری اور غیر انسانی سلوک
اس ملک کے رہنے والوں کا کردار بن گیا ہے۔ لیکن اس اندھیرے کے باوجود مادرِ
ملت کی شکل میں روشنی کی ایک ٹمٹمانی ہوئی کرن نظر آتی رہی۔ اچھے لوگ کم تھے لیکن
موجود تھے اب بھی یہی صورتحال ہے۔ اس لئے ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں،
اب بھی ضرورت ہے کہ ان سب برائیوں کو دور کر کے قائداعظمؒ کے بتائے ہوئے
بنیادی اصولوں کو نصب العین بنا کر پاکستان کو وہ ملک بنایا ہے جس کا خاکہ ہمارے
پاس موجود ہے۔

مزارِ قائد کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے میرے ذہن میں قائداعظمؒ کا سراپا
بسا ہوا تھا۔ ان کی جدوجہد کی پرخار کہانی، ان کے کردار کا یہ پہلو کہ نہ انہیں کوئی خرید سکا
نہ وہ کسی کے سامنے جھکے۔ ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار ہونے کے باوجود جب انہیں
احساس ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی راہیں الگ ہیں تو وہ اپنے موقف سے پیچھے نہ
ہٹے، ہر مخالفت کا مقابلہ کیا۔ آئینی طور پر پاکستان کی جنگ پرامن طریقے سے لڑی۔
اس لئے اس کا عزم اور کردار جاننے کے بعد ان کے ساتھیوں نے بھی اس جدوجہد
میں ان کا ساتھ دیا۔ ہندو اور انگریز کی عیاری ان کے ارادوں اور نیک مقصد میں حائل
نہ ہو سکی حالانکہ دشمنوں نے سارے حربے آزمائے۔ لیکن جناحؒ اٹل تھے اور اٹل ہی
رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بیسویں صدی کے سب سے بڑے انسان
تھے۔ اس کا اعتراف انگریز مصنفین اور محققین نے بھی کیا۔ قائداعظمؒ کے سوانح نگار
سٹینلے والپرٹ نے جس طرح قائداعظمؒ کو خراج عقیدت پیش کیا ہے یہ ہماری تاریخ کا
ایک روشن پہلو ہے۔

مجھے ایسے محسوس ہوا کہ باغ کی سوندھی سوندھی ہوائیں قائداعظمؒ کے مزار کو
سلام پیش کر رہی ہیں اور یہاں کے سبزہ زار قائداعظمؒ کے وجود کو ہدیہ عقیدت پیش کر
رہے ہیں۔ وہاں کا نیلگوں آسمان خود پر فخر کر رہا ہے کہ اس کا پھیلاؤ اتنی بڑی ہستی کی
مرقد پر ہے۔ ہواؤں کے سلام اور پھولوں کی سوندھی خوشبو کے احساس سے مجھ پر بھی
عجیب کیفیت طاری ہو گئی اور میں نے زیرِ لب اُداس ہو کر کہا۔ ''قائداعظمؒ تجھ پر
لاکھوں سلام' تیری قبر ہمیشہ روشن رہے۔ تم سا اونچا انسان اس سرزمین میں پیدا ہوا۔
خدا کا جتنا شکر ہم ادا کریں کم ہے۔''

میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھی لیکن دل چاہتا تھا کہ کچھ دیر
ادھر اور رُک جاؤں لیکن جانا تو تھا اس لئے محبت اور عقیدت کے جذبات سے معمور
میں گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔



III

ڈائری کے اوراق

محمد طارق اقبال
پاکستانی ڈائجسٹ
ڈاٹ کام

5 جنوری 1956ء

پہلی ملاقات

آج صبح ہم لوگ بذریعہ تیز گام کراچی پہنچے۔ مس جناحؒ کا ڈرائیور اسٹیشن پر ہمیں لینے آیا ہوا تھا۔ کراچی پہنچنے سے پہلے خورشید نے مجھے کہا کہ میں لمبی آستین والی قمیض پہنوں اور ہلکے رنگ کا کوئی سوٹ۔ مس جناح کو شوخ کپڑے پسند نہیں ہیں۔ میرے پاس ایک ہلکا پیازی رنگ کا سوٹ ہے جس پر سبز موتی نہایت نفاست سے لگے ہوئے ہیں۔ میں نے وہی سوٹ اور ویسا ہی پل اوور پہنا۔ گھر پہنچے تو ان کا بیرا کھڑا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ کہنے لگا "مادرِ ملتؒ ناشتہ پر آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ آپ آدھ گھنٹہ آرام کر کے ڈائننگ روم میں آجائیں۔" فلیگ سٹاف ہاؤس کو دیکھتے ہی میری آنکھیں عقیدت سے جھک گئیں۔ پتھروں سے بنی ہوئی یہ پرانی وضع کی کوٹھی عظیم معمارِ قوم کی تمام تر یادوں کے ساتھ میرے سامنے تھی۔ سامنے باغ میں سڑک سے میڈونا کا مجسمہ صاف نظر آ رہا تھا جو ویسے میڈونا کا نہیں تھا۔ سرخ و سپید اور رنگ برنگے پھولوں کے حسین امتزاج سے کیاریاں بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔ سٹاف ہاؤس کے وسیع برآمدے سے ملحق دو کمروں کا ایک الگ حصہ ہے جو مس جناح نے ہمارے لیے تیار کروایا ہے۔ سامنے برآمدہ ادھر چھوٹی سی سٹڈی۔ میری آمد سے پہلے بھی خورشید کا قیام یہاں تھا اور آج پھر از راہ محبت و مروت جو انہیں خورشید کے ساتھ ہے انہوں نے اصرار کیا کہ ہم شادی کے بعد بھی ان کے ہاں رہیں۔ مجھے کچھ کچھ خوف محسوس ہو رہا ہے۔ خدا جانے میں ان کے معیار پر پورا اترتی بھی ہوں یا نہیں؟

اور وہ مجھے پسند کرتی ہیں یا نہیں؟ خورشید کہنے لگے" وہ سخت طبیعت ضرور ہیں لیکن اصول کی حد تک ۔ وگرنہ وہ تو محبت' شفقت اور پیار کا عظیم پیکر ہیں ۔"

مس جناحؒ ناشتے پر ہماری منتظر تھیں ۔ میں بے انتہا EXCITED تھی ۔ آگے بڑھ کر انہوں نے خورشید کو گلے لگایا لیکن میرے ساتھ صرف ہاتھ ملایا اور صرف یہ پوچھا کہ ہمارا سفر کیسا رہا۔ مس جناح سردی کے باعث ہماری شادی میں شریک نہ ہو سکی تھیں ۔ میں نے انہیں چاندی کا پھولدان پیش کیا' جو ان کے لیے تحفۃً لائی تھی اور ساتھ لڈو بھی ۔ سارا وقت خورشید سے باتیں کرتی رہیں ۔ میں نگاہیں نیچی کئے چپ چاپ بیٹھی رہی ۔ انہوں نے میرے ساتھ کوئی خاص بات نہیں کی ۔ اب سوچ رہی ہوں کہ یہ ان کے کردار کا کیسا پہلو ہے کہ انہوں نے ایسی سرد مہری برتی ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں انہیں بالکل پسند نہیں آئی ۔ خدا کرے وہ مجھ سے اچھی طرح پیش آئیں اور میں معمارِ قوم کی اس عظیم بہن کے اس قدر قریب ہو جاؤں کہ اس قربت پر فخر کر سکوں ۔

رات کھانے پر بھی وہ ملک کی سیاست پر باتیں کرتی رہیں ۔ آج کھانے پر بہت سے لوگ مدعو تھے ۔ چند ریگر صاحب اور چند اور سیاستدان ۔ مس جناح کافی سوشل تنظیموں میں کام کرتی ہیں اور صبح سارا وقت اپنے سیکرٹری کے ساتھ مصروف رہتی ہیں ۔ آج ان کی باتوں سے مجھے یہ اندازہ ہوا ۔

8 جنوری 1956ء

مٹھاس سے بھرپور دن

ایک روشن دن طلوع ہوا ۔

صبح شب خوابی کا لباس تبدیل کر کے میں باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکیوں میں کھڑی ہو گئی جہاں عشق پیچاں کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں ۔ یہ دریچہ مجھے بہت پسند ہے ۔ پہلی نظر میں ہی مجھے اچھا لگا ۔ سامنے مس جناحؒ ایک بازو میں بیگ اور ایک میں چند کاغذ تھامے ہوئے اپنے سیکرٹری سے محو گفتگو تھیں ۔ میں جھٹ کمرے سے نکل باہر جا کھڑی ہوئی اور انہیں صبح بخیر کہا ۔ وہ مجھ پر سرسری سی نظر ڈال کر بولیں :

"خورشید ہائی کورٹ چلا گیا؟"

"جی" میں نے اثبات میں سر ہلایا ۔ پھر کہنے لگیں :

"آج لنچ سے پہلے تم میرے پاس آ جانا' باتیں کریں گے ۔"

میں فرطِ مسرت سے جھوم اٹھی کہ آج اکیلے میں ان کے ساتھ بیٹھوں گی اور باتیں ہوں گی ۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے ان کے پاس پہنچ گئی ۔ اس وقت وہ کام سے فارغ ہوئی تھیں ۔ میرے پہنچتے ہی اپنے سیکرٹری کی شکایت کرنے لگیں کہ :

"اسے ذمہ داری کا بالکل احساس نہیں ۔ روز کی ڈاک نہیں دکھاتا ۔ کاغذ صحیح جگہ پر نہیں رکھتا اور بے کار کاموں میں کئی کئی دن ضائع کر دیتا ہے ۔"

میں نے ڈرتے ہوئے کہا: "یہ کام آپ میرے سپرد کر دیجئے ۔ صبح کا سارا

وقت فارغ ہی گزرتا ہے اور کوئی کام نہیں ہوتا۔''

انہوں نے ایک بھرپور نظر مجھ پر ڈالی اور مسکراتے ہوئے بولیں:

''تم کرلوگی یہ کام؟ آج کل کی نوجوان نسل ذمہ دار نہیں۔ یہ ان نوجوانوں سے قطعاً مختلف ہے جنہوں نے یہ ملک بنایا۔ وہ دن رات پاکستان کی تحریک کے لئے کام کرتے تھے۔ نہ انہیں وقت کا احساس تھا اور نہ اپنے آرام کا۔ اب جانے وہ دور کہاں گیا۔''

میں نے کہا: ''لیڈر اچھا ہو تو قوم کی تقدیر بدل جاتی ہے۔ قائداعظمؒ نے اس مردہ قوم میں نئی روح پھونکی اور ان میں محنت کا شعور پیدا کیا۔ آج کی نوجوان نسل شاید اس چیز کی کمی محسوس کرتی ہے۔''

''تم تاریخ کی طالبہ ہو اس لیے صحیح کہتی ہو۔ لیکن یہ تم کیوں بھول گئیں کہ جیسی قوم ہوتی ہے ویسا ہی لیڈر ہوتا ہے۔ چند لوگوں کی قربانیوں سے یہ ملک مل گیا اور ان لوگوں کو ملا جن کا تحریک پاکستان اور ان قربانیوں میں کوئی حصہ نہیں اور اب تو دولت کی ہوس اس قدر بڑھ گئی کہ ہر شخص راتوں رات امیر ہو جانا چاہتا ہے۔ مسلمان برصغیر میں ایک غریب اور پسماندہ قوم تھی۔ سارا پیسہ تو ہندوؤں کے پاس تھا۔ سوائے چند سرمایہ داروں کے' جو انگریزوں کی منت خوشامد کرکے دولت مند بن گئے۔ باقی مسلمان قوم غریب تھی۔ اب یہ سب کچھ' جو اس وقت پاکستان میں نظر آرہا ہے' ان کا ہے لیکن اس کے باوجود دن رات اسی فکر میں ہیں کہ کسی طرح اور دولت ہاتھ لگے۔''

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

دولت کی ہوس اور اقتدار کی ہوس تو قوموں کے زوال کا باعث ہوتی ہے۔ انسان خودغرض ہو جاتا ہے اور قوم اور ملک کے مفاد کی اسے قطعاً پروا نہیں ہوتی۔ اپنے لیے جیتا ہے اور اپنے لیے سب کچھ کرتا ہے' یہ کتنی بڑی زیادتی ہے۔'' میں نے کہا۔

بولیں: ''بے وقوف یہ نہیں سوچتے کہ اگر ملک نہ رہا تو ان کی دولت کہاں جائے گی۔ دولت ملک کے ساتھ ہی تو آتی ہے۔ ملک ہی مستحکم نہ رہا اور اتحاد پارہ پارہ ہو گیا تو ہماری اس دولت کا کیا فائدہ؟''

پھر موضوع بدل کر کہنے لگیں:

''تم جب آئیں تو میرا رویہ تم سے سرد تھا۔ یہ اس لئے تھا کہ میں نووارد لوگوں کے ساتھ یکدم بے تکلف نہیں ہوتی' لیکن تمہاری ایک چیز مجھے پہلی ملاقات میں بہت اچھی لگی' وہ یہ تھی کہ
THANK GOD SHE HAS NO NAILS,
مجھے مصنوعی لمبے ناخنوں سے سخت نفرت ہے۔ قائداعظمؒ بھی ان سے نفرت کرتے تھے۔ یوں لگتا ہے گویا مغرب کا کلچر ہم پر بری طرح مسلط ہو رہا ہے۔ اب چند دنوں میں میں نے تمہیں دیکھا ہے۔ تم مجھے اچھی لگیں' اسی لیے میں نے تمہیں لنچ سے پہلے باتیں کرنے کے لیے بلایا۔''

میں نے خوشی سے سرخ ہوتے ہوئے کہا:

''یہ تو میری عین خوش قسمتی ہے اور سچ پوچھئے تو میرے لیے اس سے بڑا اعزاز کوئی نہیں کہ مجھے آپ کا قرب حاصل ہے اور ہم ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں۔''

بیرے نے لنچ کا آ کر کہا اور ہم اٹھے۔ میں حسبِ معمول ان کے پیچھے تھی۔

وہ اچانک میری طرف مڑیں اور بولیں:

''ایک تمہاری یہ عادت بھی مجھے پہلے روز ہی اچھی لگی تھی کہ تم میں بڑے اور بزرگوں کا لحاظ ہے۔''

آج لنچ پر میں نے ایک نئی چیز بھی کھائی' گوار کی پھلیاں۔ مجھے کہنے لگیں:

''یہ سبزی قائداعظم کو بہت پسند تھی۔''

کھانے کے روز کے کورسز عام طور پر یہ ہوتے ہیں۔

کسی قسم کا سوپ' خشک گوشت کسی قسم کا اور ساتھ موسم کی کوئی سبزی' پھر دال' ایک سبزی گوشت میں چاول اور چپاتی۔ بعد میں سویٹ ڈش اور پھل۔ میں سویٹ ڈش سے گھبراتی ہوں۔ آج کہنے لگیں:

''تم کو اچھی نہیں لگیں''

میں نے کہا: ''محترمہ! میں روز سویٹ ڈش کھانے کی عادی نہیں۔ کشمیری کھانے میں میٹھا شامل نہیں ہوتا' اس لیے مجھے بھی عادت نہیں۔''

اس پر وہ ہنس پڑیں اور بولیں: ''اسی لیے کشمیری مٹھاس سے خالی ہیں۔''

میں نے فوراً جواب دیا: ''انہیں قدرت نے اتنی مٹھاس بخشی ہے کہ انہیں مصنوعی مٹھاس کی غالباً ضرورت نہیں۔ اتنا حسین ملک اور قدرتی مناظر کیا دنیا کی کسی مٹھاس سے کم ہیں۔''

انہیں میرا جواب پسند آیا' بولیں: ''تم روز لنچ سے پہلے آ جایا کرو۔ آج باتیں کرنے کا بہت لطف آیا۔''

شام کو خورشید آئے تو انہوں نے پوچھا: ''آج دن کیسا گزرا؟''

میں نے فوراً جواب دیا: ''مٹھاس سے بھرپور'' اور پھر مجھے وہ تمام باتیں یاد آ گئیں جو آج مس جناح کے ساتھ ہوئیں تھیں۔

آج میں بہت خوش ہوں۔ یوں لگتا ہے میں ان کے قریب آ گئی ہوں۔

آج ابا کو بھی میں نے مفصل خط لکھا۔ انہیں میرا خط پڑھ کر ضرور احساس ہوگا کہ اب میں کراچی میں اداس نہیں۔ مجھے کوئی خلا سا محسوس ہو رہا تھا' گویا میرا کچھ کھو گیا ہو اور مجھے اس کی تلاش ہو۔ نئے ماحول اور نئی زندگی میں میرا بالکل دل نہیں لگ رہا تھا لیکن اب ایسا نہیں ہے۔

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

10 جنوری 1956ء

پُرسکون گھر

خورشید حسبِ معمول دفتر گئے اور میں ضروری کاموں سے فارغ ہو کر مس جناحؒ کے پاس گئی۔ میں سوچ رہی تھی' ابھی مجھے یہاں آئے چند ہی روز ہوئے ہیں' لیکن یوں لگتا ہے گویا مدتیں گزر گئی ہوں۔ میرے معمولات میں اب کتنا فرق آ گیا ہے۔ مس جناحؒ مجھے اپنی کھڑکی سے باغ میں مالی کے پاس کھڑی نظر آ رہی تھی۔ سفید ریشم کے ہلکے سے سوٹ میں ان کا نحیف جسم اور چاندی ایسے بال دھوپ میں چمک رہے تھے۔ میں پاس گئی۔ مالی کو پھولوں کے متعلق کچھ سمجھا رہی تھیں اور ناراض تھیں کہ گلابوں کی کونپلیں کئی دنوں سے وہیں ہیں اور کہنے کے باوجود دوسری جگہ نہیں لگائی گئیں۔ پھر ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگیں:

''دراصل ہمارے لوگ بہت سست واقع ہوئے ہیں' ذرا بھر بھی اپنے کام اور ذمہ داری کا احساس نہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آج ہمارا ملک بہت ترقی کر چکا ہوتا۔ اب اس مالی ہی کو دیکھو' جب تک ہر روز اس کے سر پر سوار ہو کر اسے کام کے لیے نہ کہا جائے' وہ یہ کبھی نہیں کرے گا' حالانکہ یہ خوب جانتا ہے کہ اسے ڈانٹ بھی پڑے گی لیکن اس کے باوجود اسے احساس نہیں۔ دوسرا آدمی رکھوں تو کام میں اور کوتاہی کرتا ہے۔''

میں نے کہا: ''شاید دوسرے آدمی کی موجودگی برداشت نہیں کر سکا' حسد کا جذبہ پیدا ہونا ایک فطری امر ہے۔''

کہنے لگیں: ''ہاں' حسد ہی ایسا جذبہ ہے جو مسلمان قوم کی تباہی کا باعث ہے۔ سیاست اور زندگی کے ہر شعبے میں ایک دوسرے کا حسد ان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔ خدا جانے یہ قوم کب سنبھلے گی۔ بڑی بے وقوف قوم ہے اور پھر بھی احساس نہیں۔''

لنچ کے دوران عورتوں کی اقتصادی آزادی پر باتیں کرتی رہیں اور کہنے لگیں:

''عورتوں کی گرتی ہوئی معاشی اور معاشرتی حالات کے پیش نظر یہ بہت ضروری ہے کہ وہ اقتصادی لحاظ سے خوش حال ہوں۔ مردوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی عورتوں کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھیں اور انہیں مالی لحاظ سے تنگی محسوس نہ ہونے دیں۔''

میں نے کہا: ''شاید اسی وجہ سے آج کل عورتوں کی کثیر تعداد شادی نہیں کرتی اور اقتصادی طور پر آزاد رہنا چاہتی ہے۔''

کہنے لگیں:

''نہیں' ایسی بات نہیں ہے۔ اس سے سماج اور سوسائٹی کا نظام اور بھی خراب ہوتا ہے۔ سب سے بہتر بات یہ ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھیں' باہم مشورے سے گزارے کی صورتحال بہتر بنانے کی کوشش کریں اور ایک دوسرے کی خواہشات اور احساسات کا خیال رکھیں' لیکن اس سلسلے میں زیادہ فرائض عورت پر عائد ہوتے ہیں' وہ مرد کی طبیعت بدل سکتی ہے۔ دن بھر کی پریشانی کے بعد جب مرد تھکا

ہارا گھر پہنچے تو اسے گھر میں پورا پورا سکون اور راحت نصیب ہونی چاہیے جو ایک اچھی عورت اور ایک اچھے گھر کی سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ موقع محل دیکھ کر بات کرے۔ اگر کسی وقت کوئی ناراضی بھی ہو تو اس وقت درگزر کر دے اور مناسب وقت پر اظہار شکایت کرے۔ عورت اگر چاہے تو پورے معاشرے کا نظام بدل سکتی ہے۔ مرد فطرتاً آزادانہ طبیعت کا مالک ہوتا ہے اور اپنے ذاتی معاملات میں کسی دوسرے کی مداخلت پسند نہیں کرتا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ عورت دخل درمعقولات سے پرہیز کرے اور مرد کو زیادہ سے زیادہ آرام وسکون پہنچانے کی کوشش کرے''۔

میں نے کہا: ''لیکن یہ سب کچھ کرنے کے باوجود مرد کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس پر عورت کے کس قدر حقوق واجب ہیں۔ اکثر اوقات وہ عورت پر زیادتی سے باز نہیں رہتا۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''۔

جواب میں ہنس کر کہنے لگیں:

''تم نہیں جانتیں، تجربہ نہیں ہے ناتمھیں۔ اندازہ نہیں کر سکتیں۔ یہ کبھی نہ بھولو کہ مرد سطحی باتوں کو پسند نہیں کرتا۔ بحث کر کے تم اسے قائل نہیں کر سکتیں۔ اس لیے تم اس سہانے وقت کا انتظار کرو جب وہ خود تمھارے کہنے کے بغیر تمھارے عمل سے قائل ہو جائے۔ عورت کو ہمیشہ مرد سے زیادہ قربانی دینا پڑتی ہے اور اس قربانی میں اس کی بڑائی ہے''۔

12 جنوری 1956ء

کھانے کا زیاں

آج دو روز کی مسلسل بارش کے بعد روشن دن طلوع ہوا۔ دن بھر سرد ہوا کے جھونکے چلتے رہے۔ صبح میں نے مس جناحؒ کے ساتھ بنگال ریلیف فنڈ کے سلسلے میں کچھ کام کیا۔ دو روز پہلے ان کا باورچی چلا گیا تھا اور میں کچن میں جا کر دوسرے نوکروں کے ساتھ کھانا پکاتی تھی۔ آج میں نے گڑ کے چاول پکائے تھے جو مس جناحؒ نے ارہر کی دال کے ساتھ کھائے اور بہت پسند کیے' کہنے لگیں:

YOU DESERVE A GOLD MEDAL FOR IT.

عورت کتنا پڑھ لکھ جائے لیکن اس کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ اسے کھانا پکانا آتا ہو۔ اس سے گھر میں ایک سکون اور خوشی کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے''۔

پھر مجھے اپنے متعلق سنانے لگیں کہ ''انہیں کھانا پکانا نہیں آتا تھا۔ ایک مرتبہ انگلستان میں قائداعظمؒ نے ان سے کہا کہ سادے چاول کے ساتھ وہ خود کوئی سالن پکا لیں۔ چنانچہ سالن پکا لیکن وہ خود جانتی تھیں کہ وہ بالکل اچھا نہ تھا مگر اس کے باجود قائداعظمؒ نے بہت تعریف کی اور خوش ہوئے۔ چنانچہ اس وقت سے مجھے یہ شدید احساس ہوا کہ عورت کو کھانا پکانا ضرور آنا چاہئیے''۔

پھر مجھ سے پوچھتی رہیں کہ تمھیں کون کون سے کام آتے ہیں اور کس کام سے زیادہ دلچسپی ہے۔ میں نے جب بتایا تو بہت خوش ہوئیں۔ کھانے کے بعد اکثر مجھے کہتی تھیں کہ تم اتنا کم کیوں کھاتی ہو لیکن جب میں ہر دفعہ یہ کہتی کہ میں تکلفاً ایسا نہیں

کرتی بلکہ میری غذا ہی کم ہے تو کہنے لگیں:

"کم کھانا ویسے بھی اچھا ہوتا ہے میری زندگی میں یہ ایسے بھی اصول رہا ہے کہ

EAT TO LIVE AND NOT LIVE TO EAT

لیکن ہمارے لوگ واقعی بہت زیادہ کھاتے ہیں۔ پارٹیوں اور ڈنرز میں یوں کھانے پر ٹوٹتے ہیں' گویا پہلی مرتبہ کوئی چیز کھانے کے لئے ملی ہو"۔

پھر بولیں: "تم اسے معمولی بات نہ سمجھو۔ جو قوم کھانے میں جس قدر طمع کرتی ہے اتنا ہی اس کے قومی کردار کا پتہ چلتا ہے۔ ہماری قوم بھوکی ہے۔ WE ARE BEGGERS ہم میں بلندی نہیں اور ہم ہر وقت دوسروں کی مدد کے سہارے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ کتنی غلط بات ہے یہ"۔

اس روز شام کو مجھے قائداعظمؒ کے مزار پر لے گئیں۔ راستہ بھر اداس رہیں، کہنے لگیں:

"زندگی میں سب سے زیادہ اندوہناک چیز موت ہے۔ اگر چہ یہ بہت بھیانک حقیقت ہے لیکن حقیقت کو بہر حال جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ جانے کیا کیا یاد آتا ہے۔ بچھڑے ہوئے عزیز اور احباب"۔ پھر بات کا موضوع بدل کر کہنے لگیں:

LAWYERS ARE VERY BAD AS HUSBAND

وہ بے حد مصروف رہتے ہیں اور انہیں اپنے گھر میں بہت کم وقت گزارنے کا موقع ملتا ہے۔ لہذا ان کی سخت یا ترش باتیں محسوس نہیں کرنی چاہئیں بلکہ حتی المقدور کام میں ان کا ہاتھ بٹانا چاہئے۔ واپسی پر ہم نے اون خریدی۔ میں نے ان سے خود کہا کہ میں انہیں سویٹر بنا کر دوں گی۔ پھر کچھ چیزیں اور خریدیں اور شام کو جب ہم واپس آئے تو کہنے لگیں:

"اگر کسی وقت بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف مانگ لیا کرو اسے بالکل اپنا ہی گھر سمجھو"۔

میں نے آج قائداعظمؒ کی لائبریری سے چند کتابیں بھی پڑھنے کے لئے لی تھیں اور مجھے بار ہا اس بات کا خیال آیا کہ صرف چند روز میں ان سے میں کتنی مانوس ہو گئی ہوں۔ حالانکہ پہلے روز جب میں آئی تھی تو کتنی گھبراہٹ تھی۔ ان کی شخصیت واقعی پرکشش اور سحر انگیز ہے۔

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

14 جنوری 1956ء

ماڈرن طبقہ

میں ان چند دنوں میں محترمہ کے بہت قریب آ گئی ہوں۔ روز ہی مختلف باتیں زیرِ بحث آ جاتی ہیں۔ آج خاندانوں کی مل جل کر رہائش پر باتیں ہونے لگیں۔ میں نے محترمہ سے پوچھا کہ ان کا اس بارے میں کیا خیال ہے کیونکہ ماڈرن لوگ تو کسی کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتے، چاہے انہیں وہاں کتنا ہی آرام میسر کیوں نہ ہو۔ کہنے لگیں:

''ماڈرن طبقہ اندھا دھند مغرب کی تقلید کرتا جا رہا ہے۔ مثال پیش کرنا تو بہت آسان ہے لیکن ان حالات کا مشاہدہ کرنا بہت مشکل ہے' جو یہاں اور وہاں کی تہذیب میں امتیاز پیدا کرتے ہیں۔ مغرب کی اس بڑھتی ہوئی اقتصادی اور ذہنی آزادی سے وہ لوگ خود بھی تنگ آ چکے ہیں۔ اسی روز یہاں کے ایک اخبار میں تھا کہ انگلستان میں لوگ OLD MANS HOUSE سے سخت ناخوش ہیں اور یہاں رہنا پسند نہیں کرتے۔ اس عمر میں انہیں اپنے بچوں اور گھر والوں کی محبت کی شاید زیادہ ضرورت ہوتی ہے جو ان جگہوں میں انہیں نصیب نہیں ہوتی۔ پھر ہم لوگ ایک اور دنیا میں رہتے ہیں۔ کتنی بھی ترقی کیوں نہ کر لیں' ہماری باتیں اب بھی وہی ہیں جو آج سے کئی سال پہلے تھیں۔ ان باتوں میں والدین کا رتبہ بہت اہم ہے اور اسے ہم کسی صورت میں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ لیکن عورتیں عام طور پر یہ پسند نہیں کرتیں کہ بوڑھے والدین ان کے پاس رہیں۔ وہ یہ بھی برداشت نہیں کر سکتیں کہ ان کے لئے کچھ کہا جائے''۔

میں نے کہا: ''تو یہ ہے' عورت جہاں وفا کی دیوی ہے' رحم اور محبت کا سرچشمہ ہے وہاں وہ خاندانوں کے آباد، ہرے بھرے خوبصورت گھروں کو ویران اور خشک بھی کر سکتی ہے۔ ہر عورت کو خاوند کے والدین کے ساتھ بدسلوکی کرتے وقت اپنے والدین کا سوچنا چاہئیے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ کوئی عورت بہو کی حیثیت سے ان کے ساتھ بھی بدسلوکی کر سکتی ہے۔ خدا جانے عورتیں ایسا کیوں نہیں سوچتیں۔ اگر ہر عورت اس نہج پر سوچنا شروع کر دے تو کوئی عورت بہو' ساس اور بھابھی کی حیثیت سے گھروں کا امن و سکون برباد نہ کرے بس وسعت قلبی اور وسعت نظر کی ضرورت ہے''۔

محمد طارق اقبال پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

16 جنوری 1956ء

عورت کمزور نہیں

آج باتوں باتوں میں میں نے کہہ دیا کہ محترمہ' عورت بہت کمزور ہے۔ دنیا میں اپنے طور پر کچھ نہیں کر سکتی۔ کہنے لگیں:

''یہ خیال تم کو کیسے ہوا' تاریخ پڑھو تو تمھیں اندازہ ہوگا کہ عورتیں مردوں کے کارہائے نمایاں میں ہمیشہ ان کی معاون رہی ہیں۔ عورت کیا کچھ نہیں کر سکتی۔ اس میں عقل وشعور ہو تو وہ ستون تک ہلا سکتی ہے۔ ہلچل اور طوفان برپا کر سکتی ہے۔ عورت کمزور نہیں۔ یہ درست ہے کہ بعض باتوں میں فطرت' معاشرے اور حالات نے اسے کمزور بنا دیا ہے لیکن وہ چاہے اور پختہ ارادے کی مالک ہو تو مردوں سے زیادہ مضبوط ہو سکتی ہے''۔

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے' بنیادی طور پر تو آ کر کمزور ہی ہے'' میں نے ان کی بات کے جواب میں کہا۔ کہنے لگیں:

''اسے مرد سے زیادہ قربانی دینی پڑتی ہے۔ کردار کی بلندی' صلاحیت اور ان وسعتوں میں جانا پڑتا ہے جہاں مرد کی پہنچ کبھی نہیں ہو سکتی۔ میں تو ہمیشہ یہی کہتی ہوں کہ ہمیں اچھی ماؤں کی ضرورت ہے۔ اچھی مائیں ہمارا بہت بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ سکول کالج اور دوسرے اداروں میں جب کبھی مجھے تقریر کرنے کا موقع ملتا ہے تو میں اس چیز پر بہت زور دیتی ہوں۔ افسوس' اچھی مائیں بہت کم ہیں''۔

''اور عورتیں اس بات کو سمجھتی ہی نہیں۔ ماڈرن عورت تو ان چیزوں کو بالکل دقیانوسی جانتی ہے اور ان پڑھ عورتیں بعض اوقات زمانے کے تقاضے پر پورا نہیں اُترتیں''۔ میں نے مایوس ہو کر کہا۔

کہنے لگیں ''یہ درست ہے لیکن آخر اچھی مائیں کہاں سے آئیں گی؟ تم لوگوں میں سے ہی تو ہوں گی۔ ہر فرد کو سوسائٹی میں اپنا ایک منفرد رول ادا کرنا ہوتا ہے۔ اگر تم لوگ خود اچھے ہو جاؤ اور یہ کوشش کرو کہ اپنے دوستوں اور احباب کو اپنا ہم خیال بناؤ تو کیسے معاشرہ نہیں بدلے گا۔ عورت اپنی ذات میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ عورت ایک طاقت ہے جو ملک کی تقدیر بدل سکتی ہے''۔

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہی تھیں کہ انہیں ایک کام یاد آ گیا۔ کہنے لگیں ''ہسپتال میں فون کرو اور اس بچے کا حال معلوم کرو جسے میں نے کل داخل کروایا تھا۔ خانساماں کا بیٹا بیمار ہے اسے میں خود کل ہسپتال لے کر گئی تھی''۔ پھر کہنے لگیں ''آج شام اسے دیکھنے چلیں گے۔ کل اگر مجھے معلوم نہ ہوتا تو کمرے میں پڑا پڑا مر جاتا۔ تم نے بہت اچھا کیا جو مجھے کل بتا دیا کہ وہ بیمار ہے''۔

میں فرصت کے اوقات میں نوکروں کے کوارٹروں میں اکثر چلی جاتی ہوں اور سب کے بچوں وغیرہ کا حال معلوم کرتی ہوں۔ کل معلوم ہوا کہ خانساماں کا بیٹا چار روز سے شدید بیمار ہے' چنانچہ میں نے محترمہ کو بتایا اور وہ خود اسے ہسپتال لے کر گئیں۔

22 جنوری 1956ء

امریکہ پر بے جا انحصار

چند دنوں سے مسز اسلم خٹک‘ مس جناحؒ کی مہمان ہیں۔ ان کے شوہر یہاں میٹروپول میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کھانے کے اوقات میں وہ یہاں آ جاتے ہیں۔

آج کھانے کے بعد ملک کی سیاسیات پر باتیں ہو رہی ہیں۔ مس جناحؒ حسب معمول موجودہ صورتحال سے مایوس ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پاکستان نے امریکہ سے تھوڑی سی مدد لے کر خود کو اس کے ہاتھ بیچ دیا۔ ہمارے تعلقات ہندوستان اور افغانستان سے خراب ہیں اور پھر سوویت روس کا طاقتور ملک ہمارا ہمسایہ ہے۔ ایسی صورت میں ملک کے لئے ایسے اقدام بے حد خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہم نے خواہ مخواہ مفت میں ایسی دوستی کی خاطر دشمنی مول لی ہے‘ حالانکہ یہ امداد آسانی سے ٹالی جا سکتی تھی۔ حال ہی میں جب روس کے وزیر خارجہ ہندوستان اور افغانستان کے دورے پر آئے تو ہمارا فرض تھا کہ ہم انہیں اپنے ملک میں بھی آنے کی دعوت دیتے‘ لیکن افسوس ایسا نہ کیا گیا۔ آج پاکستان صنعت وحرفت اور امور خارجہ پر امریکی حکومت کا اثر اتنا زیادہ ہے کہ آئندہ جب کبھی جنگ عظیم ہوئی تو پاکستان یقیناً اس کا محتاج ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ جنگ مشرقِ وسطیٰ اور یہاں ہوگی اور ہمارا حشر کوریا‘ بلکہ اس سے بھی زیادہ برا ہوگا“۔

پھر محترمہ نے ایک دلچسپ قصہ سنایا کہ کس طرح امریکہ ان پلاٹوں کے سامنے پاکستانیوں کو اپنی گاڑیاں بھی کھڑی نہیں کرنے دیتے جو حکومتِ پاکستان نے

انہیں دے رکھے ہیں۔ ہم کہنے کو ایک آزاد قوم ہیں لیکن ہم میں وہ تمام باتیں بالکل مفقود ہیں جو ایک آزاد قوم میں ہوا کرتی ہیں۔ مسلمان بالکل بھکاری بن گئے ہیں اور انہیں دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہوئے بالکل شرم محسوس نہیں ہوتی۔ ان کے اندر جھوٹی غیرت اور جھوٹا غرور بہت ہے‘ لیکن ایک آزاد انسان میں صحیح غیرت اور صحیح غرور جو ہونا چاہیے وہ ان میں عنقا ہے۔ اگر یہ ہوتا تو آج ساری دنیا میں مسلمان اس قدر ذلیل ورسوا نہ ہوتے۔

پھر دوسرے اسلامی ممالک کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگیں:

”اگرچہ ہم پاکستان کے حالات سے مایوس ہیں لیکن جب ہم دوسرے اسلامی ملکوں میں جائیں اور وہاں کے حالات دیکھیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہم ان سے بدرجہا بہتر ہیں۔ بہرحال اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر ہم کس قدر گر گئے ہیں۔ ترکی‘ عراق‘ عرب‘ ایران اور مصر سب دن بدن اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے تنزل کی طرف جا رہے ہیں“۔

پھر BAGHDAD PACT کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگیں کہ:

”پاکستان نے اس پیکٹ میں شرکت کر کے فاش غلطی کی ہے اور روس اور امریکہ کے کشیدہ تعلقات کی وجہ سے اس کا اثر ہماری آئندہ تاریخ پر بہت برا پڑے گا“۔

میں نے پوچھا ”آخر ہمارے قومی سربراہ ان سب باتوں کو جانتے ہوئے بھی چوکنے کیوں نہیں ہوتے“ تو ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگیں:

”اپنی کرسیوں کے لئے‘ اپنی منسٹری کے لئے‘ محض اپنی ذاتی اغراض کے لئے‘ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جب تک وہ اس پوزیشن میں ہیں‘ انہیں حالات کے

مطابق چلنا چاہیے ورنہ انہیں اپنی منسٹری سے ہاتھ دھونے پڑئیں گے۔ایسے حالات ہمیشہ نہیں رہتے۔اس ملک میں ضرور انقلاب آئے گا اور بہت جلد آئے گا''۔

''لیکن انقلاب کون برپا کرے گا؟ جب کہ ہم سب ایک ہی قسم کے دور سے گزر رہے ہیں اور ایک ہی قسم کی ذہنیت کے مالک ہیں''۔محفل میں سے کسی نے پوچھا۔

کہنے لگیں''صرف چندلوگ_____ وہ لوگ' جوسب کچھ دیکھتے ہیں اور پھر بھی خاموش رہتے ہیں۔تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی کسی ملک میں انقلاب آیا تو یہ صرف چندلوگوں کی بدولت ہوا''۔

پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگیں''تم تو تاریخ کی طالبہ ہو' تم خوب اچھی طرح بتا سکتی ہو کہ جب ملکوں کی تقدیریں بدلتی ہیں تو ایک آدمی کھڑا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ چندلوگ--------اور انقلاب ایسے ہی آیا کرتا ہے''۔

آج رات ڈرائنگ روم میں ہم کافی دیر تک بیٹھے رہے اور جب ہم اُٹھ کر اپنے کمرے میں آئے تو محترمہ ہمیں دروازے تک چھوڑنے آئیں اور جب اُنہوں نے ہمیں مسکراتے ہوئے''شب بخیر'' کہا تو ہمیں یہ بالکل بھول گیا کہ وہ ابھی اتنی سنجیدہ باتیں کر رہی تھیں۔

ان کے چہرے پر اب پھر حسب معمول ایک پُرکشش مسکراہٹ تھی۔

24 جنوری 1956ء

کامیابی کا سنہرا اُصول

خورشید کو کل سے نزلہ اور زکام تھا لیکن آج پھر وہ آفس چلے گئے۔مس جناحؒ صبح کے ناشتے کے بعد ہمارے کمرے میں آئیں۔آتے ہی مجھ سے کہنے لگیں:

''خورشید آفس چلا گیا؟''۔

میں نے کہا''میرے بہت کہنے کے باوجود وہ چلے گئے۔کہتے تھے کوئی ضروری کام ہے۔شاید میں نے بہت زیادہ کہا تھا اس لئے اُنہوں نے جانا اور بھی ضروری سمجھا''۔

میرا جواب سن کر مسکرانے لگیں اور کہا:

''تم مردوں کی فطرت سے ناواقف ہو' انہیں سمجھنے میں عمر لگتی ہے۔دراصل ہر ماں کو چاہیئے کہ وہ اپنی بیٹی کو یہ ٹریننگ دے کہ شوہر کے ساتھ اسے کس طرح رہنا چاہیے۔مرد چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہو جاتا ہے۔عورت کی معمولی سی توجہ اور تھوڑا سا خیال بھی اسے اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ اسے اس کے ساتھ دلچسپی ہے۔مرد کے ساتھ بحث کرو یا اسے کسی بات پر مجبور کرو تو اس کا انجام اچھے کی بجائے برا ہوتا ہے۔عورت کے اس قسم کے رویے سے وہ ہر کام اس کے الٹ کرنا چاہتا ہے۔مرد فطرتاً خودسر واقع ہوا ہے۔اس لئے وہ آغاز میں جائز مداخلت بھی پسند نہیں کرتا' لیکن یہ کیفیت صرف وقتی ہوتی ہے۔عورت اپنی حلیم طبیعت اور حسنِ سلوک سے آہستہ آہستہ اس پر اتنا اثر ڈالتی ہے کہ اسے خود اپنے کئے پر افسوس ہونے لگتا ہے۔لیکن اگر یہی بات

محمد طارق اقبال
پاکستانی ویوائنٹ
ڈاٹ کام

تم خود اسے سکھانے کی کوشش کرو تو وہ سیکھنے کے بجائے بگڑ جائے گا۔ اس لئے یاد رکھو کہ ازدواجی زندگی کی صحیح مسرت حاصل کرنے کے لئے تمھیں اپنی ساری توجہ اپنے شوہر پر مرکوز کردینا ہوگی۔ ان باتوں سے پرہیز کرو جو اسے ناپسند ہیں اور اسے ناراض ہونے کا موقع نہ دو۔ جب تم خود کسی اچھی چیز کی توقع رکھتی ہو تو اس کے لئے پہلے خود قربانی دو۔ اگر تم اپنی زندگی میں اس سنہرے اصول کو سامنے رکھو گی تو کامیاب رہو گی''۔

میں ان کے چہرے کی طرف بغور دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کتنی عمدہ باتیں کرتی ہیں۔ سیاست پر بحث کرتی ہے تو اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہوسکتا کہ یہ روزمرہ کی زندگی پر بھی اتنی تفصیل سے روشنی ڈال سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی باتیں نہایت پراثر ہوتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے ہم سننا چاہتے ہیں اور ہم میں انکار یا اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

کمرے سے نکلتے ہوئے کہنے لگیں ''ہم شاپنگ کرنے جارہے ہیں ہمارے ساتھ چلوگی؟''

میں نے معذرت کا اظہار کیا۔ کیونکہ میں ابھی تک تیار نہیں ہوئی تھی۔ وہ چلی گئیں تو میں دیر تک برآمدے میں کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔ وہ لان کی درمیانی سڑک سے گزرتی ہوئی موٹر میں جا کر بیٹھ گئیں۔ لان کتنے ہرے بھرے اور دلکش لگ رہے تھے۔ ملے جلے رنگوں کے گلاب کے پھول نہایت شگفتہ ہیں۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے سوچا کہ میں ابھی ایک خوبصورت سا گلدستہ بنا کر اپنے کمرے میں رکھوں گی۔ مجھے پھولوں سے عشق ہے۔

2 فروری 1956

پرتکلف عشائیہ

آج مس جناح کے ہاں ڈنر میں تقریباً دو سو کے قریب لوگ مدعو تھے۔ تین روز سے گھر میں اس بڑے ڈنر کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ کئی چیزیں باہر سے آرڈر پر بنیں۔ برتن پہلے سے نکال کر ایک طرف رکھ دیئے گئے۔ باہر سے فالتو سامان اور فرشی وغیرہ آئے اور ان سب کا وسیع لان میں بندوبست ہوا۔ بڑے قرینے سے کرسیاں لگی تھیں اور لان ہی میں کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اپنے نوکروں کے علاوہ میٹروپول ہوٹل کے بیرے کھانا SERVE کر رہے تھے۔ ہر قسم کے لوگ تھے۔ سیاستدانوں اور دوست احباب کی ایک کثیر تعداد ----- اس پارٹی میں نے کئی ایسے لوگ بھی دیکھے جنہیں دیکھنے کا اکثر شوق ہوتا ہے۔ ممتاز دولتانہ، بیگم دولتانہ، قاضی عیسیٰ، ان کی بیگم، لیڈی ہدایت اللہ، ہارون خاندان کے چند افراد -------- اور بے شمار لوگ۔

میں نے بھاری بنارسی ساڑھی پہنی۔ صبح مجھے مس جناح نے پوچھا تھا کہ میں کون سے کپڑے پہنوں گی۔ میں نے بتایا تو وہ خوش ہو کر بولیں:

''تمھیں ضرور بھاری کپڑے پہننے چاہئیں، کیونکہ تم دلہن ہو اور سب جانتے ہیں کہ میں نے اسی لئے یہ کھانے کا اہتمام کیا ہے''۔

یہ کتنا بڑا اعزاز ہے ہمارے لئے!

کھانا بہت دلچسپ رہا۔ گھنٹوں باتیں ہوتی رہیں۔ مس جناح حسب معمول سفید ریشم کے نہایت خوبصورت سوٹ میں ملبوس تھیں۔ ان کے گلے میں سفید موتیوں کی چمکدار مالا تھی اور ہاتھوں میں ایک طرف گھڑی اور دوسری طرف دو چوڑیاں۔ دائیں ہاتھ کی اُنگلیوں میں دو انگوٹھیاں۔ ہر مہمان کے پاس خود جاتی تھیں اور میز بانی کے فرائض ادا کرتی تھیں۔ کھانا بڑا پُر تکلف تھا اور محفل رنگین تھی۔ کھانے سے دیر سے فارغ ہوئے اور پھر بہت دیر تک ہم لان میں مہمانوں کے جانے کے بعد بھی بیٹھے رہے۔

6فروری1956ء

قائداعظمؒ کا پسندیدہ فرنیچر

لیڈی ہدایت اللہ تقریباً ہر شام مس جناحؒ کے یہاں آتی ہیں۔ بڑی پروقار خاتون ہیں اور مس جناحؒ سے بہت دوستی ہے۔ مجھے بھی بہت اچھی لگتی ہیں۔ بہت عمدہ باتیں کرتی ہیں۔ ملک کی سیاست پر بھی بڑے اچھے انداز میں مدلل گفتگو کرتی ہیں۔ رات کا کھانا اکثر یہاں کھاتی ہیں۔ شاپنگ بھی اکثر مس جناحؒ کے ساتھ ہوتی ہے۔ بعض دفعہ مس جناحؒ چھوٹی موٹی چیز لینے بھی بازار جاتی ہیں اور بڑے عمدہ طریق پر شاپنگ کرتی ہیں۔ شام کو کلفٹن کی طرف DRIVE کے لئے اکثر جاتی ہیں۔ میں بھی کئی دفعہ ساتھ چلی جاتی ہوں۔ انہیں سمندر کی طرف گاڑی چلانا بہت پسند ہے۔ آج کہنے لگیں:

''سمندر میں کتنی وسعت ہے اور یہ چیز مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ لاہور میں صرف مال روڈ ہے۔ اس کے علاوہ گاڑی چلانے کی اور کوئی جگہ نہیں۔ لیکن لاہور میں سبزہ بہت ہے جو کراچی میں ناپید ہے''۔

میں نے کہا: ''ہمیں تو کراچی سے اس لئے عقیدت ہے کہ یہ بانی پاکستان کی جائے پیدائش ہے اور اُنہوں نے اپنی زندگی کے شب و روز اس سرزمین پر گزارے ہیں''۔

کہنے لگیں ''مسلمانوں کا سب سے پہلا فاتح محمد بن قاسم بھی یہاں آیا تھا اور اس سرزمین کو اپنا مسکن بنایا تھا''۔

محمد طارق اقبال پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

فلیگ سٹاف ہاؤس کی نیچے کی منزل میں ڈرائنگ روم' سٹڈی روم' ڈائننگ روم' مس جناحؒ کا دفتر' سیکرٹری کا دفتر اور اس سے ملحقہ ایک طویل برآمدہ ہے جس میں وہ تمام فرنیچر پڑا ہوا ہے جو دہلی میں قائداعظمؒ کی کوٹھی سے یہاں آیا ہے۔ کالی آبنوس کی لکڑی کا یہ گولڈن ENGRAVED فرنیچر بہت خوبصورت ہے۔

برآمدے ہی سے سیڑھیاں اوپر جاتی ہیں جہاں دائیں جانب مس جناحؒ کی خوابگاہ ہے۔ نہایت قرینے اور نفاست سے ان کے پلنگ کے پاس پڑھنے کی ایک میز' چند کتابیں اور ضروری کاغذات پڑے رہتے ہیں۔ سامنے ہی نشست گاہ ہے۔ ایک طرف بڑی کھڑکی ہے جو باغ کے عین درمیان میں کھلتی ہے۔ سامنے ایک اور بیڈ روم ہے اور اس کے ساتھ ایک پورا حصہ بند پڑا ہوا ہے جہاں قائداعظمؒ کی تمام ذاتی چیزیں' کاغذات' کتابیں اور کپڑے وغیرہ ہیں۔ مجھے اس حصے سے والہانہ عقیدت ہے کہ قائداعظمؒ ان تمام چیزوں کو استعمال کرتے ہوں گے۔ لان میں ایک طرف مس جناحؒ نے روز گارڈن بنایا ہوا ہے جہاں آج کل کئی رنگوں میں گلاب اپنی بہار دے رہے ہیں۔ پھولوں کے یہ تختے مس جناحؒ کی خواب گاہ کی کھڑکی سے بہت جاذب نظر لگتے ہیں۔

8 فروری 1956ء

پریس کی آزادی

صبح ناشتے کے بعد مس جناحؒ اپنے سکیرٹری کے ہمراہ اپنے دفتر کا کام کرتی ہیں تو میں ان کی ڈاک کھولتی ہوں۔ کچھ دنوں سے اُنہوں نے یہ کام میرے سپرد کر رکھا ہے۔ میں نے خود ہی کہا تھا کہ اس سلسلے میں اگر میں کچھ کر سکوں تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔ وہ کہتی ہیں کہ اُردو میں لکھے ہوئے خط میں انہیں پڑھ کر سناؤں' کیونکہ وہ ٹھیک طرح سے اُردو نہیں پڑھ سکتیں۔ عجیب بات ہے کہ تقریباً ہر خط میں لوگ ان سے مالی امداد طلب کرتے نظر آتے ہیں۔ کوئی اپنے بچے کے لئے' کوئی خود اپنے لئے۔ میں جب بھی ایسا کوئی خط پڑھتی ہوں تو انہیں بہت غصہ آتا ہے اور کہتی ہیں:

THROW IT AWAY. IT IS ANOTHER BEGGAR

آج کی ڈاک میں زیادہ تر خطوط ایسے ہی تھے۔ کہنے لگیں:

''قائداعظمؒ نے یہ ملک محنت کشوں کے لئے بنایا تھا' گداگروں کے لئے نہیں۔ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے آخر ہماری قوم کو شرم کیوں نہیں آتی۔ جب مالی امداد ہم یہاں منظور شدہ اداروں کو دے دیتے ہیں تو پھر اس طرح کیوں دیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی تو معلوم نہیں کہ آیا یہ لوگ واقعی مستحق ہیں بھی یا نہیں۔ کیونکہ ہمارے لوگ جھوٹ بہت بولتے ہیں اور انہیں جھوٹ بولنے میں ذرا بھر شرم محسوس نہیں ہوتی۔ ایک جھوٹ سے دس جھوٹ پیدا ہوتے ہیں اور ویسے بھی جب

انسان کوئی بھی بری عادت اپناتا ہے تو پھر وہ اس کی فطرت بن جاتی ہے اور اسے اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی"۔

اُردو اخباروں کے تراشے میں اکثر انہیں پڑھ کر سناتی ہوں۔ ملک کے سب اخباران کے یہاں آتے ہیں اور انہیں پڑھنے میں بہت لطف آتا ہے۔ لیکن اکثر اخباروں کے متعلق انہیں شکایت ہے کہ یہ حکومت کے ہیں اور ان کا اپنا کوئی نظریہ یا ذاتی رائے نہیں ہے۔ آج کہنے لگیں کہ:

"قائداعظمؒ آزاد پریس کے زبردست حامی تھے اور کسی قیمت پر بھی وہ پریس کی آزادی سلب کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ لیکن ہماری قوم ان کی ہر بات آہستہ آہستہ فراموش کر رہی ہے ------ قوم کا کردار، ہمارا نصب العین اور زندگی کے مقاصد اتنے فرسودہ ہو کر رہ گئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ کیا نئے ملکوں کے نو آزاد باسی ایسے ہوتے ہیں اور آزاد ملکوں میں یہ سب کچھ ہوتا ہے؟"

آج میں نے انہیں کہا "محترمہ آپ قنوطیت پسند ہیں۔ حالانکہ قائداعظمؒ کی عظیم بہن سے ہم یہ توقع نہیں رکھتے۔ اگر آپ ہی اتنی دل برداشتہ ہو گئی ہیں تو ہم لوگوں کا کیا بنے گا؟"

کہنے لگیں "تم خود ہی سوچو! کیا پاکستان انہی باتوں کے لئے معرض وجود میں آیا تھا؟ کتنی قربانیاں اس کے لئے دی گئی تھیں۔ کیا وہ سب رائیگاں جائیں گی؟ صرف آزاد خطے سے کچھ نہیں بنتا۔ ذہنی آزادی اور اقتصادی آزادی بھی تو ہونی چاہیئے"۔

رات کے کھانے کے بعد ہم لوگ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ان کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی ہیں۔ پوری محفل پر چھا جاتی ہیں۔ ذہین لوگ انہیں بہت پسند ہیں۔ جب کوئی اچھا جواب دے تو بہت خوش ہوتی ہیں۔ مہمانوں کے جانے کے

بعد جب ہم دونوں (میں اور خورشید) سب سے آخر میں ان سے رخصت ہونے لگیں تو دروازے تک ہمیں چھوڑنے آتی ہیں اور "شب بخیر" کہہ کر دروازہ بند کرتی ہیں۔ نیچے کے برآمدے سے ملحق ہمارے کمروں کا مختصر سا برآمدہ ہے محترمہ اندر کے سب لیمپ بجھا کر اوپر اپنے کمرے میں سونے کے لئے چلی جاتی ہیں۔ نوکروں کے کوارٹر بہت فاصلے پر ہیں۔ گویا اتنے بڑے گھر میں بالکل تنہا ہوتی ہیں۔

آج میں نے ہچکچاتے ہوئے ان سے پوچھا: "محترمہ آپ کو اتنی بڑی کوٹھی میں اکیلے ڈر تو محسوس نہیں ہوتا؟"

ہنستے ہوئے کہنے لگیں:

"اگر ڈرتی تو قائداعظمؒ کے ساتھ مل کر ہندوؤں اور انگریزوں کے مقابل ملک کی جدوجہد میں حصہ نہ لیتی"۔

10فروری 1956

سرسید پبلک کالج

محترمہ فاطمہ جناح کے ساتھ فلیگ سٹاف ہاؤس میں گزارے ہوئے دن میری زندگی کے یادگار دن ہیں جو برسوں گزرنے پر بھی میری یادوں میں تازہ ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ محترمہ میرے سامنے ہیں۔ ان کا سفید ریشم کا بے شکن لباس' سر پر چوڑا سفید شفون کا دوپٹہ' چہرے پر ایک لافانی مسکراہٹ' میرے ذہن میں بسی رہتی ہے۔ لگتا ہے ابھی کچھ کہیں گی۔ قوم کا درد جو ان میں موجزن تھا اس کا تذکرہ کریں گی۔ دن رات امریکہ جانے کے خواب دیکھنے والے ہم وطنوں کا ذکر کریں گی۔ قوم کی بے حسی کا شکوہ کریں گی۔ وہ اکثر اپنے عظیم بھائی کا ذکر کرتی تھیں۔ وہ عظیم قائد جو ان کا بھائی تھا لیکن 10 کروڑ مسلمانانِ ہند کا ایک مخلص لیڈر اور قوم کا نجات دہندہ تھا۔ البتہ ان کی کتنی شان ہے کہ ایک ہی گھر میں محمد علی جناحؒ اور فاطمہ جناحؒ پیدا ہوئے جنہوں نے تاریخ میں اپنا نام پیدا کیا اور ایک ان مٹ یاد دنیا کے لیے چھوڑ گئے۔ اگر قائداعظمؒ عام آدمی نہیں تھے تو محترمہ فاطمہ جناحؒ بھی ایک عام عورت نہیں تھیں۔

ان دنوں وہ بہت متحرک تھیں۔ سکولوں' کالجوں' گرلز گائیڈ' رفاہی اداروں اور کئی سماجی تنظیموں کی وہ رہنمائی کرتیں۔ ان کی تقریبات میں جاتیں۔ آج سرسید پبلک کالج کراچی میں سالانہ جلسہ تھا جس کی صدارت مس جناحؒ نے کی۔ کالج کے باہر گوٹے اور تلے کے ہاروں سے کالج کی پرنسپل اور سٹاف نے انہیں لاد دیا۔ مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگیں۔ کیا پاکستان میں پھول ختم ہوگئے ہیں؟ پھولوں کے ہار

زیادہ بہتر ہیں۔ اتنے مہنگے ہار خریدنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہی رقم ادارے کی کسی ضرورت کے لیے استعمال ہوسکتی تھی۔ کہنے کو تو یہ معمولی سی بات ہے لیکن اس میں کتنی گہرائی ہے۔ قوم کا روپیہ ایک مقدس امانت ہے اسے یوں کیوں خرچ کیا جائے۔ آئندہ آنے والے سالوں میں ہمارے حکمرانوں نے عیش وعشرت اور اپنی ذات پر جو روپیہ خرچ کیا اس سے ملک دیوالیہ ہوگیا اور آج پاکستان کے ہر شہری پر IMF والوں کا قرض ہے۔ کتنی شرمناک بات ہے۔ اگر قوم سادگی اور کفایت شعاری سے کام لیتی تو ملک ترقی کرنے کے ساتھ خود کفیل بھی ہوتا۔

کالج کی طالبات اور سٹاف کے علاوہ خواتین کی ایک کثیر تعداد وہاں موجود تھی۔ رنگا رنگ پروگرام ہوئے اور اس کے بعد مس جناحؒ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے طالبات میں انعامات تقسیم کئے۔ کالج کی پرنسپل نے محترمہ کو سپاسنامہ پیش کیا۔ جواب میں اُنہوں نے نہایت سلجھی ہوئی تقریر کی۔

ان کی تقریر کا عنوان ''قومی تعمیر نو میں خواتین کا کردار'' کے حوالے سے تھا۔ انہوں نے گھریلو زندگی کو بہت اہمیت دی۔ پھر بچوں کی نگہداشت' مردوں کے ساتھ تعاون اور محبت' کفایت شعاری اور قومی اداروں میں کام وغیرہ پر زور دیا۔ ان کے الفاظ آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہیں۔ کہنے لگیں: ''مردوں کے لیے زندگی کی راہیں کتنی آسان ہوجائیں اور وہ ملک اور قوم کے کتنے بہترین فرد ثابت ہوں اگر اپنے گھر میں آرام سکون اور محبت نصیب ہو۔ دن بھر کا تھکا ہارا مرد جب گھر آتا ہے تو ایک ہنستا مسکراتا ہوا گھر' ایک سلیقہ شعار بیوی اور صحت مند بچے اس کی تھکاوٹ ختم کردیتے ہیں۔ عورت اپنے مسائل کا ذکر شوہر سے ضرور کرے لیکن موقع محل دیکھ کر بات کی جائے تو کبھی بری نہیں لگتی کیونکہ عورت کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ دونوں مل جل کر زندگی کی گاڑی چلاتے ہیں۔

سلیقہ، بردباری، تحمل، خوش مزاجی اور وسعت عورت کے زیور ہیں۔ ان سب باتوں کے ساتھ خواتین میں اعلیٰ کردار ان کی شخصیت میں نکھار لاتا ہے۔

کیرکٹر انسان کا آئینہ ہوتا ہے۔ اور ایک عورت کے لئے تو اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے ورنہ سوسائٹی کا نظام خراب ہو جاتا ہے۔ ہزاروں مثالیں ایسی ہیں کہ آزادی کے غلط رنگ میں بہہ جانے والی عورت نہ اچھی ماں ثابت ہوتی ہے نہ اچھی بیوی اور نہ ہی سوسائٹی کی ایک اچھی فرد۔

ایسے حالات میں بسا اوقات شوہر بھی غلط راہیں اپنا لیتا ہے اور گھر اور بچے تباہ ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی والدین کے حوالے سے بھی اخلاقی حدود سے آگے نکل جاتا ہے۔ گھروں سے سکون چلا جاتا ہے۔ گھر جو انسان کی پناہ گاہ ہے جب وہاں عافیت اور چین نصیب نہ ہو تو پھر کیا رہ جاتا ہے!

دراصل عورت سوسائٹی کی بنیاد ہے۔ زندگی سنوارتی ہے، سکون لاتی ہے خوشی اور مسرت ان گھروں میں عورت کے دم سے ہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونا بڑا ضروری ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ایک کثیر آبادی اس نعمت سے محروم ہے۔ پھر اکثر والدین بچیوں کی تعلیم کی اتنی پروا نہیں کرتے کہ انہیں کونسی روزی کمانا ہے۔ لیکن صرف روزی کمانے کے لیے ہی تعلیم ضروری نہیں بلکہ تعلیم تو روشنی کا مینار ہے۔ ہاں اندھیرے اس طرح دور ہو سکتے ہیں۔ معاشرے میں اصلاح کی بہت ضرورت ہے۔ کام بہت ہیں۔ قوم کی زندگی کو صحیح راہوں پر گامزن کرنا ہے اور ان میں شعور پیدا کرنا ہے۔ اس جہاد میں ہم سب کو شریک ہونا چاہیے جو ہم پر بحیثیت آزاد ملک کے شہری کا فرض ہے۔

اچھے تعلیمی ادارے ہماری قوم کا سرمایہ ہیں۔ ہمارے بنیادی کردار کا گہوارہ ہیں۔ ہمارے بچے جو کل قوم کے رہنما بنیں گے ان ہی اداروں اور استادوں کی شفقت اور محبت میں بڑے ہوتے ہیں اور میرا تو عقیدہ ہے کہ یہی عمر کا وہ دور ہے جب ہمارا کردار بنتا ہے اور یہی وہ عمر ہے جس کے نقوش دیرپا ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ استاد اپنے فرائض جس خوبی سے انجام دے رہے ہیں ان کے ساتھ طلبا میں اخلاق اور ذہن کی بلندی بھی پیدا کی جائے اور ان میں زندہ قوموں اور زندہ انسانوں جیسے احساسات کی اہلیت پیدا کی جائے۔ چنانچہ اس احساس کو اُجاگر کرنے کے لئے والدین کا استادوں سے تعاون بہت ضروری ہے ورنہ اس کے بغیر تعلیمی اداروں اور استادوں کا کام ادھورا رہ جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے بچے دن کا بیشتر حصہ اپنے استادوں کے ساتھ گذارتے ہیں لیکن بچے کی اصل تربیت گاہ والدین اور خاص طور پر ماں کا قرب ہوتا ہے۔ کیونکہ مرد اور عورت زندگی کے ہر شعبے میں خواہ کتنے ہی ترقی پسند اور یکساں حقوق کے مالک ہو جائیں لیکن عورت پر ہر حالت میں پہلے گھر اور بچوں کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ایک عورت ہی بچوں کو عمدہ تربیت دے کر اپنے گھر اور ملک کو خوشحال بنا سکتی ہے۔ اگر مردوں کو اپنے گھروں میں خوشی اور اطمینان کی وہ رمق نظر آ جائے جو ہمارے اکثر گھروں میں مفقود ہے تو ان کے لئے زندگی کی راہیں کتنی ہموار ہو جائیں اور وہ قوم و ملک کے لئے کتنے اچھے شہری ثابت ہوں''۔

بہت اچھا بولیں اور خواتین نے بے حد سراہا۔ ایک بات پر بہت خفا ہوئیں۔ جب ان کے گلے میں سلمہ ستاروں کے ہار ڈالے گئے، کہنے لگیں: یہ صریحاً WASTE OF MONEY ہے۔ عزت افزائی اس کے بغیر بھی ہو سکتی ہے''۔

واپسی پر میں نے ان سے کہا کہ عام لوگوں کو شاید یہ خیال ہے کہ آپ آزاد خیال واقع ہوئی ہیں، حالانکہ آپ عورت کا اصل مقام اس کا گھر، اس کا شوہر، اور اس کے بچے سمجھتی ہیں۔ ماڈرن عورت اپنی راہ سے بھٹک گئی ہے اور ان چیزوں کو فرسودہ سمجھتی ہے۔ کہنے لگیں:

"تم جیسی پڑھی لکھی لڑکیوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ دوسری ہم عمر لڑکیوں کو اپنا ہم خیال بناؤ۔ تم لوگ ہی قوم کو بناؤ گے۔ ایک اچھی بیوی اور ایک اچھی ماں قوم کا بہت بڑا اثاثہ ہیں"۔

میں نے ہنستے ہنستے کہا "جب ایسی عورتیں ہم جیسوں کو دقیانوسی اور BACKWARD کہتی ہیں تو بہت غصہ آتا ہے"۔ یکدم ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور پیشانی پر بل پڑ گئے، کہنے لگیں:

"تم لوگ جھوٹی باتوں کو معیارِ عزت کیوں بناتی ہو۔ یہی تو ہمارا سب سے بڑا قصور ہے۔ بھلا ان باتوں سے کیا ہوتا ہے۔ تم جانتی ہو کہ مخالفین قائداعظمؒ کو کیسے کیسے ناموں سے پکارتے تھے۔ کافر، ماڈرن، مغرور اور جانے کیا کیا نام دیتے تھے لیکن اُنہوں نے اس کی ذرا بھر پروا نہ کی۔ تم لوگ نوجوان ہو۔ تم میں ایک عزم ہونا چاہیے۔ سننے اور سنانے کی ہمت ہونی چاہیے۔ ضروری نہیں کہ لوگ تمہارے ہر فعل کو اچھا کہیں۔ DO YOUR BEST, LEAVE THE REST۔ یہ تمہاری زندگی کا اصول ہونا چاہیے"۔

محترمہ کی باتیں تو آبِ زر سے لکھنے والی ہیں۔ ان کی اپنی زندگی ایک مکمل کتاب تھی۔ عمل تھی۔ تحریکِ پاکستان کے دور میں انہوں نے جس طرح بہن کی حیثیت سے قائداعظمؒ کا خیال رکھا۔ گھر داری کے سارے فرائض کے ساتھ انکی صحت

اور آرام کو اپنی توجہ کا محور بنا لیا۔ یہ ان کا ہم سب پر بہت بڑا احسان ہے کیونکہ زندگی کے 30 طویل سال جو انہوں نے قائداعظمؒ کے ساتھ گزارے وہ قربانی ایثار اور خدمت کی ایسی داستان ہے جو اَن مٹ ہے۔ اپنا کیریئر انہوں نے چھوڑا۔ اپنا گھر نہ بسایا اور قائداعظمؒ کے عظیم مقصد میں وہ قوم کی ساتھی بن گئیں۔ اگر ان کا قرب قائداعظمؒ کے ساتھ نہ ہوتا تو شاید پاکستان حاصل کرنے کی منزل اور کٹھن ہو جاتی اور مشکل ہو جاتی۔ اس لیے قائداعظمؒ نے اپنی بہن کے متعلق ایک بار فرمایا تھا: "میری بہن اس وقت میرے لیے اُمید اور حوصلے کا سبب بنیں جب ہم ایک بہت بڑے انقلاب سے ہمکنار ہو رہے تھے۔"

اور پھر ایک بار فرمایا: "پاکستان میری، میری بہن اور میرے سیکرٹری کی کوششوں سے حاصل ہوا"۔

کتنا بڑا اعزاز انہوں نے چند الفاظ میں مادرِ ملتؒ کو دیا اور وہ واقعی اس کی مستحق تھیں۔

واپسی پر ہم نے پھل خریدے اور گھر کے لئے ضروری کھانے کا سامان اور ایک اوول ٹین کا ڈبہ بھی اُنہوں نے خریدا اور مجھے کہنے لگیں:

"تمہارے لئے خریدا ہے۔ رات گرم دودھ میں پیا کرو۔ میں نے بیرے کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ رات تھرماس میں گرم دودھ تمہارے لئے رکھ دیا کرے تاکہ جب تمہارا دل چاہے پی سکو"۔

12 فروری 1956ء

ذہین بیرا

مس جناحؒ کا ایک بیرا' جس کا نام اسحاق ہے' بہت تیز اور ذہین ہے۔ وہ نظر بچا کر تمام اخبار پڑھتا ہے اور پھر جب میں کچن میں جاؤں یا وہ ادھر ادھر مجھے دیکھے تو بیسیوں سوال کر دیتا ہے کہ ایسے کیوں ہوا؟ اور کس لیے ہوا؟ مس جناحؒ کا شیدائی ہے اور مجھے بارہا کہتا ہے کہ اس نے قائداعظمؒ سے والہانہ عقیدت کی وجہ سے ان کی نوکری اختیار کی ہے۔ آج کے اخبار میں اس نے موجودہ مالی سال میں ٹیکسوں کے بارے میں پڑھا تو مجھے کہنے لگا کہ یہ ٹیکس فلاں چیز پر زیادہ ہونے چاہئیں اور فلاں پر کم۔ میں نے دوپہر کے کھانے پر مس جناحؒ سے ذکر کیا کہ آپ کے علاوہ ایک اور سیاست دان بھی اس گھر میں موجود ہے اور روز کسی نہ کسی بات پر سیاست اور ملکی حالات پر بحث شروع کر دیتا ہے۔ کہنے لگیں:

''تم سن لیا کرو' کیونکہ بعض اوقات ایک عام اور ان پڑھ شخص' پڑھے لکھے اور صاحبِ حیثیت شخص سے زیادہ اچھی بات سوچ سکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایسے لوگوں کو زندگی میں ایسے مواقع میسر نہ آ سکے جو ایک اچھے گھرانے کے افراد کو نصیب ہوتے ہیں۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ 1947ء میں جب قیامِ پاکستان کا تاریخی فیصلہ ہو گیا تو قائداعظمؒ کو ہندوستان کے چاروں اطراف سے مبارک باد کے خط موصول ہونے شروع ہوئے۔ ان ہی دنوں مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں سے ایک

ان پڑھ دیہاتی کا پوسٹ کارڈ قائداعظمؒ کو ملا جس میں لکھا تھا: ''اے پیارے قائد' تم نے ہمیں ملک تو دلوا دیا لیکن ہندوؤں اور انگریزوں پر اعتبار نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ آبادی کے تبادلہ کے وقت قتلِ عام کا سلسلہ شروع ہو جائے۔'' قائداعظمؒ اپنی ذاتی ڈاک ضرور دیکھتے تھے۔ انہوں نے اس خط کے متعلق سوچا ضرور' لیکن کام کی زیادتی اور مصروفیت کی بنا پر اس بات کا خیال نہ کیا کہ اس معمولی شخص کی رائے بھی وقعت رکھتی ہے اور کتنی عجیب بات ہے کہ یہ خیال سیاست دانوں اور دانشوروں کے ذہن میں نہ آیا جو ایک جاہل آدمی کے دماغ میں آ گیا۔ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں خدا نے سب کو ودیعت کی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تعلیم اور علم سے ان میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔''

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم کچھ دیر باتیں کرتے ہیں۔ پھر محترمہ اوپر اپنے کمرے میں چلی جاتی ہیں اور دوپہر کو آرام کرتی ہیں۔ محترمہ اپنے ساتھ چند اخبار بھی لے جاتی ہیں۔ پانچ بجے نیچے اترتی ہیں اور اپنے مطالعہ کے دوران ہی سادہ چائے نوش کرتی ہیں۔ کچھ دیر بعد مہمانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پہلے سے باقاعدہ وقت لے کر آتے ہیں۔ سیکرٹری ان کے نام لے لے کر اندر بلاتا ہے۔ آج سیکرٹری کی طبیعت خراب تھی' چنانچہ یہ کام میں نے کیا۔ اس کے بعد مغرب کے وقت ہم لوگ بازار گئے۔ مس جناحؒ نے گھر کے لیے پھل خریدے۔ وہ پھل وغیرہ اکٹھے ہی لے آتی ہیں' جو چند دن تک کام دے جاتے ہیں۔

آج جب ہم پھل خرید کر دکان سے نکلے تو ایک فقیر بھیک مانگنے کے لیے آ گیا۔ میں نے اسے چونی دی تو محترمہ ناراض ہوئیں اور کہنے لگیں:

''تم قوم کو گداگر کیوں بناتی ہو RECOGNIZED CHARITY دیا کرو۔''

میں نے کہا: ''اب آپ ہی بتایئے اس وقت تو چار آنے میں کام ہو گیا RECOGNIZED CHARITY کے لیے تو زیادہ رقم ہونی چاہیے۔''

کہنے لگیں: ''یہ معمولی رقم تم روز ایک طرف ڈال دیا کرو اور جب زیادہ ہو جائے تو کسی مناسب ادارے کو بھجوا دیا کرو۔ اس طرح بہت سے لوگوں کا بھلا ہو سکتا ہے۔ گداگروں کو پیسے دے کر تم جیسے لوگ پوری قوم کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔''

آج رات کھانے کے بعد ہم کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ بہت سے مہمان موجود تھے۔

13 فروری 1956ء

وقت کی پابندی

مس جناح وقت کی اتنی پابند ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ لیکن پھر یہ سوچنا پڑتا ہے کہ قائداعظم کی بہن جو ہوئیں۔ آج کہنے لگیں:

''ہم لوگ وقت کی قدر نہیں کرتے۔ اگر قائداعظم بھی یہی کرتے تو پاکستان کبھی حاصل نہ ہو سکتا۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ قوم کے لئے وقف کر دیا تھا اور دن رات کام کرتے تھے۔ ہمارے لوگ فضول باتوں اور بے کار جھگڑوں میں جو وقت ضائع کرتے ہیں اسے کسی درست کام کے لئے بھی تو صرف کیا جا سکتا ہے''۔

آج شام میں اور خورشید پکچر دیکھنے گئے۔ وہاں سے کسی اور کو ملنے چلے گئے۔ گاڑی ہمارے پاس نہیں تھی۔ ٹیکسی بھی نہ مل سکی' چنانچہ واپسی پر دیر ہو گئی۔ جب گھر پہنچے تو مس جناح برآمدے میں پریشانی کے عالم میں چکر لگا رہی تھیں۔ رات کا کھانا ٹھیک نو بجے میز پر لگ جاتا ہے اور اس وقت نو بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔ میں نے آتے ہی معذرت کی اور مجبوری بتائی۔

کہنے لگیں: ''تم لوگ کہیں سے فون کر دیتے۔ ویسے تمہیں ایسی کوئی پابندی بھی نہیں ہے کہ کھانے میں ضرور شریک ہوں۔ تمہیں گھومنے پھرنے کے لئے بھی جانا چاہیے۔ اس وقت تم لوگوں کی کوتاہی کی وجہ سے میرا کھانا لیٹ ہو گیا ہے۔

ہم دونوں بہت شرمندہ ہوئے اور چپ چاپ کھانے کے کمرے میں آ گئے۔ کھانے کا کمرہ کافی بڑا ہے۔ بڑی میز کے گرد اٹھارہ کرسیاں لگی ہوتی ہیں'

محمد طارق اقبال پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

لیکن اگر مہمان نہ ہوں تو ہم لوگ کونے کی ایک گول میز پر کھانا کھاتے ہیں جس کے گرد چار کرسیاں پڑی رہتی ہیں۔ اس کونے میں تینوں سمت کھڑکیاں ہیں جو پچھلے لان میں کھلتی ہیں۔ کھڑکیوں پر بیلیں چڑھی ہیں۔ کراچی میں پودے بہت جلد بڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ بیل چند دنوں میں ہی اتنی بڑی ہوگئی ہے۔

آج رات کھانے کے بعد ہم تینوں (میں' خورشید اور محترمہ فاطمہ جناحؒ) ایک لمبی سیر کے لئے گئے۔ مس جناحؒ راستہ بھر باتیں کرتی رہیں۔ بہت ہشاش بشاش تھیں۔ آج وہ زیادہ تر تقسیم ہند سے پہلے کی باتیں کرتی رہیں۔

بارہ بج رہے ہیں۔ یہ چند سطور لکھ کر اب میں سونے کے لئے اپنے کمرے میں جاؤں گی۔

15 فروری 1956ء

عورت کا اصل کردار

آج دوپہر کے کھانے کے بعد مس جناحؒ کافی دیر تک ڈرائنگ روم کے پشت والے چھوٹے کمرے میں بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ مجھے سارے گھر میں یہ کمرہ بہت پسند ہے۔ چھوٹا سا آرام دہ۔ عجیب سا سکون ملتا ہے یہاں بیٹھ کر۔ آج شام وہ کہیں جا رہی تھیں۔ اگر انہیں باہر جلدی نہ جانا ہوتا تو جانے اور کب تک باتیں کرتی رہتیں۔ بحث کا موضوع ''عورت'' تھا۔ عورت کے جذبات کی صحیح ترجمانی عورت ہی کر سکتی ہے۔ مرد اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتا۔ مجھے اب ٹھیک طرح سے یاد نہیں کہ بات کہاں سے شروع ہوئی' تاہم وہ اپنے بچپن کا ایک واقعہ سنانے لگیں کہ:

''سکول کے ایام میں ایک روز میں اپنی شادی شدہ بہن سے' جو ہمارے قریب ہی رہتی تھیں' ملنے کے لئے اکیلی چلی گئی۔ قائداعظمؒ کو معلوم ہوا تو انہوں نے کہا کہ آئندہ سے جب بھی باہر جانا ہو تو آپا کو ضرور ساتھ لے جایا کرو۔ مجھے غصہ آ گیا لیکن میں قائداعظمؒ کے سامنے بول نہ سکی۔ میرے دل و دماغ میں ایک ہیجان سا برپا ہو گیا۔ میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا کہ آپا بھی تو ایک عورت ہے۔ ان پڑھ اور کمزور عورت ------ اور میں ایک پڑھی لکھی اور جوان لڑکی ہوں۔ وہ میری حفاظت کیا کر سکتی ہے؟ دراصل ہمارے بزرگ ہمیں اس لئے اکیلا باہر نہیں جانے دیتے کہ انہیں ہم پر بھروسہ نہیں --------- ہم پر شک کرتے ہیں۔ لیکن وقت گزرنے کے

محمد طارق اقبال پاکستانی یونائٹڈ ڈاٹ کام

ساتھ ساتھ مجھے اپنی یہ بات بالکل کھوکھلی معلوم ہوئی کیونکہ اکیلے باہر جانے پر معمولی سی پابندیاں عائد کرنے سے ہمارے گھر والوں کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیں دنیا کی حریص نظروں سے بچا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ دراصل سوسائٹی نے عورت کا درجہ بالکل گرا دیا ہے اور ہر نوجوان لڑکی کو اپنی عمر کے ایک خاص مقام پر اس اُلجھن سے ضرور دوچار ہونا پڑتا ہے کہ گھر والے اس پر شک کیوں کرتے ہیں۔ کئی سالوں بعد میری ایک بھانجی نے مجھ سے یہی کہا کہ گھر سے اسے بغیر اجازت باہر جانے کی اجازت نہیں۔ ہر جگہ پوچھ کر جانا پڑتا ہے' آخر کیوں؟ یہ پابندی لڑکوں پر کیوں نہیں عائد کی جاتی۔ میں نے اسے سمجھایا اور اپنا واقعہ بھی سنایا''۔

میں نے کہا کہ آخر یہ چیز ختم کیوں نہیں ہو جاتی۔ مردوں کو یہ احساس کیوں دلایا جائے کہ وہ عورت سے برتر ہے اور عورت کا فرض ہے کہ اسے خوش رکھے۔ اس کے آسائش و آرام اور خوشنودی کا خیال رکھے اور اس کی جائز و ناجائز بات مانے۔

میری بات کے جواب میں وہ مسکرائیں اور کہنے لگیں:

''عورت مرد سے ہرگز ادنیٰ نہیں ہے لیکن اسے بنا دیا گیا ہے۔ چنانچہ ایسی صورتحال میں اسے ان تمام حالات کو' جو عورت بن کر پیدا ہونے پر اسے ورثے میں ملے ہیں' بہتر طور پر سمجھنا چاہئے۔ قدرت نے بھی عورت کو کمزور بنا دیا ہے۔ شادی سے پہلے اسے گھر میں بھی والدین کی ہر بات اس لئے ماننا پڑتی ہے کہ بعد میں اسے اپنی پوری زندگی ایک مرد کے ساتھ بسر کرنا ہوتی ہے اور اس کی ہر بات پر سر تسلیم خم کرنا ہوتا ہے اور اس کی خواہشات کے مطابق خود کو ڈھالنا ہوتا ہے۔ پھر شادی کے بعد جب عورت ماں بن جاتی ہے تو پھر اس کے امتحان کا اصل مرحلہ آتا ہے۔ شوہر کے ساتھ اس کے جسمانی تعلقات کچھ عرصے تک ویسے نہیں رہ سکتے۔ چھوٹے بچے کے ساتھ وہ

شروع میں کہیں آجا بھی نہیں سکتی اور نہ ہی اسے گھر پر اکیلا چھوڑ سکتی ہے اور مرد اس کے ساتھ اپنے روابط میں فرق نہیں لانا چاہتا۔ باپ بن کر اس پر وہ ذمہ داریاں عائد نہیں ہوتیں جو عورت پر ماں بن کر عائد ہو جاتیں ہیں۔ پھر قدرت نے مرد کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ وہ عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس لئے جب کسی وقت اسے اپنی بیوی سے تسکین حاصل نہیں ہوتی تو وہ دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگتا ہے۔ پھر عورت مرد کے مقابلے میں زیادہ جلد بوڑھی ہو جاتی ہے اور اس وجہ سے بھی مرد کو قدرت نے زیادہ فائدے میں رکھا ہے۔ مرد جب چاہے دوسری شادی رچا سکتا ہے۔ عورت کو طلاق دے سکتا ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ مرد ہے اور وہ عورت--------اور اسے حق ہے کہ وہ مرد ہونے کے ناطے ناانصافی سے بھی دریغ نہ کرے''۔

میں نے کہا: ''دراصل اس MAN-MADE WORLD میں عورت کی پوزیشن بڑی خراب ہے''۔

وہ جواب میں بولیں:

''یہ MAN-MADE WORLD بھی ہے لیکن قدرت نے بھی بہت سی باتوں میں عورت سے بے انصافی کی ہے اور چونکہ عورت کو ان سب امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے اس لئے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہی بہتر ہے کہ وہ عقل مندی اور سیاست سے اپنی زندگی کو خوبصورت ترین و خوشحال بنانے کی کوشش کرے اور ان باتوں پر نوحہ خوانی نہ کرے کہ وہ عورت ہے اور مرد اسے ادنیٰ سمجھتا ہے-------اب تو خیر حالات بہت بدل گئے ہیں۔ ترقی یافتہ دنیا میں عورت کی پوزیشن پہلے سے بہت بہتر ہوگئی ہے لیکن اس کے باوجود عورت کو یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ عورت ہے اور مرد جب اپنی من مانی پر آجاتا ہے تو اس کے احساسات اس کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں

رکھتے-----اس لئے بہتر یہی ہے کہ عورت کا ہر فعل ایسا ہو کہ مرد کو دم مارنے کی گنجائش نہ رہے کیونکہ ان تمام خامیوں کے ساتھ قدرت نے عورت کو مرد کی سب سے بڑی کمزوری بھی بنایا ہے۔عورت زندگی کے ہر شعبے میں صرف اس لئے پیچھے رہی کہ مرد نے اسے کبھی آگے آنے کا موقعہ ہی نہیں دیا کہ وہ بھی باہر نکل کر مرد کی طرح آزاد فضا میں سانس لے اور ایک آزاد انسان کی سی زندگی بسر کرے۔چنانچہ ایک عورت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مرد پر قابو پائے۔اس کے جذبات اور احساسات کو سمجھے کیونکہ مرد اپنے تفوق اور برتری کے باوجود بعض باتوں میں بہت سادہ ہوتے ہیں۔صرف ذرا سی توجہ' محبت اور مرد کے ساتھ تعاون اُنہیں عورت کے قریب لے آتا ہے۔ضروری نہیں کہ بڑی باتیں یا بہت زیادہ محبت ہی انسان کو انسان کے قریب لے آتی ہے بلکہ چھوٹی چھوٹی' غیر اہم اور معمولی باتیں بھی انسان پر اثر انداز ہوتی ہیں۔میں تو سمجھتی ہوں کہ ایک اچھی عورت' بیوی اور ماں کی حیثیت سے پورے معاشرے کا نظام بدل کر رکھ دیتی ہے لیکن صرف عورت اس بات کو نہیں سمجھتی۔ ہمارے معاشرے کی تمام خرابیوں کو صرف عورت ہی درست کر سکتی ہے۔اگرچہ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔اس کے لئے مسلسل جدوجہد اور کوشش درکار ہے لیکن ایک بار اگر آپ اس نظریے سے سوچنا شروع کر دیں تو پھر کچھ مشکل نہیں رہتا''۔

راتیں ان دنوں چاندنی میں نہائی ہوئی ہیں۔چاند خوب چمکتا ہے اور رات کی رانی کے پودے اس دودھیا چاندنی میں اپنے سبز نوخیز پتوں کے ساتھ بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔کہتے ہیں ''رات کی رانی'' کے ساتھ سانپ کو عشق ہوتا ہے لیکن یہاں اس کی اتنی بہتات کے باوجود کبھی سانپ نظر نہیں آیا۔کہاں رات کی رانی کہاں سانپ کا تذکرہ۔بعض باتیں کتنی غیر شاعرانہ ہوتی ہیں۔میرے خیال میں تو یہ محض کہاوتیں ہیں۔

16 فروری 1956

فاطمہ جناحؒ سکول

آج میں محترمہ فاطمہ جناحؒ کے ساتھ' فاطمہ جناحؒ سکول گئی۔لڑکیوں کا یہ سکول ان کے نام سے حال ہی میں قائم ہوا ہے۔ایک بورڈ اس کا انچارج ہے جس کے کئی ممبر ہیں اور کافی لوگوں نے چندہ دیا ہے۔کافی بڑا اور اچھا سکول ہے۔مس جناحؒ اس کی سربراہ ہیں۔ابھی یہ سکول تکمیل کے مراحل میں ہے۔کمروں میں پورا فرنیچر نہیں آیا لیکن اُمید ہے جلد ہی بن جائے گا۔ہمارے ساتھ حسن شیخ اور ان کی بیگم بھی تھیں۔یہ کسی زمانے میں قائداعظمؒ کے سیکرٹری تھے۔مس جناحؒ کے پاس اکثر آتے ہیں۔اس سکول کا کافی کام ان کے ذمہ ہے۔مس جناحؒ نے سکول کے بارے میں ہدایات دیں۔سٹاف ممبرز سے بھی ملیں اور انہیں سکول کے متعلق پوچھا کہ کیسا کام ہو رہا ہے۔ہیڈ مسٹریس سے اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ ''سٹاف میں زیادہ چپڑاسی ہو گئے ہیں حالانکہ اس کی ضرورت نہیں۔فالتو سٹاف سے پرہیز کریں کیونکہ اس طرح دوسرے لوگ کام میں کوتاہی کریں گے''۔

واپسی پر کہنے لگیں: ''قائداعظمؒ کو تعلیمی اداروں سے ہمیشہ دلچسپی رہی اور زندگی بھر وہ ان کی توسیع و ترقی کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور کرتے رہے۔ہمیشہ کہتے تھے کہ قوم کی بہتری اور ترقی کا انحصار صرف نوجوان طبقے پر ہے کیونکہ مستقبل میں یہی قوم کے ناخدا ہوں گے اور ان ہی میں سے لیڈر پیدا ہوں گے۔اس لئے ضروری ہے کہ

بچوں کی بنیادی تعلیم و تربیت میں بھرپور دلچسپی لی جائے اور ذہنی طور پر انہیں ایک مضبوط کردار کا انسان بنایا جائے''۔

میں نے کہا: ''آج کل لوگوں کو یہ شکایت بھی ہے کہ نوجوان نسل اپنی راہ سے بھٹک گئی ہے، محنت سے جی چراتی ہے اور آرام طلب بن گئی ہے۔ اسے اپنے گردوپیش کے حالات کا قطعاً احساس نہیں۔ وہ نسل کوئی اور تھی جس نے تحریک پاکستان میں دن رات کام کیا''۔

بولیں: ''سب سے زیادہ تو ہمارے والدین بھٹک گئے ہیں' اگر والدین صحیح ہوں تو بچے کم ہی خراب ہوں گے۔ یہ بات درست ہے کہ آج کل کی دنیا میں باہر سے آنے والے مغربی اثرات سے ہم اپنے بچوں کو نہیں بچا سکتے لیکن اگر ان کی بنیادی تربیت ٹھیک ہو تو وہ کبھی غلط راہوں پر نہیں چلیں گے۔ پھر آخر نوجوانوں کو کچھ نہ کچھ تو لطف اندوز ہونے کا بھی حق تو حاصل ہے۔ بڑی بھی ہر دم ان سے یہ توقع کیوں رکھیں کہ وہ ہمیشہ ان کی طرح سوچیں۔ نوجوانوں کے ساتھ ہمیں بھی تو ان کے مشاغل میں شریک ہونا چاہئیے۔ اگر ایسا ہو تو وہ یقیناً ہمارے ساتھ ایک حد تک بے تکلف ہوں گے اور کبھی غلط کام نہیں کریں گے۔ جن گھروں میں بچوں اور والدین کے درمیان ایک خلیج قائم ہو جائے وہاں ایسی باتیں زیادہ ہوتی ہیں''۔

میں نے جواب میں کہا: ''پہلے تو بچوں اور والدین میں ایسی خلیج کے باوجود بچے کبھی نہیں بھٹکتے تھے''۔

''وقت بھی تو بدل گیا ہے''۔ محترمہ یک دم بولیں' ہر وقت کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ ہم ایک حد تک اپنے آپ کو بدل کر اپنے معیار کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ والدین اور بچوں میں ایسی بے تکلفی ہو کہ وہ بدتمیزی کی حد تک محسوس ہونے لگے''۔

آج رات کے کھانے پر مسلم لیگ کے خان عبدالقیوم خان بھی تھے۔ وہ پشاور سے آئے تو محترمہ کو بھی ملنے چلے آئے۔ محترمہ ان سے مسلم لیگ کے بارے میں ہی گفتگو کرتی رہیں۔ محترمہ نے کہا کہ:

''قائداعظم کی مسلم لیگ کہاں ہے اور وہ قدریں کیا ہوئیں؟''

خان قیوم انہیں مغربی پاکستان کے متعلق بتاتے رہے اور وہ بڑی ناخوشگواری سے کئی باتوں کا جواب دیتی رہیں اور یہی کہا کہ وہ ان حالات میں نہ تو ملکی سیاست سے اور نہ ہی ملک کے اندرونی حالات سے مطمئن ہیں''۔

آج رات جب وہ ہمیں چھوڑنے دروازے تک آئیں اور ہم نے انہیں ''شب بخیر'' کہا تو اُنہوں نے حسب عادت مسکرا کر جواب دیا اور مجھے یقین نہ آیا کہ یہ وہی شخصیت ہیں جو ابھی ملک کے حالات سے اتنی غیر مطمئن اور پژمردہ نظر آ رہی تھیں۔

فضا میں رات کی رانی کی مہک ہے۔ فلیگ سٹاف ہاؤس میں پچھلی سمت اس کے بہت سے پودے لگے ہوئے ہیں جن کی جادوانی مہک ذہن کو شگفتہ بنا دیتی ہے۔

20فروری1956ء

قائداعظمؒ کا دلکش کمرہ

آج مجھے زندگی میں ایک بہت بڑا اعزاز نصیب ہوا ہے۔ آج میں نے قائداعظمؒ کی ذاتی چیزوں کو دیکھا اور انہیں اپنے ہاتھوں سے درست کیا اور ایک ایک چیز میں اس عظیم انسان کا لمس محسوس کیا جس نے کبھی یہ سب چیزیں استعمال کی تھیں۔

محترمہ نے مجھے رات کہا تھا کہ کل صبح انہیں قائداعظمؒ کے کپڑے اور دوسری چیزیں کھول کر دیکھنا ہیں لہٰذا تم میری مدد کے لئے آ جانا۔

میں نے اسی وقت خوشی اور مسرت سے بے قابو ہو کر کہا کہ میں صبح ناشتے کے فوراً بعد ضرور آؤں گی۔

آج دس بجے ہم نے قائداعظمؒ کے کمرے کھولے۔ دو نوکر اور محترمہ خود ساتھ تھیں۔ بیڈ روم کھولا تو یوں لگا جیسے ابھی ابھی یہاں سے کوئی اُٹھ کر گیا ہے۔ سوائے اس کے کہ کمرہ بند ہونے کی وجہ سے گرد و غبار کی ہلکی سی تہہ موجود تھی کمرے کی ہر چیز نہایت قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ بستر بچھا تھا' بیڈ سائڈ ٹیبل پر لکھنے کے کچھ ضروری کاغذ' پین' چند کتابیں' ایش ٹرے' سگریٹ کیس اور ٹیبل لیمپ پڑا تھا۔ کونے کی میز پر ایک مختصر WRITING TALOP جس پر فائلوں اور کتابوں کے پلندے تھے۔ کئی پین' سیاہی کی دوات' پنسلیں' ربڑ ایش ٹرے اور کھلے خط پڑے

تھے۔ درمیان میں عنابی رنگ کا خوبصورت قالین کا ٹکڑا۔ دریچے کے پاس دو آرام کرسیاں' بیچ میں ایک چھوٹی میز' بستر پر ہلکے لیمن کلر کا بیڈ کور تھا اور پردے بھی ہلکے رنگ کے دبیز قسم کے تھے۔ سامنے ڈریسنگ روم تھا۔ ایک لمبی وارڈ روب میں قائداعظمؒ کے نہایت عمدہ سوٹ لٹک رہے تھے۔ ایک خانے میں درجنوں قمیصیں اور نکٹائیاں تھیں۔ ایک خانے میں رومال تھے اور جو سب کے سب ریشمی تھے اور زیادہ تر کریم کلر اور ہلکے پیازی رنگ کے تھے۔ ایک بڑے خانے میں لاتعداد بنیانیں اور جرابیں پڑی تھیں۔ سب سے نچلے خانے میں درجنوں کے حساب سے جوتے تھے۔ ہر رنگ اور ہر ڈیزائن میں۔ دوسری الماری کھولی تو اس میں تولیے اور بستر کی کچھ چادریں تھیں۔ قائداعظمؒ کے کمرے کے سامنے ایک مختصر سا برآمدہ تھا جس میں دو کرسیاں اور چند ایک چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ باتھ روم میں ہینگر میں تولیے لٹک رہے تھے۔ صابن دانیوں میں تین چار صابن رکھے تھے' نہانے کے لئے بالٹیاں بھی موجود تھیں۔ ایک طرف شیو (SHAVE) کا سارا سامان نہایت قرینے کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ میں ان چیزوں کو دیکھتی رہی------ بس دیکھتی ہی رہ گئی اور محترمہ سے کہا:

''آپ نے اتنی عمدگی اور نفاست سے قائداعظمؒ کی سب چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ یقین نہیں آیا کہ وہ اس دنیا میں نہیں------ یوں لگتا ہے کہ ابھی وہ اپنے کمرے میں آ جائیں گے''۔

مس جناحؒ نہایت افسردہ تھیں۔ ان کے چہرے پر آزردگی اور غم کے سائے پھیل رہے تھے۔ کہنے لگیں:

''میں اپنے قائد کے کمروں کو نہیں کھولتی' اس لئے کہ یہاں آ کر میں خود بے

حد اُداس ہو جاتی ہوں۔ لیکن کبھی کبھی ان کمروں کو کھولنا ضروری ہوتا ہے ورنہ سب چیزیں خراب ہو جائیں۔ میں اپنی زندگی میں اپنے محبوب قائد کی چیزیں خراب ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ گورنر جنرل ہاؤس سے ان کی وفات کے بعد جو سامان یہاں آیا تھا وہ سب میں نے ان کمروں میں جوں کا توں رکھ دیا ہے۔ یہ سب کمرے میں نے ان کے لئے مخصوص کر دیئے ہیں''۔

ہم نے سب چیزوں کو اچھی طرح جھاڑا اور پورے کمرے میں صفائی کی۔ چند کپڑے اور سوٹ باہر دھوپ میں پھیلائے۔ ان سب کمروں کے سامنے ایک کشادہ TERRACE ہے۔ ان کاموں میں کافی وقت لگ گیا۔ ہم لنچ سے پہلے سب چیزوں کو سمیٹ کر نیچے اُترے۔ گیارہ بجے کی چائے بھی اوپر ہی پی۔ مس جناحؒ ہمیشہ اس وقت خالی چائے کی ایک پیالی پیتی ہیں لیکن بیرے کو میرے لیے بسکٹ لانے کو ضرور کہتی ہیں۔ ہم نے قائداعظمؒ کے بیڈ روم میں ان کی کرسیوں پر بیٹھ کر چائے پی۔ میں خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ مجھے پوچھنے لگیں:

''اتنا کام کر کے تم تھک تو نہیں گئیں؟''

میں نے خود کو فوراً سنبھالتے ہوئے کہا:

''بالکل نہیں، بلکہ میں سوچ رہی ہوں کہ میری کتنی بڑی خوش قسمتی ہے کہ میں قائداعظمؒ کی کرسی پر بیٹھ کر چائے پی رہی ہوں۔ میں تو کبھی یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ مجھے یہ موقع بھی کبھی ملے گا''۔

کمروں کو مقفل کرنے سے پہلے اُنہوں نے مجھے دو ریشمی رومال اور ایک پنسل دی جو قائداعظمؒ کی اپنی چیزیں تھیں۔ میں نے ''شکریہ'' کہہ کر وہ دونوں چیزیں

لے لیں اور کہا کہ میں انہیں سنبھال کر رکھوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی ان چیزوں کی بہت ویلیو (VALUE) ہو۔ میرے لئے تو اب بھی وہ بہت بیش قیمت ہیں۔

قائداعظمؒ کی چیزوں میں ایک بہت خوبصورت عورت کی فریم میں لگی ہوئی ایک تصویر بھی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا:

''یہ کون ہیں؟''

کہنے لگیں: ''رتی کی تصویر ہے، قائداعظمؒ کی بیوی تھیں۔ یہی ایک تصویر اس کی ہمارے پاس تھی جسے وہ ہمیشہ الماری کے ایک کونے میں بند رکھتے تھے''۔

24فروری 1956ء

رتی (مریم) کی محبت

آج گیارہ بجے کی چائے پر جب مس جناحؒ نے اپنی ساری ڈاک پڑھ لی اوراخبار وغیرہ بھی دیکھ لئے تو میں نے ان سے پوچھا:

محترمہ اس روز قائداعظمؒ کی چیزوں میں ان کی بیوی کی تصویر دیکھ کر مجھے بار بار یہ خیال آتا رہا کہ آخران کی یہ شادی ناکام کیوں ہوگئی؟''

بولیں: ''اس لئے کہ ان کے ذہنوں میں تضاد تھا' وہ لڑکی ان سے محبت ضرور کرتی تھی۔ اتنے امیر باپ کی بیٹی ہوکر وہ سب کوٹھکرا کر مسلمان ہوئی اور قائداعظمؒ سے شادی کی لیکن ان کے ساتھ نباہ نہ کرسکی کیونکہ وہ اسی رومانی دنیا میں رہنا چاہتی تھی جوممکن نہ تھا۔ پھر وہ کم عمر تھی اور قائداعظمؒ اس سے عمر میں کافی بڑے تھے اور طبعاً سنجیدہ مزاج تھے۔انہیں یہ باتیں ناگوار لگتی تھیں۔

''یہ عجیب بات ہے کہ اپنی مرضی کی شادی کے باوجود ان کے آپس میں اختلافات پیدا ہوگئے''۔

کہنے لگیں: ''یہی تو عجیب نہیں۔اس لئے کہ عورت کو ہمیشہ یہ سمجھ لینا چاہئیے کہ اس کا شوہر کس قسم کا ہے۔ سارے شوہر ایک سے نہیں ہوتے اور نہ ہی ساری بیویاں ایک سی ہوتی ہیں لیکن ایک بات ان میں مشترک ضرور ہے اور وہ یہ کہ انہیں ایک دوسرے کے احساسات کا خیال ضرور رکھنا چاہئیے۔قائداعظمؒ ایک عام آدمی نہیں

تھے۔بعد میں جب اُنہوں نے پوری قوم کی قیادت کا بیڑا اُٹھایا اور شب و روز مسلمانانِ ہند اور مسلم لیگ کے لئے کام کرنا شروع کیا تو ان کی زندگی بے طرح مصروف ہوگئی۔ وہ عورت چاہتی تھی کہ قائداس کے ساتھ روز باہر جائیں۔ ڈنرز اور دعوتوں میں شریک ہوں لیکن انہیں اب ان کاموں کے لئے بالکل وقت نہیں تھا۔اُنہوں نے بار بار اسے سمجھایا لیکن وہ یہی کہتی تھی۔ HE NEGLECTS ME۔حالانکہ یہ بات نہیں تھی۔ان کا نصب العین اور کام کی نوعیت ایسی تھی کہ اُنہوں نے اپنی زندگی ان باتوں کے لئے وقف کردی تھی۔ پاکستان حاصل کرنا اتنا آسان کام نہیں تھا۔ پھر مسلمانوں میں غداروں کی بھی کمی نہیں تھی۔ ہردم چوکس اور ہوشیار رہنا پڑتا تھا۔یہی بات ان کی خانگی زندگی کے تنازعے کا باعث ہوئی اور دونوں کی زندگی ناخوشگوار ہوگئی۔رتی واقعی ان سے محبت کرتی تھی۔ اس نے ان کے اس رویے کو اپنی محبت کی شکست سمجھا۔ بعد میں اسے ٹی بی ہوگئی اور 29 سال کی عمر ہی میں وہ مرگئی۔
قائداعظمؒ کواس کی موت کا بے حد رنج ہوا لیکن اُنہوں نے کسی پر جتایا نہیں''۔

''کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہ انہیں زندگی بھر نہ سمجھ سکی حالانکہ وہ ان سے اتنی محبت کرتی تھی''۔

کہنے لگیں: ''میں اس کو حقیقی محبت نہیں سمجھتی۔اگر اس کی محبت سچی ہوتی تو اسے اپنے شوہر کے عزائم' مقاصد اور دلچسپیوں سے بھی محبت ہوتی۔ایسی محبت تو خودغرض لوگوں کی ہوتی ہے۔ وہ خود پسند تھی۔ انہیں خود میں سمو دینا چاہتی تھی اور قائداعظمؒ کے سامنے اس سے کہیں بڑا نصب العین تھا اور وہ اپنے نصب العین کی قربانی نہیں دے سکتے تھے چنانچہ اُنہوں نے اپنی خانگی زندگی کو اپنے نصب العین پر قربان کردیا۔ ویسے مجھے اس بات کا بہت قلق ہے کہ وہ بہت تنہا آدمی تھے۔ میں مستقل

ان کے پاس آ کر رہنے لگی۔ ان کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھا لیکن مصروفیات کے باجود وہ بسا اوقات بہت تنہائی محسوس کرتے تھے۔ راتوں کو جب گھنٹوں وہ اپنے ڈیسک پر کام میں مصروف رہتے تو میں ان کے پاس جاتی اور کہتی کہ کافی دیر ہوگئی ہے اب جا کر سو جایئے تو کئی دفعہ کہتے: ''ابھی کچھ کام باقی ہے تم جا کر سو جاؤ۔ کسی وقت ڈانٹ بھی دیتے کہ کام میں انہیں ڈسٹرب (DISTURB) کیوں کیا۔ میں بار بار ان کے لئے دودھ کا گلاس لے کر جاتی اور یہ اصرار کرتی کہ پی لیں۔ کبھی مجھ سے لے کر میز پر رکھ دیتے اور کبھی واپس کر دیتے۔ ایک بار میں ناراض ہوگئی اور رونے لگی کہ انہیں اپنی صحت کا ذرا بھی خیال نہیں۔ یکدم نرم ہو گئے اور مجھے منانے لگے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ قائداعظمؒ کتنے نرم دل انسان تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر ان کا دل پسیج جاتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی شخصیت کا ایک پہلو نہایت تند، کرخت اور پرعزم تھا جس سے ملائمت نہیں ٹپکتی تھی''۔

قائداعظمؒ کی باتیں کرتے ہوئے مس جناحؒ ہمیشہ افسردہ ہو جاتی ہیں۔ شکر ہے ان باتوں کے دوران ہی سیکرٹری آ گیا کہ فلاں صاحب آج شام کے لئے ملاقات کا وقت چاہتے ہیں اور بات ختم ہوگئی۔ اس کے بعد مس جناحؒ باغ میں گئیں۔ ان کا کتا بھی ساتھ تھا۔ انہیں اپنا کتا بے حد پیارا ہے۔ رات کو ان کے کمرے کے باہر سوتا ہے۔ چھوٹی نسل کا یہ روسی کتا جس کا نام زرغون ہے ہر دم ان کے ساتھ رہتا ہے اور نئے آنے والوں پر خوب بھونکتا ہے۔ آج ہنستے ہوئے کہنے لگیں:

''کتا انسانوں سے زیادہ وفادار ہے۔ کم از کم اپنے محسن کو نہیں بھولتا------ پاکستانی تو اپنے محسن کو بھی بھول گئے ہیں جس نے انہیں ملک دلوایا اور وہ ایسے سب کام کر رہے ہیں جن کے لئے یہ ملک نہیں بنا تھا''۔

میں نے زرغون کا مطلب پوچھا۔ کہنے لگیں: ''زرغون پشتو زبان کا لفظ ہے ''سرسبز پہاڑی''۔

انہیں ملک کے شمالی حصوں میں فرنٹیر بہت پسند ہے۔ پٹھان بھی انہیں بہت اچھے لگتے ہیں۔ کہتی تھیں:

''ان میں کمزوریوں کے ساتھ خوبیاں بھی بہت ہیں۔ کم از کم وفادار تو ہیں۔ دوست کو دوست کہہ کر بات نبھاتے ہیں۔ اور لوگوں کی طرح نہیں کہ پارٹی بھی منٹ میں بدل لیتے ہیں اور وفاداری بھی''۔

باغ ہی باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے کہ محترمہ کا درزی آ گیا، زرغون کا کوٹ لے کر---- زرغون کو زبردستی کوٹ پہنایا گیا جو فٹ نہیں آیا۔ کہنے لگیں:

''تیسری بار اس کا کوٹ آیا ہے اور اب بھی ٹھیک نہیں''۔

میں نے کہا: ''میں اون کا بنا دیتی ہوں۔ ضروری نہیں کہ گرم کپڑے کا ہی بنایا جائے''۔

یک دم ہنس پڑیں۔ کہنے لگیں: ''ٹھیک ہے آج زرغون کے لئے اون خریدنے ELPHINSTONE STREET چلیں گے''۔

شکر ہے۔ آج انہیں وہ سویٹر پسند آ گیا جو میں نے ان کے لئے بنایا ہے۔ ہلکا گہرے رنگ کا پل اوور ہے۔ اوپر پلین ہے اور نیچے ڈیزائن ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ آج کل وہ یہی سویٹر زیادہ پہن رہی ہیں اور آنے والوں کو بتاتی ہیں کہ یہ سویٹر اس نے بنایا ہے اور میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے کہ میری بنی ہوئی چیز انہیں پسند ہے۔

27 فروری 1956ء

زرغون کا کوٹ

پاکستان کے ایک اعلیٰ افسر کی بیوی دو روز سے مس جناحؒ کی مہمان ہیں۔ ان کے شوہر میٹرو پول میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور وہ خود محترمہ جناحؒ کے ہاں قیام پذیر ہیں۔ سرکاری لوگوں سے ان کے مراسم نہیں بلکہ ان سے ملتی ہی نہیں۔ مس جناحؒ سے شاید ان کے ذاتی تعلقات ہیں لیکن یہ بیگم صاحبہ بہت ہی تیز' ہوشیار اور چالاک لگتی ہیں۔ نوکروں پر رعب' ہر کام میں دخل اور ہر بات پر بولتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ انہیں میرا گھر میں اتنا دخل بھی ناپسند ہے۔ اس لئے میں کل سے مس جناحؒ کے کمرے کی طرف کم جاتی ہوں۔ آج اُنہوں نے پوچھا تو میں نے بہانہ بنا دیا۔ وہ محترمہ جھٹ بولیں:

مس جناحؒ آج کل کی لڑکیوں سے کوئی کام ہوتا ہے؟ انہیں اپنے آپ سے فرصت نہیں، یہ کسی کے لئے کیا کریں گی؟

میں نے ان کے سراپے کا جائزہ لیا۔ اس عمر میں گہرے فیروزی کامدانی سوٹ میں ملبوس تھیں۔ گلے اور بانہوں میں بھاری زیور، چہرے پر میک اپ اور بغل میں پاندان ------- جانے محترمہ جناحؒ کو اس کی کون سی ادا پسند ہے ورنہ اس عورت میں تو ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی کہ ان جیسی بلند ہستی کا اس کے ساتھ میل جول ہو۔ شوہر پر بھی خوب حکم چلاتی ہیں۔ آج وہ بھی دوپہر کے کھانے پر یہاں تھے۔ ان کی

ڈاک آئی تو بیرے سے لے کر سارے خط خود کھولے اور میں دیکھتی رہ گئی۔ بیوی کے سامنے ان کے منہ سے بات بھی نہ نکلی۔ مس جناحؒ نے ہنستے ہوئے کہا:

''تم جیسی بیگمات ملک میں زوال لاتی ہیں۔ ہر بڑی حکومت کو دنیا میں تم جیسی عورتوں نے تباہ و برباد کیا۔ سرکاری ڈاک میں تمہارا کیا مطلب؟ تم کیوں کھولتی ہو؟''

جھٹ بولیں: ''مس جناحؒ آپ نہیں جانتیں۔ یہ کوئی کام نہیں کر سکتے۔ میں ان کی مدد کروں تو کام بنتا ہے۔ فضول باتوں میں وقت ضائع کرتے ہیں''۔

عجیب بے تکی باتیں کرتی ہے اور بڑی خونخوار آنکھوں سے مجھے دیکھتی ہے۔

شکر ہے' زرغون کا کوٹ اچھا بن گیا اور اسے اچھی طرح پورا آیا۔ محترمہ کو بھی پسند آیا۔ زرغون کا ماپ خورشید نے پھر لیا اور INCHES میں مجھے بتایا اور یہ بھی کہا کہ گردن پر بٹن لگاؤں اور نیچے بھی۔ آج وہ کوٹ پہن کر پھر رہا ہے اور دو بار میرے کمرے میں آیا ہے۔

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

28فروری1956ء

پائے اور خمیر کی روٹی

آج ایک اعلیٰ سرکاری افسر مس جناح کے ہاں آیا اور مالٹوں کا ایک کریٹ پیش کیا اور ملنے کی اجازت چاہی۔ محترمہ نے مالٹے واپس کرا دیئے اور ملنے سے انکار کر دیا۔ وہ کسی صورت بھی فروٹ واپس نہیں لیتا تھا چنانچہ محترمہ نے بیرے سے کہا:

''اسے کہو کہ اسے یہ جرأت کیسے ہوئی کہ میرے ہاں بغیر کسی قسم کے تعلقات کے فروٹ لے کر آنے۔ فروٹ سڑک پر رکھ دو اور واپس آ جاؤ''۔

میں نے کہا کہ محترمہ ہو سکتا ہے کہ وہ شخص واقعی آپ کے لئے دلی جذبات اور قدر و منزلت رکھتا ہو اور بڑی خوشی سے یہ معمولی سی چیز لایا ہو''۔

کہنے لگیں: میں خوب جانتی ہوں۔ یہ حکومت میری سی آئی ڈی کرتی ہے۔ یہ سنتری بھی جو پہرہ دیتے ہیں ہر بات اپنے افسروں کو بتاتے ہیں کہ آج مجھے کون ملنے آیا اور کون گیا۔ یہ نہیں جانتے کہ میں ان چیزوں سے ڈرنے والی نہیں ہوں اور مجھ پر ان کا ذرا بھر بھی اثر نہیں ہوتا۔ میں نے بہت دفعہ حکومت سے کہا ہے کہ میرے گھر سے گارڈ ہٹا دیں لیکن وہ صرف لوگوں کو دکھانے کے لئے یہ سب کچھ کرتے ہیں کہ حکومت قائداعظمؒ کی بہن کا کس قدر احترام کرتی ہے۔

قائداعظمؒ نے اپنا سب کچھ ٹرسٹ (TRUST) کو دے دیا ہے۔ لیکن میرے لئے اتنا رکھ دیا ہے کہ میں عزت سے اپنی زندگی میں گزارہ کر سکوں۔ میں ان کی کب پروا کرتی ہوں۔ یہ مجھے جانتے ہوئے بھی نہیں جانتے''۔

کل رات کھانے کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ صبح ہم ناشتہ ان کے ساتھ کریں' ورنہ پہلے ناشتہ روز ہمارے کمرے میں آتا ہے۔ ہم پورے آٹھ بجے ناشتے کے لئے محترمہ کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت وہ نیچے اُتری تھیں۔ ناشتے پر تیار ہو کر آئی ہیں۔ ناشتے پر پائے اور خمیر کی روٹی ہے۔ روز کی طرح انڈہ' ٹوسٹ وغیرہ نہیں تھا۔ کہنے لگیں:

''بمبئی میں ہم پائے ہمیشہ ناشتے پر کھاتے تھے۔ یہ قائداعظمؒ کا محبوب ترین ناشتہ تھا''۔

خمیر کی روٹی نہایت گرم اور عمدہ تھی۔ ہم لوگ پائے ہمیشہ کھانے پر سادہ چاولوں کے ساتھ کھاتے ہیں۔ ہم نے انہیں بتایا تو کہنے لگیں:

''تم روٹی سے کھا کر دیکھو تو چاول بھول جاؤ''۔

واقعی بہت لذیذ تھے۔ بڑا لطف آیا۔ خورشید نے انہیں بتایا کہ کشمیر میں اس طرح کبھی کبھی ناشتے پر ہریسہ اور نان کھائے جاتے ہیں۔ ہریسہ گوشت سے بنی ہوئی ایک خاص ڈش (DISH) ہے جو ساری رات پکتی ہے اور بہت محنت سے تیار ہوتی ہے۔ ہنسنے لگیں اور کہنے لگیں:

تم لوگ اپنی ساری انرجی (ENERGY) کھانوں پر لگا دیتے ہو۔ اس لئے ابھی تک آزاد نہیں ہو سکے''۔

فقرہ برمحل تھا اور گفتگو کے مطابق تھا' چنانچہ ہم خوب ہنسے۔ دوپہر کو سادہ چاول' دال' ایک سبزی اور سلاد تھا۔

زرغون آج کل کچھ بیمار ہے۔ روز ایک ڈاکٹر اسے دیکھنے آتا ہے۔ آج بے چارے کو انجکشن بھی لگا اور وٹامن سی کی گولیاں بھی ملیں۔

کہنے لگیں: ''مجھے آج پتہ چلا کہ بیرہ اس کے لیے گوشت کا سوپ بنانے سے پہلے سوپ پی کر پھر پانی ڈالتا ہے۔ سوچو جو قوم جانوروں اور بے زبانوں سے انصاف اور ان پر رحم نہیں کر سکتی وہ اپنے ہم وطنوں اور ملک سے کیا کرے گی؟ کتنی گھٹیا حرکت ہے''۔

2مارچ 1956ء

عورت کی معراج

باغ میں پھولوں کی بہار ہے۔چنبیلی کی بیلیں ہلکے زرد پھولوں سے لدی ہوئی ہیں اور فضا میں دلاویز مہک رچی ہوئی ہے۔ میں نے اور مس جناحؒ نے آج بہت سا وقت باغ میں اکٹھے گزارا۔ وہ اپنے مالیوں کو ہدایات دے رہی تھیں اور ان سب سے ان پیسوں وغیرہ کا حساب لے رہی تھیں جو بیج اور کھاد کے لئے انہیں دیئے گئے تھے۔ایک مالی ان سے تنخواہ میں سے ایڈوانس مانگنے لگا تو اُنہوں نے انکار کر دیا۔

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا: ”محترمہ، ہوسکتا ہے ضرورت مند ہو“۔

تو کہنے لگیں:

”یہ بہت غلط بات ہے۔ ایک دفعہ میرے نوکر نے اپنے باپ کی موت کا بہانہ کر کے مجھ سے پیسے لئے۔ ایک مہینے بعد ایک بوڑھا آدمی اُسے ملنے گھر آ گیا۔ میں اتفاقاً باہر سے آ رہی تھی۔ پوچھا، کون ہے؟ تو معلوم ہوا اس کا باپ ہے۔ میں نے اس نوکر کو کھڑے کھڑے نکال دیا۔ جو لوگ اپنی اغراض کے لئے اپنے باپ کو مردہ ظاہر کر سکتے ہیں ان کا کردار کیا ہوگا۔ اسی طرح میرا ایک ڈرائیور دو بار مجھ سے اس طرح پیسے لے گیا کہ اس کی بیوی زچگی کی حالت میں ہے اور بہت تکلیف میں ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔ اس لئے میں ایڈوانس نہیں دیتی کیونکہ اس بات کا اعتبار نہیں کہ یہ لوگ سچ مچ حاجت مند ہیں“۔

کتنی وزن دار دلیل تھی۔ میں چپ ہو گئی اور دل میں ہی ان کی تائید کی۔ مس جناحؒ مچھلی کی بے حد شوقین ہیں۔ تلی ہوئی، سالن میں، ہر قسم کی ہر دوسرے روز پکواتی ہیں۔ آج میں نے ان سے کہا کہ:

”اگر وہ پسند فرمائیں تو میں انہیں کشمیری انداز میں ساگ میں مچھلی پکا کر کھلاؤں؟“۔

کہنے لگیں: ”ضرور پکاؤ“۔

شکر ہے کھانے پر انہیں تیل میں پکا ہوا مچھلی اور ساگ بہت پسند آیا اور اُنہوں نے سادے چاولوں کے ساتھ بڑے شوق سے کھایا۔

اب کسی دن پنیر اور ٹماٹر کھلاؤں گی۔

مس جناحؒ کی دو بھانجیاں، بلکہ بھانجی کی بیٹیاں اکثر اپنے بچوں کے ساتھ یہاں آتی ہیں اور سارا دن ان کے پاس گذارتی ہیں۔ آج وہ بھی یہاں تھیں۔ ان میں سے ایک بچے کے لئے آیا کی بہت ضرورت ہے جو بہت کوشش کے باوجود انہیں نہیں مل سکی۔ اس بات کی شکایت کر رہی تھیں تو محترمہ کہنے لگیں:

”ماں بننا اتنا آسان نہیں ہے۔ آیا سے ویسے بھی تمہیں صرف مدد لینی چاہیے۔ بچے کا زیادہ کام ماں کو خود کرنا چاہیے۔ ابتدائی عمر میں بچوں کو ماں کی محبت اور توجہ کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ تم لڑکیاں بچوں کے کام سے آخر کیوں گھبراتی ہو“۔

وہ بولیں: ”آنٹی ان کی وجہ سے نہ ہم شام کو کہیں جا سکتے ہیں، نہ کوئی اور لطف ہے۔ آخر یہ کیا زندگی ہے“۔

جھٹ بولیں:

زندگی کی لذت کیا صرف باہر جانے اور لوگوں سے ملنے جلنے میں ہے۔ ہر

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

کام کا ایک اسٹیج ہوتا ہے۔ اس عمر کے بچوں کی ماؤں کو زیادہ توجہ ان کی طرف دینی چاہیے۔ باہر گھومنے پھرنے کے لئے پوری زندگی پڑی ہے''۔

پھر انہیں سمجھاتی رہیں کہ بچوں کے لئے ماں کا کردار کتنا اہم اور ضروری ہے اور اسی میں عورت کی معراج ہے۔ یہ رتبہ تو پیغمبروں کو نصیب نہ ہوا جو ایک ماں کو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور تم لڑکیاں ہو کہ ایک بچے کے کام اور ذمہ داری سے گھبرا رہی ہو۔

بی بی' یہ آخر کیوں؟

کھانے کے بعد محترمہ نے مجھے اپنی الماری کی چابیاں دیں کہ ان کے بیڈ روم سے جا کر الماری کھولوں اور فلاں خانے سے سو روپے کا ایک نوٹ لے آؤں۔ ڈرائیور کو پیسے دینا چاہتی تھیں اور پرس میں کم تھے۔ میں گئی' الماری کھولی۔ سو کا نوٹ لے لیا لیکن حیرت اس بات پر ہوئی کہ وہ سارا خانہ زیورات سے بھرا ہوا ہے۔ کئی انگوٹھیاں' گلے کی لاکٹ' ہاتھ کی چوڑیاں وغیرہ۔ میں گھبرا گئی۔ انہیں اس طرح زیور نہیں رکھنے چاہئیں۔ اتنی چیزوں میں سے اگر کوئی ایک ادھر سے اُدھر ہو جائے تو کتنی بری بات ہے۔

4 مارچ 1956ء

میرا امتحان

آج صبح ناشتے کے بعد مس جناحؒ نے اپنے سیکرٹری کے ساتھ خطوط اور دیگر امور کے سلسلے میں بہت کم وقت لگایا اور شاپنگ کے لئے چلی گئیں۔

الفنسٹن سٹریٹ میں اُنہوں نے گھر کی کافی چیزیں خریدیں اور کپڑے کی ہر ایک دکان پر گئیں۔ جلال دین اینڈ سنز سب سے بڑی دکان ہے۔ اپنی شلواروں کے لئے وہاں سے کچھ کپڑا خریدا اور چند سفید دوپٹے۔ ایک سبز بنارسی ساڑھی مجھے دکھاتے ہوئے کہنے لگیں:

''یہ تم لے لو' بہت خوبصورت ہے''۔

میں نے شکریے کے ساتھ انہیں کہا کہ مجھے ضرورت نہیں' اس لئے نہ لیں' لیکن دکاندار کو یہ کہہ کر کہ ''یہ ساڑھی بھی پیک کر دو'' خود دوسرے کونے میں چلی گئیں۔

دکاندار جب بل بنانے لگا تو میں نے اسے کہا کہ یہ ساڑھی بند نہ کرے۔ میرے لئے وہ لے رہی ہیں اور میں لینا نہیں چاہتی' چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ جب محترمہ ادائیگی کرنے لگیں تو سرسری طور پر مجھے پوچھا:

SO YOU DON'T WANT IT

''جی نہیں شکریہ۔ ابھی ضرورت نہیں''۔ بہرحال ہم لوگ گھر آ گئے اور بات ختم ہو گئی۔

آج رات کھانے پر لیڈی ہدایت اللہ بھی تھیں۔ کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے خورشید سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں:

"تم خوش قسمت ہو کہ تمہاری بیوی میں عام لڑکیوں کی طرح کسی چیز کا طمع اور لالچ نہیں ہے۔ میں نے دو بار اسے کسی اپنے کام سے اپنی الماری کھولنے کے لئے بھیجا تھا۔ ایک بار میں نے وہاں جان بوجھ کر پیسے رکھ دیئے تھے اور ایک بار زیورات۔ لیکن یہ بہت ایماندار ہے۔ آج دکان پر میرے کہنے پر بھی اس نے ساڑھی نہیں خریدی حالانکہ میں چاہتی تھی کہ یہ لے لے۔ مجھے یقین ہے کہ زندگی میں تمہیں اگر کبھی پبلک آفس (PUBLIC OFFICE) میں آنے کا موقع ملا تو تمہاری بیوی تمہاری بہترین معاون ثابت ہوگی"۔

میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ محترمہ ان باتوں سے میرا امتحان لے رہی ہیں۔ شکر ہے کہ مجھ سے کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوئی۔ ہر بات بڑی باریکی سے پرکھتی اور دیکھتی ہیں۔ اس ذکر سے انہوں نے تقسیم ہند سے پہلے کا ایک واقعہ سنایا کہ:

"ایک بہت ہی اعلیٰ عہدے پر فائز قائداعظمؒ کے خاص رفیق کی بیوی اتنی لالچی اور گھٹیا تھی کہ خود دوسرے سے مانگ مانگ کر تحفے تحائف لیتی تھی جو قائداعظمؒ کو بھی برا لگتا تھا۔ اس شخص کی وقعت اس کی بیوی نے اس قدر کم کر دی کہ اس آدمی سے بھی نفرت ہونے لگتی تھی۔ وہ شخص نہیں رہا لیکن اس کی بیوی کی حرکتوں میں کوئی فرق نہیں۔ اپنی ذاتی ضروریات کے لئے اس نے ہر بری عادت کا سہارا لیا اور ابھی تک باز نہیں آئی۔ عورت جب اتنی گر جائے تو پھر اس کی گراوٹ کی کوئی حد نہیں رہتی۔ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے"۔

میں نے کہا: "وہ آدمی اگر خود اتنا اچھا تھا تو اپنی بیوی کو راہ راست پر کیوں نہیں لایا؟ وہ کچھ تو اسے بدل سکتا تھا"۔

بولیں:

"وہ اسے کیا راہ راست پر لاتا' وہ خود ہی گھٹیا ہو گیا۔ وہ روپے اور عیاشی کے لئے گھٹیا حرکتیں کرتی تھی۔ یہ اقتدار کی ہوس میں لالچی ہو گیا۔ قائداعظمؒ کو معلوم ہو گیا تھا اور انہیں اس بات کا بہت رنج تھا کہ ان کا ایک خاص آدمی ان کے معیار پر قطعاً پورا نہیں اترا۔ اس شخص نے ایسی حرکتیں شروع کر دی تھیں کہ قائداعظمؒ کی زندگی ہی میں سارے اختیارات اس کے ہاتھ میں آ جائیں"۔

یہ صورتحال کتنی افسوس ناک ہے۔ دراصل اکثر لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے کردار مضبوط نہیں ہوتے اور وہ اپنی راہوں سے بھٹک جاتے ہیں اور پستی کی گہرائیوں میں گر جاتے ہیں۔

5مارچ1956ء

آئین کی اہمیت

آج شام مس جناحؒ کے ساتھ ہم ملیر گئے۔ محض ڈرائیو کی غرض سے۔ وہاں انہوں نے ہمیں قائداعظمؒ کی زمین کے پلاٹ دکھائے۔ ریتلی زمین تھی۔ میں نے ایسی ریتلی زمین پہلی بار دیکھی تھی۔ موسم بہت اچھا تھا اور ریت کے ذرے ہوا کے خوشگوار جھونکوں سے اُڑ اُڑ کر ایک ننھی منی آندھی کا احساس دلا رہے تھے۔ وہاں سے واپسی پر مس جناحؒ کے ساتھ ایک انگریزی فلم HELEN OF TROY دیکھی۔ مسٹر اور مسز اسلم خٹک جو ان دنوں ان کے مہمان تھے' بھی ان کے ساتھ تھے۔ سکرین پر تین ہزار سال پہلے کے یونان کو دیکھ کر مجھے یوں لگا گویا ہم بھی اس قدیم دنیا کے باسی ہوں-------- مجھے ساری GREEK MYTHOLOGY یاد آگئی۔

آج رات کھانے کے بعد مس جناحؒ ملک کے آئین کے بارے میں گفتگو کرتی رہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ملک کا آئین اب مرتب ہو جانا چاہیئے۔ ملک کے دستور پر ہر روز نئی بحث اور نئی تنقید ہوتی ہے۔ عوام کی اکثریت نے نئے دستور کا خیر مقدم کیا ہے لیکن مخالفت بھی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ معمولی ردوبدل کے ساتھ انہیں دستور پاس کر دینا چاہیئے۔ آخر کب تک ملک اس کے بغیر رہے گا۔

6مارچ1956ء

قائداعظمؒ کی لائبریری

آج ہم مس جناحؒ کے ساتھ کلفٹن گئے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کراچی آکر سمندر دیکھا ہے۔ کشمیر سے آنے کے بعد بھی ہم لوگ کبھی لاہور سے آگے نہیں گئے تھے۔ اس لئے کراچی میرے لئے بالکل نئی جگہ ہے۔ سمندر میں نیلے آسمان کی نیلاہٹ بہت دلفریب لگتی ہے اور موجوں کا زیروبم اور بھی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ آج واپسی پر مس جناحؒ مجھے پوچھنے لگیں:

"تمھیں بڑے شہر میں رہنا اچھا لگتا ہے؟"

میں نے فوراً کہا: "محترمہ رہنے کے لئے مجھے بڑے شہر پسند نہیں۔ بچپن سے میں عجیب باتیں سوچا کرتی تھی کہ ہمارا ایک گھر ہوگا۔ مختصر سا' کسی پہاڑی کے دامن میں' ندی کے اوپر' شور ارتعاش کی سرسراہٹ کے پاس۔ خوبصورت پھول ہوں گے' لہلہاتے کھیت ہوں گے"۔

ہنسنے لگیں اور بولیں: "کہاں گھر کا ایک شاعرانہ تصور-------- اور کہاں کراچی جیسی غیر شاعرانہ جگہ' جہاں سکون کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ تقسیم ہند سے پہلے یہ شہر ایسا نہیں تھا لیکن اب بڑا گنجان آباد ہو گیا ہے۔ تم ویسے ورڈز ورتھ (WORDSWORTH) کم پڑھا کرو۔ ان باتوں کو حقیقی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس روز تم اس کی کتاب پڑھ رہی تھیں"۔

درست کہتی ہیں محترمہ واقعی ورڈز ورتھ میرا محبوب شاعر ہے۔ آج قائداعظمؒ
کی لائبریری میں سے چند کتابیں میں نے اور لیں۔ ان میں سے WANNE
JAWENSON کی ایک کتاب THE SHAKESPEARS HEROINS میں نے آج
پڑھنا شروع کی ہے۔ قائداعظمؒ کی لائبریری میں سیاست کے علاوہ آرٹ، لٹریچر اور
فکشن (FICTION) پر بے شمار کتابیں موجود ہیں۔

راتیں بے حد خوشگوار ہیں۔ چاند خوب چمکتا ہے اور اس کی نقرئی کرنیں
اندھیرے میں چھن چھن کر ساری فضا کو منور کرتی ہیں تو بہت جاذب نظر لگتی ہیں۔ پتھر
کی بنی ہوئی یہ پرانی کوٹھی ایسی راتوں میں الف لیلیٰ کی کوئی داستان دہرا رہی ہوتی
ہے۔

8 مارچ 1956ء

امیر بہاولپور کی چائے

آج مس جناحؒ کے ساتھ ہمیں امیر بہاول پور نے شام کی چائے پر مدعو کر
رکھا تھا۔ امیر کی نئی یورپین بیگم کو دیکھا۔ ولی عہد بھی وہیں تھے۔ ان کے گلابوں کی
خوشبو سے معطر اور آراستہ کمرے میں ہم نے بڑی خوبصورت پیالیوں میں چائے پی۔
امیر بہاولپور گلاب کے بہت شوقین ہیں اور ان کے محلات میں ہر قسم کا، ہر
رنگ کا اور ہر ملک کا گلاب مل سکتا ہے۔ واپسی پر انہوں نے محترمہ کو گلاب کے پھولوں
کا بہت بڑا گلدستہ پیش کیا جس میں ہر رنگ کے پھول تھے۔

ان دنوں ملک کے آئین میں MERGER OF KARACHI
JOINT ELECTORATE سلسلے میں بڑی اُلجھنیں پیدا ہو رہی ہیں۔
رات کھانے کے بعد مس جناحؒ اور خورشید اس سلسلے میں طویل بحث کرتے رہے اور
میں ان کے چہروں کے اُتار چڑھاؤ دیکھتی رہی۔ کھانے پر آج مٹر، چاول، مرغی کا
سالن، مچھلی کے کٹلس اور رائتہ تھا۔ مس جناحؒ نے صرف چاولوں کے ساتھ رائتہ کھایا۔
انہیں چاولوں کے ساتھ رائتہ بہت پسند ہے۔ پھلوں میں امرود کی بے حد شوقین ہیں۔
امرود کے بیج نکال کر دونوں وقت ضرور کھاتی ہیں۔ کہنے لگیں:

''آج جب میں نے پھل خریدے تو اس دکاندار نے کہا'' یہ امرود نہیں مکھن
کے پیڑے ہیں'' اور واقعی یہ امرود بہت لذیذ ہیں''۔

9مارچ1956ء

قوالی کا شوق

آج رات مس جناحؒ کے ہاں ڈنر تھا۔ تقریباً پچاس افراد مدعو تھے-----

کھانے کے بعد قوالی کا پروگرام بھی تھا۔ مہمان ساتھ ساتھ اُٹھ کر جاتے رہے لیکن ہم لوگ دو بجے رات تک قوالی سنتے رہے۔ مس جناحؒ قوالی کی بے حد شوقین ہیں لیکن کہتی ہیں کہ:

''قوالی اسی صورت میں پسند آتی ہے جب کہ قوال اچھے ہوں''۔

کھانا نہایت عمدہ تھا۔ کئی ڈشیں اُنھوں نے میٹروپول ہوٹل والوں سے بنوائی تھیں۔ میزوں کی ترتیب اور نشست گاہوں کا زیادہ کام نوکروں کی مدد سے میں نے کیا اور پھول وغیرہ بھی میں نے ہی سجائے۔ امیر بہاول پور کے باغ کے گلاب اپنی بہار دے رہے تھے۔

شکر ہے، محترمہ کو ترتیب اور کام پسند آیا۔ مہمان دیر تک بیٹھے رہے اور مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔

10مارچ1956ء

پاکستان کا اصل مشن

آج محترمہ کو پاکستان مسلم لیگ کے صدر سردار عبدالرب نشتر ملنے آئے۔ صبح 10:00 بجے کے قریب میں ان کے بلانے پر ان کی چھوٹی نشست گاہ میں بیٹھی تھی جس کی کھڑکیاں نشست سے سامنے کے باغ میں کھلتی ہیں۔ محترمہ کے پاس جب زیادہ مہمان نہ ہوں اور وہ اپنے سیکرٹری کے ساتھ اکیلی کام کرتی ہیں تو اکثر یہیں بیٹھتی ہیں۔ یہاں وہ ایک دو روز کی ڈاک پڑھتی ہیں' اخباریں پڑھتی ہیں اور ضروری امور پر سیکرٹری کو ہدایات دیتی ہیں۔ کئی دفعہ باورچی کو بھی یہاں بلالیتی ہیں اور کھانے کے لئے بتاتی ہیں۔ ان دنوں وہ اپنے باورچی سے بالکل خوش نہیں۔ میمن ہے۔ گھی اور مصالحہ بہت استعمال کرتا ہے۔ بارہا کہا بھی ہے لیکن وہ عجیب سی اردو میں جواب دیتا ہے۔ ''گھی اور مصالحہ کے بغیر کھانے کا کیا لطف''۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے کبھی کبھی اس کا کھانا بہت پسند آتا ہے۔ کل دوپہر کے لئے اس نے سبزی کی بریانی پکائی تھی۔ میں نے پہلی بار ایسی بریانی کھائی۔ بڑی مزے دار تھی۔ ثابت آلو اور ثابت بینگن پڑے ہوئے تھے۔ ساتھ ثابت پیاز' کڑی پتہ کے ساتھ زیرہ کا ذائقہ بہت عمدہ تھا۔ یہاں میمن اور سندھی لوگ ایسی بریانی بہت کھاتے ہیں۔ اس روز بمبئی کے ایک صاحب کے ہاں ہمارا کھانا تھا۔ صرف ایسی بریانی تھی اور ساتھ دہی۔ لیکن اس میں گوشت بھی پڑا ہوا تھا۔ واپسی پر خورشید کہنے لگے کچھ بھی ہو کھانے میں اور ذائقے میں کشمیریوں کا کوئی مقابلہ

نہیں کرسکتا۔ نفاست سے پکاتے ہیں اور نفاست سے کھاتے ہیں۔

خورشید کو بھی اچھا کھانا کھانے کا نہ صرف بے حد شوق ہے بلکہ بہت اچھا کھانا پکانا بھی جانتے ہیں۔ مجھے اس روز بتا رہے تھے کہ انگلینڈ میں دوست احباب کو ایسے مزے مزے کے کھانے کھلائے ہیں کہ یاد کریں گے۔ بلکہ اپنی لینڈ لیڈی کے متعلق بتایا کہ اسے ہمارے کھانے اتنے اچھے لگے کہ باقاعدہ اس نے ان سے سیکھا اور ترکیبیں لکھ کر محفوظ کرلیں۔ لینڈ لیڈی کے ذکر سے خیال آیا کہ اس روز اس نے ہمیں شادی کا تحفہ بھیجا ہے۔ میرے لئے کچھ میک اپ اور ڈیکوریشن کے لئے چینی کی 6 پلیٹیں ہیں۔ ساتھ بڑا خوبصورت کارڈ ہے------ بعض لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ اچھے لوگوں کو نہیں بھولتے۔

بات کہاں چل نکلی۔ ذکر تو میں نے نشتر صاحب کا کیا تھا۔ سیکرٹری نے ان کی آمد کی اطلاع دی۔ مجھے انہیں دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اخبارات میں ان کی تصویریں تو بہت دفعہ دیکھی ہیں۔ اچکن کے ساتھ طرے دار پگڑی، بڑی بڑی مونچھیں، روشن پیشانی اور چہرے پر ایک عزم اور جلال۔ آج جب انہیں دیکھا تو اس سے بھی بہتر پایا۔ خوش شکل اور بارعب انسان ہیں۔ یہ بھی خدا کی دین ہے جسے نوازے۔ محترمہ کے ساتھ اُنہوں نے عقیدت سے جھک کر سلام کیا اور اُنہوں نے مسکراہٹ سے ان کا خیر مقدم کیا۔

اُنہوں نے محترمہ کو آئین کے متعلق اپنی رائے بتائی کہ وہ اس آئین سے مطمئن نہیں۔ نئے آئین کے تحت ملک کے سربراہ کے انتخاب کے متعلق حکومت نے مسلم لیگ سے کوئی مشورہ نہیں کیا اور مسلم لیگ ہی وہ پارٹی ہے جس کی جدوجہد اور

کوشش سے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے---------

محترمہ مسکرائیں اور کہنے لگیں: ''یہی تو حکومت نہیں چاہتی کہ جن اداروں اور لوگوں کا پاکستان کی تشکیل میں ہاتھ ہے' ان سے رائے لی جائے یا انہیں اہمیت دی جائے۔ انہیں تو وہ ختم کرنا چاہتے ہیں اور مستقبل میں ایسے رجحانات ملک کے لئے بڑے مہلک ثابت ہوں گے۔ لگتا ہے آثار اچھے نہیں۔ اب پرانے اور مخلص لوگ سب جانتے ہیں کہ قائداعظمؒ نے ہمیشہ اور صرف اسلامی سوشلزم کی حمایت کی۔ وہ جاگیرداری اور چند لوگوں کی اجارہ داری اور بے جا اہمیت کے سخت مخالف تھے اور ان ہی بنیادوں پر ملک کا آئین اور نظام چلنا چاہیئے۔ لیکن حکمران نشے میں سرشار ایسے نہیں سوچتے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ قائداعظمؒ کی ہر بات کو بھول گئے ہیں۔ ان قدروں کو بھول گئے جن کی وجہ سے پاکستان بنا۔ یہ ملک ایک عام شہری' ایک عام مسلمان کا ملک ہے۔ سب کو برابر کے حقوق یہاں ملنے چاہئیں۔ لیکن لگتا ہے ہر ایک کو اپنی دھن ہے' اپنی فکر ہے کہ وہ کسی طرح سے زیادہ سے زیادہ دولت کمائے' عزت حاصل کرے اور سوسائٹی میں اپنی حیثیت بنائے۔ دولت کمانا کوئی عیب نہیں بلکہ قائداعظمؒ نے اس کی حوصلہ افزائی کی کہ مسلمان تجارت کریں۔ لیکن اس کے بھی کچھ اصول ہیں۔

بنیادی باتوں کو قربان کردینا جن کے لئے یہ ملک بنا زیادتی ہے۔ پاکستان ایک عام انسان کا ملک ہے' غریب محنت کش کا ملک ہے جسے یہاں پورے حقوق ملنے چاہئیں اور کسی سفارش یا برتری کے بغیر اس کا حق ملنا چاہیئے۔ اس لئے تو قائداعظمؒ نے ہندوؤں کے ساتھ رہنا منظور نہ کیا بلکہ سیاسی تبدیلی اور رجحانات دیکھ کر کانگرس نے

انہیں متحدہ ہندوستان کا وزیراعظم بننے کی پیشکش بھی کی تھی۔ لیکن قائداعظمؒ ان دنیاوی باتوں کو جن کا سودا ضمیر سے ہوتا ہے بہت برا سمجھتے ہیں اور کبھی بھولے سے بھی ایسی بات ایسے فائدے کا نہ سوچا جس میں قوم کا مفاد مجروح ہو۔

لیکن حالات عجیب طرح بدل رہے ہیں۔ ملک اور قوم کی محبت جیسے کم ہو رہی ہے۔ اگر ایسا ہی ہوتا رہا تو مجھے لگتا ہے کہ چند سالوں کے بعد محبّ وطن لوگ بھی یہی کہیں گے کہ اپنوں کی ذلت سے تو ہندو کی غلامی بہتر تھی۔ حالانکہ ان باتوں کا یہ رد عمل نہیں ہونا چاہئیے۔ خدا نہ کرے ایسا ہو بھی''۔

میں نے کہا: ''محترمہ، ہم لوگ کیا کریں جنہیں پاکستان سے محبت ہے اور ملک کی بہتری اور عزت چاہتے ہیں''۔

کہنے لگیں: ''کام۔ کام اور محنت کی ضرورت ہے اور جذبے کی ضرورت ہے۔ ایسے لوگوں کا ساتھ نہ دیں جو عہدے یا پیسے کے لالچ میں آپ کو خرید لیں۔ لیکن بدقسمتی سے مسلمان قوم بک جاتی ہے۔ کمزور ہے۔ چند دنیاوی فائدوں کے لئے۔ دوسری اہم باتوں کی پروا ہمارے لوگوں کو نہیں رہتی لیکن مایوسی بھی ٹھیک نہیں۔ اچھے لوگ بھی ہم میں موجود ہیں۔ کم ہیں لیکن ہیں------ اچھے رہبر کی بھی ضرورت ہے۔ عوام ہمارے سادہ لوح ہیں۔ اگر واضح طور پر ان کی رہنمائی کی جائے تو برے نہیں۔ لیکن زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے اور دنیاوی فائدوں کے لئے سودے بازی کر لیتے ہیں۔ حکومت میں بھی تو اس وقت سودا بازی ہو رہی ہے۔ لیاقت علی خان نے ایسی ریت بنائی کہ اب وہ قومی کردار بن گیا ہے۔ لیاقت کو تو قائداعظمؒ کا ساتھ ملا تھا۔ حیرت ہے وہ کیسے بدل گیا۔ لیکن شاید وہ ایسا ہی

تھا۔ قائداعظمؒ کو بھی شاید معلوم تھا۔ لیکن تحریک پاکستان کے تقاضے کچھ ایسے تھے کہ ان باتوں کے لئے وقت نہیں تھا۔ پھر پرانے لوگ اگر اس طرح expose ہوتے تو دوسروں پر کتنا برا اثر پڑتا۔ بہر حال آئندہ اس ملک کو بہتر لوگ مل جائیں جس کے لئے اتنی تگ و دو ہوئی''۔

سردار صاحب کہتے تھے کہ سکندر مرزا جمہوریہ پاکستان کا بلا مقابلہ صدر تو منتخب ہو گیا ہے اور اس کا نام مسلم لیگ کے چودہری محمد علی، چندریگر، گورمانی، دولتانہ کے علاوہ ڈاکٹر خان صاحب، فیروز خان نون، اے کے فضل الحق نے بھی تجویز کیا۔ لیکن میں قطعی طور پر پارٹی کی جانب سے متفق نہیں۔ میں نے لاہور میں مسلم لیگ کے اجتماع میں صاف لفظوں میں کہا ہے کہ مسلم لیگ کو غیر مسلم لیگیوں نے ختم نہیں کیا بلکہ خود مسلم لیگی ہی اس کے انتشار کے ذمہ دار ہیں۔ آج جگہ جگہ لوگ حکومت پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اگر ہم لوگ منظم ہوتے اور مسلم لیگ کے فیصلوں کا خیر مقدم ہوتا جس طرح تحریک پاکستان کے دور میں ہوا تو آج یہ حالات نہ ہوتے''۔

محترمہ کہنے لگیں: ''جب تک حکومت کو عوام کی حمایت حاصل نہ ہو اور حکومت کو عوام نے نہ چنا ہو، حالات ایسے ہی رہیں گے۔ سکندر مرزا کو میں ذاتی طور پر جانتی ہوں۔ اس کا کوئی اصول نہیں۔ بہت ابن الوقت اور خوشامدی آدمی ہے۔ اپنی غرض کے لئے وہ کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔ پھر ساری زندگی ملازمت میں اس نے گزاری ہے۔ پبلک آفس کے لئے ایسا شخص ویسے بھی موزوں نہیں۔ پھر اس کی بیوی ناہید مرزا کا بھی اس پر بہت اثر ہے۔ وہ عورت تو مجھے غیر ملکی ایجنٹ معلوم ہوتی ہے۔ سکندر مرزا اس کی گرفت میں ہے اور اس کی عقل سے سوچتا ہے''۔ پھر میری

طرف دیکھ کر کہنے لگیں ''یاد رکھو دنیا کے عظیم رہنماؤں کے مقاصد میں اس کا بہت دخل ہوتا ہے۔ عورت مرد کی زندگی پر بہت اثر انداز ہوتی ہے اور مرد کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ اس لئے میں ہمیشہ کہتی ہوں کہ عورت کائنات کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ قدرت نے اسے اس خوبی سے نوازا ہے جو مرد میں موجود نہیں ہوتی بلکہ عورت کے لئے مرد احمق ہے۔ ان کی باتوں میں آجاتا ہے اور بار ہا اپنے مقصد سے ہٹ جاتا ہے۔ پھر ایک مرد جو پہلے ہی کمزور ہو وہ ایک عیار عورت کے سامنے بے دست و پا ہو جاتا ہے اور اسے پتہ بھی نہیں چلتا۔ قوموں میں ایسے بہت واقعات ہیں جب عورتوں کے زیر اثر مردوں نے ملکوں کی تقدیریں پستیوں میں دفن کر دیں۔ اس لئے تو میں ہمیشہ کہتی ہوں کہ عورت ملک اور معاشرے کی بہتری کے لئے سب کچھ کر سکتی ہے۔ اس کے لئے اس کا تعلیم یافتہ ہونا بہت ضروری ہے تا کہ اس کا شعور بیدار ہو اور وہ اپنی عقل اور سوچ سے فیصلے کرے۔ مردوں کے کہنے پر نہ چلے۔ مردوں کے ساتھ سوشل فنکشنز میں جانے سے عورت کی رول ختم نہیں ہوتی''۔

محترمہ بات کرتے کرتے موضوع اچانک بدل کر کسی دوسری بات پر بولنا شروع ہو جاتی ہیں۔ آج بھی عورت کے ذکر کے بعد فوراً کشمیر کا ذکر کر دیا۔ کہنے لگیں:

''اب سیٹو کانفرنس میں شرکت کے لئے برطانوی وزیر خارجہ نے صاف کہا ہے کہ ان کے خیال میں سیٹو کی وزارتی کونسل میں کشمیر کے مسئلہ پر غور کرنا مناسب نہیں۔ ساتھ ہی سیٹو معاہدے کے مطابق سیٹو سارے ممبر ممالک کی آزادی کا محافظ ہے۔ انگریز نے ہمیشہ ہندو کا ساتھ دیا ہے۔ یہ ایک سازش ہے جس کا احساس قائد اعظمؒ کو ہوا اور انہوں نے مسلمانانِ ہند کے لئے ایک الگ مملکت کی جدوجہد کی

اور کوئی طاقت' نہ کوئی حربہ، کوئی لالچ انہیں اپنے نصب العین سے ہٹا نہ سکا۔ لیکن ہمارے لوگ ابھی بھی انگریز اور ہندو کی چال کو نہیں سمجھتے۔ انہیں مسلمانوں سے چڑ ہے اور وہ انہیں پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے اور تم لوگ محب الوطنی کے جذبے کی بھی قدر نہیں کرتے اور ان کی باتوں میں آجاتے ہو۔ یہ نفرت نہیں اور نہ ہی انسان سے انسان دشمنی کا سوال ہے لیکن انگریز اور ہندو کبھی مسلمان کا دوست نہیں تھا اور نہ کبھی اس کا دوست بنے گا۔ بلکہ ہر موقع پر اسے زک پہنچانے کی کوشش ہی کرے گا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ پاکستان بن جانے سے ان کا مقصد پورا ہو گیا ہے جسے انگریز اور ہندو نے ابھی بھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔ گھر گھر اور ہر شہری کو یہ بتانا ہم سب کا فرض ہے کہ پاکستان کن اصولوں اور باتوں سے قائم رہ سکتا ہے۔ میں نے اس روز ایک درسگاہ میں بھی کہا تھا کہ اس محب الوطنی کے ساتھ ساتھ تعلیمی نظام میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے تا کہ ملک کا شہری ایک آزاد شہری کی سوچ اپنائے۔ ملک کے پڑھے لکھے لوگوں کو مل کر نظامِ تعلیم مرتب کرنا چاہئے۔ میں ڈرتی ہوں حکومت ایسا نہیں کرے گی۔ غلط لوگوں کو ایسے کاموں پر لگا دیتے ہیں جن کی انہیں قطعاً سمجھ نہیں ہوتی''۔

میں آج دن بھر سوچتی رہی کاش! ہم بانی پاکستان اور ان کی عظیم بہن کی کوششوں کو تہہ دل سے اپنائیں یہ ملک آسانی سے تو نہیں ملا۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں' آبادی کا اتنا بڑا تبادلہ ہوا' جو تاریخ میں کبھی نہ ہوا۔ خاندان ایک دوسرے سے کٹ گئے' لوگوں نے با دل نخواستہ اپنے آباؤ اجداد کے گھر چھوڑے۔ محترمہ اس دن باتوں میں سنا رہی تھیں کہ 1947ء کے شروع میں پنجاب کے کسی دیہات سے ایک ان پڑھ دیہاتی کا پوسٹ کارڈ قائد اعظمؒ کو ملا تھا' لکھا تھا: ''اے میرے قائد! ہندو اور

انگریز پر بھروسہ نہ کرنا۔ مسلمانوں کو ہندوؤں کے علاقوں سے پہلے ہی نکال لینا تاکہ وہ ان کا قتل عام نہ کریں''۔

ایک ان پڑھ دیہاتی کے دماغ میں ایسی بات آئی جو بڑے بڑے سیاست دانوں کے ذہن میں بھی نہیں تھی بلکہ قائداعظمؒ نے بھی نہیں سوچا تھا کہ آبادی کا تبادلہ ہوگا۔ اپنی مرضی سے پاکستان میں اگر کوئی آباد ہو یہ اس کی اپنی مرضی ہوگی۔ لیکن اس کے شہر میں یا علاقے میں صرف اس لئے اسے جان سے مار دیا جائے کہ وہ علاقہ اب ہندوستان کا تھا' کسی کے وہم میں نہیں تھا------- قائداعظمؒ کو مسلمانوں کے قتل عام کا بہت قلق تھا کیونکہ ان کے ذہن میں نہیں تھا کہ ایسا ہوگا۔

ہم نے اتنا کچھ کھو جانے پر بھی جھوٹی قدروں اور خود غرضی کو اپنا مقصد بنا لیا ہے۔ یہ باتیں تو قوموں کو ختم کر دیتی ہیں۔ محترمہ ٹھیک فرماتی ہیں کہ پاکستان بن جانے سے ہمارا مشن پورا نہیں ہوا۔ اصل بات تو اس ملک کی بقا اور استحکام کی ہے۔

11 مارچ 1956ء

پُر لطف مشاعرہ

آج رات بھی مس جناح کے ہاں ایک بڑا ڈنر تھا۔ سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ کھانے کے بعد مشاعرے کا پروگرام بھی تھا۔ کئی نامور شاعر تھے جنہوں نے اپنی غزلیں پڑھیں لیکن راجہ صاحب محمود آباد کے اشعار بڑے پُر لطف تھے۔ راجہ صاحب بہت پرانے مسلم لیگی اور قائداعظمؒ کے ساتھی ہیں۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان میں بہت کام کیا ہے۔ مس جناحؒ کے ہاں اکثر آتے ہیں اور گھنٹوں بیٹھے پرانی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ محترمہ کی طرح وہ بھی ملک کے حالات سے مطمئن نہیں ہیں۔

رات کا ایک بج رہا ہے۔ شام بڑی پُر لطف تھی۔ آج کھانے کے لیے میں نے بھنی ہوئی مرغیاں بنائیں اور ایک سویٹ ڈش بھی۔ اتنی بڑی دعوت کے لیے کوئی خاص چیز بنانا میرا نیا تجربہ تھا۔ شکر خدا کا' دونوں چیزیں اچھی بن گئیں۔ باورچی کے ساتھ صبح کافی وقت کام کیا۔ آج دوپہر کے بعد قائداعظمؒ کی کتابوں کو جھاڑا اور انہیں درست کر کے شیلف میں ترتیب سے رکھا۔

محترمہ جناحؒ کو بے ترتیب چیزیں بہت بری لگتی ہیں۔ ان کی سٹڈی کے دوران میں ان کی میزوں پر کاغذوں' خطوں اور اخباروں کا ڈھیر لگا ہوتا ہے اور میں انہیں ہمیشہ ٹھیک کر دیتی ہوں۔ وہ یہ ضرور کہتی ہیں:

''کاغذ کو کسی ایسی جگہ نہ رکھنا' جہاں سے مل ہی نہ سکے۔''

اس تمام عرصہ کے دوران میں انہیں صرف ایک بار شکایت کا موقع ملا' جب
ان کا ایک ضروری لفافہ ادھر اُدھر ہو گیا۔ بہت ڈھونڈا لیکن نہ ملا۔ بعد میں ردی کے
کاغذوں سے مل گیا۔ خدا جانے' کس سے گرا۔ شاید مجھ سے ہی گر گیا ہو۔

محترمہ نے آج چار بجے کے قریب ایک کالج کے فنکشن میں بھی شرکت کی اور
صدارت کی۔ انہیں خیال نہیں رہا تھا کہ دونوں فنکشن اکٹھے ہو جائیں گے۔ صبح سیکرٹری
نے بتایا تو انہیں خیال آیا۔ ویسے مصروفیات کے باوجود وقت کی بہت پابند ہیں اور ہر جگہ
وقت پر پہنچتی ہیں۔ آج بتا رہی تھیں کہ ان کا نیا بیرا ابھی صبح سات بجے ان کے لیے بیڈ ٹی
لے کر نہیں آتا۔ اس لیے اس کے عمدہ کام کے باوجود وہ اسے رکھنا نہیں چاہتیں۔

12 مارچ 1956ء

کشمیر کا مسئلہ

آج صبح جب میں محترمہ کے پاس گئی تو اس مختصر سی سٹڈی میں جہاں وہ صبح کا
زیادہ وقت گزارتی ہیں اور ملاقاتیوں سے بھی ملتی ہیں' بہت سے جرنلسٹ بیٹھے تھے۔
میں سلام کر کے واپس آنے لگی تو انہوں نے کہا ''تم بھی آ جاؤ۔ دورِ حاضرہ پر باتیں ہو
رہی ہیں۔ تمہیں بھی دلچسپی ہو گی۔'' مارننگ نیوز' ڈان اور اُردو اخبارات کے نمائندے
تھے۔ اس وقت سینٹو کی وزارتی کونسل کے اعلان پر باتیں ہو رہی تھیں۔ انہوں نے
ڈیورنڈ لائن (پاک افغان سرحد) کا علاقہ سینٹو کے ممالک کے تحت ہونے کا دعویٰ کیا
ہے اور ساتھ ہی کونسل میں 48 وزراء خارجہ نے کشمیر میں اقوامِ متحدہ کی قراردادوں
کے مطابق رائے شماری کرانے کی حمایت کی ہے۔ ایک صاحب بولے:

''محترمہ! کشمیر میں اگر رائے شماری ہو تو فیصلہ ضرور پاکستان کے حق میں
ہو گا۔ لیکن بڑی طاقتیں شاید یہ نہیں چاہتیں۔''

وہ سنجیدہ ہو گئیں اور کہنے لگیں:

''یہ درست ہے لیکن ہمارے ہاں بھی با اثر لوگ یہ نہیں چاہتے کہ کشمیر کا
فیصلہ ہو اس لیے جب انہیں کہنے یا قوم کا دھیان کسی طرف لگانے کے لیے کچھ نہیں
ہوتا تو وہ کشمیر کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ چند لوگوں کو کشمیر سے صرف اس لیے
دلچسپی ہے کہ نشاط باغ کے پاس اپنی کوٹھیاں تعمیر کریں اور مہاراجہ کے محل پر ....۔

محمد طارق اقبال پاکستانی ڈائری ڈاٹ کام

افسوس تو یہ ہے کہ ہم سطحی باتوں میں تسکین اور خوشی ڈھونڈتے ہیں۔ اپنے فائدے اور آرام کا پہلے سوچتے ہیں' قوم یا اس کا مفاد ہمارے سامنے نہیں ہوتا۔''

میں نے کہا: ''محترمہ! یہ آخر کیسے ممکن ہے کہ صرف سطحی باتوں سے ہی دل کا سکون اور خوشی حاصل ہو اور کبھی بھی ضمیر ملامت نہ کرے۔ جب کہیں بات میں گہرائی نہ ہو تو خوشی حاصل کیسے ہو سکتی ہے۔'' کہنے لگیں: ''اپنے اپنے سوچنے کا انداز ہے۔ محب الوطنی اور اچھے لوگ جن کی کچھ قدریں ہیں ایسی باتوں سے ناخوش ہوتے ہیں جو محنت سے حاصل نہ کی جائیں اور جن کے حصول کے لیے اچھی قدروں کو پامال کیا جائے۔ لیکن ایسے لوگ ہم میں بہت کم ہیں۔'' پھر جھٹ ایک اخبار نویس سے مخاطب ہو کر بولیں: ''ایک تو تم لوگوں کا رول ٹھیک نہیں۔ غلط باتیں اخباروں میں لکھ کر عوام کو صحیح حالات سے باخبر نہیں رکھتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ پریس پر پابندی ہے لیکن تم اس پابندی کا فائدہ اٹھا کر صرف حاکمِ وقت اور حکومت کو خوش کرتے ہو۔ تمہاری بھی تو کچھ ذمہ داری ہے معاشرے کی طرف۔ کسی بھی ملک کا پریس آزاد اور منفرد سوچ میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ فری پریس اور ایماندار جرنلسٹ سیاست دانوں سے زیادہ ملک کی خدمت کرتے ہیں۔ تم لوگ بلا خوف لکھا کرو۔ اپنی رائے اور ایمانداری کی رائے سے عوام کو آگاہ کرتے رہا کرو۔ یاد رکھو! سچ کو آنچ نہیں اور پھر کردار بھی آخر دنیا میں کوئی چیز ہے۔ آپ بتا رہی تھیں کہ تحریکِ پاکستان کے زمانے میں اخباروں نے بہت خدمت کی۔ ان اخباروں میں ڈان سرفہرست ہے۔ اخبار تو لوگوں کے درمیان بہت بڑا لنک ہیں۔ انہیں ٹھیک ہونا چاہیے۔''

ایک صاحب بولے: ''محترمہ! کیا کریں خبریں سنسر ہو جاتی ہیں۔ ایڈیٹر بھی شاید مجبور ہوتے ہیں صاف گوئی سے منع کر دیتے ہیں......''

محترمہ پھر بولیں: ''پھر بھی تم لوگوں پر بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اتنی خوشامد کی آخر کیا ضرورت ہے۔ اپنا کام سچائی سے اچھی طرح کرو تو کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ پاکستان ان ہی باتوں کے لیے تو بنا تھا اور پھر یہ ہمارا اپنا ملک ہے یہاں کے لوگ اپنے ہیں۔ یہاں کی قدریں اپنی ہیں۔ جھوٹ اور بناوٹ سے ہم کیوں کام لیں۔ زیادہ لوگ اگر سچائی کا راستہ اختیار کریں تو رکاوٹیں کم ہو جائیں گی اور ایک آزاد پاکستان میں ہم نے ان ہی قدروں کو اپنانا ہے۔''

ایک صاحب' ایک ایڈیٹر کی شکایت کرنے لگے کہ انہیں حال ہی میں حکومت نے ایک بہت بڑا لائسنس دیا ہے اس لیے وہ بالکل حکومت کی پالیسی پر چلتے ہیں۔ جو رپورٹ حکومت کے حق میں نہ ہو اس کی خبر اخبار میں دینا ہی نہیں چاہتے۔ بارہا ہمیں سچی خبروں اور تنقید پر ٹوکا ہے۔

محترمہ کہنے لگیں: ''ایسا تو ہوتا رہے گا۔ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو خوشامد سے اپنے فائدے اور مطلب حاصل کرتے ہیں۔ سچ پر پردہ ڈالتے ہیں لیکن دوسروں پر نکتہ چینی کرنے کی بجائے اگر ہم اپنا عمل بہتر کر سکیں تو یہ ضائع نہیں ہوگا۔ نیا ملک ہے' نیا نیا لوگوں کو اختیار ملا ہے' حیثیت ملی ہے سارے توازن تو نہیں رکھ سکتے۔ لیکن ایسے لوگوں کو کامیاب نہیں ہونا چاہیے جو قوم اور ملک کے مفاد کا نہ سوچیں۔''

گفتگو کا موضوع اب مشرقی پاکستان کی طرف آ گیا جہاں متحدہ محاذ کی وزارت کی طرف سے اسمبلی کا پہلا اجلاس بلائے جانے پر باتیں ہونے لگیں۔ کچھ جرنلسٹ کہہ رہے تھے کہ حکومت شکست کھا جانے کے خیال سے خوف زدہ ہے۔ محترمہ بولیں:

''شاید اے۔ کے فضل الحق کو یہاں اس لیے گورنر بنایا گیا ہے کہ

مشرقی بنگال میں گورنرراج قائم کردیا جائے ۔ یہ سب برا ہوگا۔ بنگالیوں کے ساتھ اس طرح ہمیں کرنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ اتنے ہی محبّ الوطن ہیں جتنے مغربی پاکستان کے لوگ۔انہیں پاکستان سے محبت ہے۔ان سے برابری کا سلوک ہونا چاہیے۔''

محترمہ کی میز پر کل کراچی میں ایم سی سی اور پاکستان کے درمیان تیسرے غیر سرکاری ٹیسٹ میچ کا ایک دعوت نامہ پڑا تھا۔ انھیں تو دعوت نامے کو دیکھ کر بولیں''اسکندر مرزا بھی وہاں جا رہا ہے اور مجھے بھی مدعو کیا ہے۔ یہ لوگ آخر سمجھتے کیوں نہیں کہ چونکہ ان حکمرانوں کا کردار اور فعل صحیح نہیں' اس لیے میں انہیں سخت ناپسند کرتی ہوں۔اس لیے میں ایسی جگہوں پر نہیں جاتی جہاں پر یہ لوگ مدعو ہوں۔ مجھ پر پاکستان کی حکومت کڑی نظر رکھتی ہے کہ میرے پاس کون آتا ہے کون جاتا ہے۔ میں کہاں جاتی ہوں؟ یہ گیٹ پر جو پولیس ہے یہ بھی اسی غرض سے ہے۔ میں نے انہیں بارہا کہا ہے کہ پولیس کو یہاں سے ہٹالیں۔ مجھے حکومت کی حفاظت کی ضرورت نہیں۔ میرے لوگ میرے ساتھ ہیں لیکن صرف لوگوں کو دکھانے کے لیے باہر گارڈ رکھی ہوئی ہے تاکہ یہ کہہ سکیں کہ حکومت کو قائداعظمؒ کی بہن کا کتنا احترام ہے...... میں سب جانتی ہوں ان کی نیت کیا ہے۔''

دوپہر کے کھانے پر آج گڑ کے چاول بھی تھے جو محترمہ نے سویٹ ڈش کے طور پر کھائے۔ کہنے لگیں قائداعظمؒ بھی کبھی کبھی گڑ کے چاول شوق سے کھاتے تھے۔ آج دھنیے کی چٹنی سے انہوں نے چپاتی کھائی اور کوئی سالن ساتھ نہیں لیا حالانکہ گوشت سبزی تھی اور ساتھ ملی جلی سبزیوں کی بھجیا بھی۔ دہی کا رائتہ البتہ کھایا جو انہیں پسند ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ کشمیر میں چاول کے ساتھ دہی کے علاوہ دودھ بھی ڈال کر کھاتے ہیں۔ کہنے لگیں چاول کو ویسے بھی دنیا کے اکثر ملکوں میں کھایا جاتا ہے۔ چاول کھانے والی قومیں ذہین ہوتی ہیں۔

13 مارچ 1956ء

مطلق العنان شاہِ ایران

شاہ ایران اور ان کی حسین وجمیل ملکہ ثریا پاکستان میں ایک روز گزار کر آج واپس ایران چلے گئے۔ بیگم ناہید مرزا نے خواتین کے لیے ایک استقبالیہ دیا تھا۔ محترمہ کو بھی بلایا تھا۔ لیکن وہ ایسی جگہوں پر نہیں جاتیں جہاں حکومت کے اہم لوگ مدعو ہوں۔ اسکندر مرزا اور ناہید مرزا کے متعلق تو بارہا انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے کہ وہ ابن الوقت' خوشامدی اور بے ضمیر لوگ ہیں۔ وہ ناہید مرزا کے دیئے گئے استقبالیہ میں کیسے جاسکتی ہیں۔

میں نے شام کو دبی دبی آواز میں محترمہ کو کہا:''میرا اتنا دل چاہتا ہے کہ ملکہ ایران کو قریب سے دیکھوں۔ اتنی حسین عورت ہے اور پھر اس میں کچھ خاص بات تو ہے کہ شاہ بچے نہ ہونے کے باوجود دوسری شادی نہیں کرنا چاہتا۔ کوئی ایسی کشش' خوبیاں اور جاذبیت تو اس میں ہوگی جو شاہ عیاش ہونے کے باوجود صرف اس کے ساتھ رہتا ہے۔''

محترمہ کہنے لگیں:''میں ذاتی طور پر تو ملکہ کو نہیں جانتی لیکن شاہ جیسے شخص کے ساتھ کامیاب زندگی گزار رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ شاہ مطلق العنان اور ظالم حکمران ہے۔عوام سے بہت دور ہے۔ اپنی عیاشی اور فضول خرچی سے ہی اسے فرصت نہیں۔ صرف تیل کی وجہ سے ایران امریکہ کی ہر کمزوری اور بالادستی برداشت کرتا

ہے اور شاہ تو امریکہ کا بالکل پٹھو ہے۔ ملکہ بھی ضرور عیاش اور عیش وعشرت کی دلدادہ ہے ورنہ وہ اپنے شوہر کو جو ایران کا بادشاہ ہے' کچھ تو عوام کے قریب لائے۔ مرد عورت کے لیے کمزور واقع ہوا ہے اور جو عورت شوہر پر حکمرانی کرے اس کی چاہت اسے نصیب ہو' وہ بہت کچھ اس سے کروا بھی سکتی ہے۔ اسے راہ راست پر اگر لا نہیں سکتی لیکن کسی حد تک اس پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ملکہ بھی ویسی ہی مطلق العنان ہے۔ اسے بھی ایران کے لوگوں اور ملک کی ابتر اقتصادی حالت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بحیرہ کیسپئن میں وہ گرمیوں کا موسم گزارتی ہے۔ یورپ اور امریکہ چکر لگاتی ہے۔ لوگ اور ملک اس کے لیے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔"

میں نے کہا: "محترمہ! بادشاہت ہے جمہوریت نہیں اور مطلق العنان حکمران ایسی باتیں کب سوچتے ہیں۔" کہنے لگیں:

"بادشاہت اور ظالم کا زمانہ گزر گیا ہے۔ آزادی اور آزادیٔ نفس سے زندہ رہنے کی خواہش دنیا کے کونے کونے میں ابھر رہی ہے۔ ایسے لوگ کب تک آزادی کی روشنی کو اندھیرا سمجھتے رہیں گے۔ وقت آنے پر ساری بے انصافیوں کا حساب دینا پڑے گا۔ ظلم زیادہ دیر تک برداشت ہو ہی نہیں سکتا۔ اب پاکستان میں جمہوریت ہے لیکن ہمارے برسر اقتدار لوگ اپنے لحاظ سے مطلق العنان ہیں۔ لگتا ہے مغل بادشاہ برصغیر میں واپس آ گئے ہیں۔ پاکستان معرضِ وجود میں آ تو گیا لیکن اس کا یہ مقدر نہیں تھا۔ اور اگر یہ چیز ختم نہ ہوئی تو مطلق العنانی ایک سیلاب بن جائے گی جس میں جمہوریت دب جائے گی اور تحریکِ پاکستان کا مقصد فوت ہو جائے گا۔"

"ایک بات ہے" وہ یوں بولیں گویا موضوع اب کوئی دوسرا ہو۔ "بحیثیت بیوی وہ عورت بہترین ہے جو اپنے شوہر کی محبت اور ہمدردی کے ساتھ اس کی کمزوری اور کمی کا

بھی احساس دلوائے۔ عورت کو خواہ مخواہ لوگ کمزور سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ وہ بہت کچھ کر سکتی ہے' اس پر گھر کے سکون اور خوشی کا انحصار ہے۔ وہ اپنے حسنِ اخلاق اور سمجھ سے مرد کو ہر برائی سے دور رکھ سکتی ہے۔ عورت ملکہ ہو یا ایک عام عورت' وہ سوسائٹی کی بنیاد ہے۔ لیکن اس کا تعلیم یافتہ ہونا بہت ضروری ہے تاکہ اس میں شعور اور سمجھ پیدا ہو۔ کچھ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ دماغ روشن ہو' وسیع ہو اور وہ سوسائٹی کو بدل سکے۔

پھر امریکی وزیر خارجہ کے اس بیان کا ذکر کرنے لگیں جو آج کے اخبار میں تھا۔ نئی دہلی میں بھارتی وزیراعظم پنڈت نہرو سے ملاقات کے بعد اپنے اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ اس کے دورہ بھارت سے وہ تمام اختلافات مٹ گئے ہیں۔ کہنے لگیں: "ہمارے حکمران بین الاقوامی حالات سے بے خبر رہتے ہیں۔ مغربی ممالک پر کسی قیمت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور بھارت نے تو ابھی تک ذہنی طور پر پاکستان کا وجود تسلیم نہیں کیا اور شاید کبھی نہیں کرے گا۔ دونوں مسلمانوں کے دشمن ہیں لیکن ہمارے لوگ آپس کے اختلافات میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ اپنی کرسی کی جنگ ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے پاکستان کا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے۔ آخر ایک عام شہری کا کیا قصور ہے جس کا ایسی رسا کشی میں کوئی ہاتھ نہیں۔"

میں نے کہا: "محترمہ! آخر اس کا حل کیا ہو گا ملک کا انتظام کیسے ہو گا' یہ تو ضروری ہے......"

کہنے لگیں: "سب حالات کے باوجود مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ تم لوگ کر سکتے ہو اپنی ذمہ داری سمجھ کر کرو۔ آخر دنیا میں جب انقلاب آئے اور بہتری ہوئی تو صرف چند لوگوں کی کوشش سے ہوا۔ اچھے لوگوں کی کمی تو نہیں ہے ہمارے ملک میں۔"

آج محترمہ رات کے کھانے پر عبداللہ ہارون کے ہاں جارہی ہیں۔ اس خاندان نے مسلم لیگ اور تحریک پاکستان میں ایک بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ ان کی بہت خدمات ہیں۔ جب وہ تیار ہو کر نیچے اُتریں تو میں انہیں دیکھتی رہ گئی۔ میں اور خورشید بھی اس وقت باہر جارہے تھے اور باہر ہی کھڑے تھے۔ انہوں نے گہرے رنگ کا ساٹن کا غرارا، گھیرے دار چھوٹی قمیض اور چوڑا اشفون کا ہم رنگ دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا جس پر اسی رنگ میں کروشے کی خوبصورت بیل بنی ہوئی تھی۔ بہت بارعب اور اچھی لگ رہی تھیں۔

میں جب سے یہاں آئی ہوں آج پہلی بار انہیں رنگ دار کپڑوں میں دیکھا ہے۔ روز وہ سفید لباس پہنتی ہیں۔ زیادہ تر ساٹن اور سلک کا ہوتا ہے۔ قمیض لمبی اور فراک نما ہوتی ہے۔ دوپٹہ سفید اور چوڑا جو انہیں بہت سجتا ہے۔ سر ڈھکا ہوا نہیں ہوتا۔ ایک ہاتھ میں دو سونے کی چوڑیاں پہنتی ہیں اور دوسرے میں گھڑی...... دائیں ہاتھ میں دو انگوٹھیاں بھی ہوتی ہیں۔ گلے میں سفید موتیوں کی مالا ہوتی ہے۔ بال چاندی کی طرح سفید ہیں لیکن بھاری ہیں اور بہت ان پر سجتے ہیں...... عجیب بات ہے کہ ان کے چہرے پر عمر کے باوجود ایک بھی شکن نہیں۔ صاف شفاف رنگت ہے اور عمر کا اثر ان کی جلد پر کہیں بھی نظر نہیں آتا۔

14 مارچ 1956ء

شیخ مجیب الرحمٰن

میں آج سیالکوٹ جارہی ہوں۔ اپنی بہن کی شادی میں شریک ہونے۔ ملک کے مغربی حصوں میں ان دنوں شدید بارش ہو رہی ہے۔ راولپنڈی اور پشاور کے درمیان گاڑیاں چلنا بھی بند ہو گئی ہیں اور پنجاب کے سارے شہروں میں بارش سے بہت نقصان ہوا ہے۔ محترمہ آج مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ کہیں راستے میں مجھے زیادہ رکنا نہ پڑ جائے کیونکہ کئی جگہ سے ٹرین کی پٹڑی اکھڑ گئی ہے۔ کہنے لگیں:

"اس سے تو انکار نہیں کہ ملک غریب ہے۔ ذرائع کم ہیں لیکن عوام کی بنیادی ضروریات پر خرچ تو کیا جاسکتا ہے۔ دراصل صرف ایک آدمی مجرم نہیں، سربراہ مملکت سے لے کر محکموں کے افسروں کا بھی قصور ہے۔ چند ایماندار ہیں، زیادہ ایسے ہیں جو بجٹ میں منظور شدہ رقوم اپنے ذاتی استعمال میں لے آتے ہیں۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ کوئی سڑک بن رہی ہو، کوئی پل تعمیر ہو رہا ہو یا کوئی سرکاری بلڈنگ زیر تعمیر ہو تو اس کی لاگت میں افسروں کے بنگلے بھی ساتھ تعمیر ہوتے ہیں۔ ٹھیکیدار بھی ردی کام کرتے ہیں۔ بھاری رقوم سے افسرِ اعلیٰ کو رشوت دینے کے باوجود ان کے پاس بہت پیسہ بچ جاتا ہے۔ اوپر سے نیچے تک ہم بے ایمان ہیں،

WE ARE CORRUPT FROM TOP TO BOTTOM.

شاید دنیا کی ساری برائیاں برصغیر میں ہی آ گئی ہیں۔ بے ایمانی دوسرے

ملکوں میں بھی ہوتی ہے لیکن پھر بھی کچھ معیار ہے۔ انسانی صحت اور انسانی زندگی تو وہ لوگ جنہیں ہمارے ملا کافر کہتے ہیں' بہت عزیز رکھتے ہیں۔ خدا اور اس کے رسول ﷺ کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل تو وہ ''کافر'' کرتے ہیں ہمارے لوگوں کے پاس تو صرف .... ہے اور اتنی بے ایمانی اور کام سے غفلت کے باوجود انہیں ذرا بھر احساس نہیں ہوتا۔ پاکستان ان باتوں کے لیے تو نہیں بنا تھا۔ جب تک ہمارا شعور بیدار نہیں ہوگا' ملک اور قوم کی حالت بہتر نہیں ہو سکتی۔ لیکن آخر یہ سب کچھ کیسے؟ یہاں تو سب اپنی نوکری اور فائدے کے چکر میں ہیں۔''

پھر آج کے اخباروں کا حوالہ دیتے ہوئے کہنے لگیں:

''اب مشرقی پاکستان میں اقتدار کی رسا کشی ہو رہی ہے۔ عوامی لیگ کے صدر مولانا بھاشانی اور جنرل سیکرٹری شیخ مجیب الرحمٰن دونوں نے آئین پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔ کہتے ہیں عوام کو دھوکا دیا گیا ہے بغیر کسی وجہ کے سیاسی لوگوں کو جیل میں ڈالا گیا۔ سب کچھ غیر جمہوری اور غیر اسلامی طور پر ہو رہا ہے۔''

میں نے کہا: ''محترمہ! یہ شیخ مجیب الرحمٰن کیسا آدمی ہے؟ اس کے بیانوں سے تو ایسا لگتا ہے کہ بہت محبِ الوطن ہے۔''

کہنے لگیں: ''یہ ٹھیک ہے' میں اسے ذاتی طور پر جانتی ہوں۔ اقتدار کا بے حد بھوکا ہے' اس کے حصول کے لیے وہ کسی چیز سے دریغ نہیں کرنے والا۔ اور اس شخص کی یہی بات مجھے سخت ناپسند ہے۔ ایک جمہوری ملک میں ایک جمہوری قدروں کے انسان کو اقتدار کا بھوکا نہیں ہونا چاہیے۔ قائداعظمؒ کی زندگی سب کے لیے ایک مثال ہے۔ انہوں نے آزادی کی جنگ لڑی۔ کبھی غلط فیصلے اور غلط لوگوں سے سمجھوتہ نہیں کیا

لیکن اقتدار حاصل کرنا ان کا مقصد کبھی نہیں تھا۔ یہ تو ان کا کردار تھا' ان کی انتھک محنت تھی کہ وہ برصغیر کے صفِ اول کے لیڈروں میں شامل ہیں۔ لیکن ان کے چند واضح اصول تھے انہیں کوئی نہیں خرید سکتا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن جیسے لوگوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ حکومت حاصل کرنے کے لیے ایسے لوگ بھارت سے بھی سمجھوتہ کر لیں گے اور انہیں کبھی احساس نہیں ہوگا کہ قوم نے ان پر اعتماد کیا ہے۔ ان کے بھی فرائض تھے کہ اس اعتماد کو دھوکا نہ دیتے......''

(آئندہ کے حالات نے محترمہ کی اس بات کو کتنا بجا ثابت کیا۔ وہ تو بہت سیاسی شعور کی مالک تھیں اور ایک اچھا سیاست دان آنے والے حالات اور واقعات کی پیش گوئی کر سکتا ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے عروج اور زوال کی کہانی کچھ ایسے ہی واقعات کی محرک ہے۔ اس کا سفاکانہ قتل بھی اقتدار کی رسا کشی کی داستان ہے۔)

کہنے لگیں:

''بنگالی اسے پسند ضرور کرتے ہیں لیکن بھولے اور سادہ عوام کیا جانیں اصل حقیقت کیا ہے؟ وہ دھان منڈی ڈھاکہ میں اس کا سادہ مکان اور سادہ طرزِ رہائش دیکھ کر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ قائداعظمؒ نے ہمیشہ بہت آرام دہ اور ٹھاٹھ کی زندگی گزاری۔ بے شمار نوکر اور مغربی طرزِ رہائش اپنایا لیکن کسی نے ان کی حب الوطنی پر شک نہیں کیا اس لیے کہ انہیں ملک اور قوم کا درد تھا۔ اور وہ سچے تھے' ان کی زندگی میں دکھاوا نہیں تھا۔ صرف سادہ زندگی' عوام دوستی اور محبِ الوطنی کے لیے ضروری نہیں ہوتی۔ البتہ وقتی طور پر اس سے لوگ بے وقوف ضرور بن جاتے ہیں۔ اب اس روز چند کشمیری میرے پاس آئے تھے۔ (میری طرف دیکھ کر مسکرائیں) چودھری غلام عباس

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

کی شکایت کر رہے تھے کہ ان میں قائدانہ صلاحیتیں نہیں ہیں۔ ساتھ ہی بتایا کہ ان کی زندگی بھی دوغلی ہے۔ کوئی ملنے چلا جائے اور کھانے کا وقت ہو تو کھانا اپنا وہیں منگواتے ہیں اور آنے والے کو بھی کھانے کو کہتے ہیں۔ صرف موٹے موٹے پھلکے اور چنے کی دال پکی ہوتی ہے۔ لیکن اندر جا کر وہ اچھا کھانا کھاتے ہیں۔ یہ صرف اپنی درویشی کا اظہار ہے...... ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ اچھی طرز رہائش اور آرام سے رہنا کیا ہم کو محب الوطن نہیں بناتا؟ بے کار کی سوچیں ہیں ہمارے لوگوں کی۔ گاندھی نے بھی ساری زندگی یہی کیا۔ مہاتما کا لقب اختیار کیا' کبھی پورا لباس جسم پر نہیں پہنا۔ مسلمان ہندو بھائی بھائی کا نعرہ لگایا لیکن قائداعظمؒ پر کبھی اس کی اس ''حقیقت'' کا جادو نہیں چلا کیونکہ اس کا عمل اور فعل اس کے متضاد تھا۔ بلکہ مجھے یاد ہے کہ قائداعظمؒ اس کے ننگے جسم سے گھن کھایا کرتے تھے۔ تقسیم سے پہلے جب گاندھی جناح مذاکرات ہوئے جس پر ساری دنیا کی نظریں لگی ہوئی تھیں اور وہ ناکام ہو گئے تھے۔ اس لیے کہ قائداعظمؒ پاکستان کے مطالبے سے ہٹنے کے لیے یا سودا کرنے کے بالکل حامی نہیں تھے۔ پریس کی نظریں ان پر لگی ہوئی تھیں۔ قائداعظمؒ حسبِ عادت اپنا بہترین سوٹ زیبِ تن کرتے تھے اور اچھی طرح تیار ہو کر جاتے تھے۔ گاندھی اس طرح دھوتی اور ننگے جسم کے ساتھ آتا تھا۔ قائداعظمؒ نے ان باتوں سے کبھی کسی کو متاثر نہیں کیا کہ انہیں آرام دہ زندگی' اچھا رہن سہن اور اچھا لباس کبھی اپنے مقصد سے دور بھی کر سکتا ہے۔ وہ سطحی اور غیر اہم باتوں سے کسی کو متاثر نہیں کرتے تھے۔ یہ ان کی فطرت میں نہیں تھا۔''

میں نے کہا: ''محترمہ! واقعی لوگ سطحی باتوں سے متاثر ہوتے ہیں لیکن یہ

طلسم زیادہ دیر تک نہیں رہتا' حقیقت چھپی نہیں رہتی۔'' محترمہ بولیں: ''اصل بات تو کردار اور عمل کی ہے۔ دوسری باتیں غیر اہم ہیں اور پھر اگر آپ اپنے مقصد اور اس کے حصول کے لیے ایمانداری اور سچائی سے کام لیتے ہیں تو کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔''

آج رات کھانے پر کچھ لوگ مدعو ہیں۔ راجہ صاحب محمود آباد بھی آ رہے ہیں۔ کھانے کے بعد وہ اپنے اشعار بھی سنائیں گے۔ شعر بھی کہتے ہیں اور شاعری سے انہیں بہت لگاؤ ہے۔ محترمہ کو بھی اچھے اشعار پسند ہیں۔ انگریزی ترجمے کی کتابیں ان کے پاس ہیں...... مشکل اُردو نہیں سمجھ سکتیں۔ اس دن مجھ سے غالب کے اس شعر کا مطلب انہوں نے پوچھا

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

شکر ہے زیادہ مشکل شعر نہ تھا ورنہ شاید نہ بتا سکتی۔ شاعری سے تو مجھے بھی بہت لگاؤ ہے لیکن خورشید کو تو عبور حاصل ہے۔ سارے اچھے شعراء کے دیوان انہیں زبانی یاد ہیں۔ اس روز بیگم نورالصباح کے ہاں مشاعرے میں ان کے بیٹے بیرسٹر ثمین خان جو لندن میں خورشید کے کلاس فیلو تھے' بتا رہے تھے کہ طالب علمی کے زمانے میں انگلینڈ میں چھٹیوں میں وہ ٹور کے لیے گاڑی چلاتے تھے اور خورشید سارا راستہ شعر اور نظمیں سناتے تھے۔

آج بڑی ڈائننگ ٹیبل پر کھانا ہوگا جو کھانے کے کمرے میں ہی ہے 24 لوگ بیک وقت بیٹھ سکتے ہیں۔ کھانا کھانے کا لطف تو بیٹھ کر ہی آتا ہے۔ مجھے تو ''بوفے'' بالکل پسند نہیں۔ کھانے کا لطف ہی نہیں آتا۔ اگر کبھی ایسے ڈنرز میں مجھے

جانا پڑے تو میں صرف سلاد اور ایک آدھ خشک گوشت کا ٹکڑا لیتی ہوں۔ باقاعدہ کھانا مجھے بہت مشکل لگتا ہے۔ بہرحال...... محترمہ نے ابھی مجھے یاد کروایا ہے کہ میٹرو پول میں فون کر کے پتہ کروں کہ APPLE PIE کا جو آرڈر انہیں دیا ہوا ہے' وہ وقت پر پہنچا دیں۔ فلیگ سٹاف کے بالکل سامنے میٹرو پول ہوٹل ہے۔ اس کے ساتھ دو سینما گھر ہیں۔ یہ سب تقسیم سے پہلے کے بنے ہوئے ہیں۔ آج ایک سینما گھر میں ایک شہرہ آفاق ناول (A TALE OF TWO CITIES) کی فلم لگی ہوئی ہے۔
ہمارا ارادہ جانے کا تھا' اب کل جائیں گے۔ مجھے تاریخی فلمیں بہت پسند ہیں۔ بہت کچھ یاد آ جاتا ہے جو ہمیں بھولنا نہیں چاہیے۔ تاریخ تو ہمیں سبق سکھاتی ہے...... صرف یاد رکھنے کی بات ہے۔

8 اپریل 1956ء

مقناطیسی شخصیت

کافی دنوں کے بعد ڈائری لکھنے لگی ہوں۔ اس لیے کہ میں اپنے والدین کے پاس سیالکوٹ گئی تھی جہاں 18 مارچ کو میری بہن کی شادی تھی۔ وہاں سب لوگوں سے ملاقات بڑی روح پرور تھی' لیکن دل کے کسی کونے میں یہاں گزارے ہوئے دن اور محترمہ کی پراثر شخصیت مجھے یاد آتی رہی۔

آج بہت دنوں کے بعد پھر فلیگ سٹاف ہاؤس کے اسی مخصوص کمرے میں یہ سطور لکھ رہی ہوں۔ میں آج پانچ بجے جہاز سے کراچی پہنچی۔ سیٹ عین وقت پر ملی تھی اس لیے خورشید کو اپنی آمد کی اطلاع وقت پر نہ دے سکی۔ جب ہوائی اڈے پر پہنچی تو مجھے لینے کے لیے کوئی نہیں آیا تھا' چنانچہ پی۔آئی۔اے کی بس میں خود ہی آ گئی جو میٹرو پول تک آتی ہے۔ فلیگ سٹاف ہاؤس یہاں سے بالکل سامنے ہے۔

یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ مس جناحؒ کو ہمارا تار دیر سے ملا۔ خورشید گھر پر نہیں تھے اور وہ خود مجھے لینے ایئرپورٹ پر گئی ہوئی تھیں۔ میرے پہنچنے کے کچھ دیر بعد وہ بھی آ گئیں۔ مجھے بے حد افسوس ہوا کہ انہیں اتنی زحمت اٹھانا پڑی۔ وہ حسب معمول مسکراہٹ اور خلوص سے ملیں اور مجھ سے میرے گھر والوں کی خیریت دریافت کرتی رہیں اور یہ بھی پوچھا کہ شادی کیسے ہوئی؟

یوں لگتا ہے جیسے میں اتنے دن یہاں سے نہیں گئی۔ خورشید گھر میں نہیں تھے۔ کچھ دیر بعد پہنچے اور مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ہم رات دیر تک کھانے کے بعد

محمد طارق اقبال پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

مس جناحؒ کے پاس بیٹھے رہے۔ بالکل یوں لگا جیسے میں یہاں سے کبھی غیر حاضر نہیں رہی۔

ضرور ان کی پُرکشش شخصیت میں ایسا مقناطیسی اثر ہے جو ان سے دور رہ کر ان کی کمی کا بری طرح احساس دلاتا ہے ورنہ ایسی باوقار اور پُررعب خاتون کی کمی یوں محسوس کرنا عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔

9 اپریل 1956ء

بنگالیوں کا احساسِ محرومی

آج شام محترمہ کی مختصر سی سٹڈی میں مشرقی بنگال اسمبلی کے چند ارکان آئے۔ غالباً پہلے سے ملاقات طے نہ تھی کیونکہ میں اور محترمہ گھر کی ضروری اشیاء کی خریداری کے لیے الفنسٹن سٹریٹ جا رہے تھے۔ ان لوگوں نے شاید آج ہی ڈھاکہ واپس جانا ہے۔ از راہ کرم محترمہ سے ملنے کی خواہش کی وہ فوراً مان گئیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ بنگالیوں کے لیے محترمہ بہت حساس واقع ہوئی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مشرقی پاکستان کی حکومت کا رویہ ان سے ٹھیک نہیں ویسے بھی ہزار میل کا فاصلہ مغربی اور مشرقی پاکستان میں حائل ہے۔ اتنا رابطہ نہیں جو دونوں حصوں کو ایک دوسرے سے بہت دور رکھے ہوئے ہے۔ پھر شکل وصورت میں بھی ان کو کمتر ہونے کا احساس دلایا جاتا ہے۔

وہاں کے مسائل اور غربت کا ذکر ہوتا رہا۔ پھر ایک صاحب نے دستور ساز اسمبلی میں بجٹ پر بحث کے دوران محترمہ کی توجہ ظہیر الدین احمد کے اس بیان کی طرف دلائی کہ ان کے خیال کے مطابق یہ بجٹ مغربی پاکستان کا ہے اور اس میں بنگالیوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور یہ حقیقت اور بھی تلخ ہے کہ ملک کی 60 فیصد آمدنی دفاعی سروسز کی شکل میں مغربی پاکستان کے عوام پر خرچ کی جا رہی ہے۔

محترمہ کہنے لگیں: ''انہیں اس بات کی نوعیت کا علم ہے اور مشرقی پاکستان والوں کا یہ الزام غلط نہیں۔ یہ لوگ جان بوجھ کر ایسی زیادتی کرتے ہیں اور پھر اتنا شعور

بھی نہیں' نیت بھی ٹھیک نہیں۔ فوج کی آڑ ضرور لیتے ہیں لیکن ان کا کوئی ارادہ بھارت سے جنگ کرنے کا نہیں۔ ویسے ہمسایہ ملکوں سے تعلقات ضرور اچھے ہونے چاہئیں۔ دونوں نئے ملک ہیں اور غربت کے علاوہ بے شمار مسائل سے دوچار ہیں۔ لیکن غربت کا تقاضا بھی تو کچھ ہے۔ ہمارے لوگ آخر بھارت کے سامنے گھٹنے کیوں ٹیکیں۔ اب اس روز چودھری محمد علی نے بھارتی حکومت کو سرحدوں کے تعین کے لیے مشترکہ کمیشن مقرر کرنے کی اپیل کی ہے۔ وزیراعظم کی حیثیت سے چودھری محمد علی پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں لیکن وہ تو وہی کرے گا جو اس کے مفاد کو Suit کرتا ہے۔ اسے ملک اور قوم کے وقار کا احساس کیوں ہو؟ پھر وہ سیاست دان نہیں' فنانس کا آدمی ہے۔ سیاست یا اس کے تقاضوں کو نہیں سمجھتا۔ پھر جس شخص نے ساری عمر سرکاری نوکری کی ہو' اس کے سوچنے کا انداز بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ خوشامد اور افسر کو خوش کرنے کی عادت جو پڑ جاتی ہے۔ ایسا آدمی اگر اس قسم کے عہدے پر آ جائے تو دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ لوگوں کی اکثر اپنی رائے نہیں ہوتی۔ دوسروں کے مطابق اور حالات کے مطابق خود کو بدلتے ہیں۔''

محترمہ سنجیدہ ہو گئیں اور دور خلا میں دیکھتے ہوئے بولیں: ''میں کبھی کبھی پاکستان کے متعلق نہایت اندھیرے مستقبل کا تصور بھی کرتی ہوں۔ حالانکہ ایسا نہیں سوچنا چاہیے اور خدا کرے ایسا نہ ہو...... اور محبِّ وطن لوگ کبھی پاکستان کو نقصان پہنچانے کی سازش پوری نہ ہونے دیں۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو کون آگے آنے دے گا۔''

ان لوگوں کے جانے کے بعد محترمہ نے مجھے کہا کہ قائداعظمؒ کے مزار پر چلتے ہیں۔ اچانک ہی انہوں نے یہ پروگرام بنایا۔ پہلے ارادہ نہیں تھا۔ میرے خیال میں

پاکستان کے مستقبل کے متعلق مایوس ہو کر وہ بانی پاکستان کے مزار پر جا کر ان یادوں میں کھو جاتی ہیں جو اس عظیم شخص کے ساتھ وابستہ ہیں اور جس کے حصول کے لیے انہوں نے زندگی داؤ پر لگا دی۔ محترمہ دکھی ہو جاتی ہیں ایسی باتیں سوچ کر۔ قوم کے لیے بے تحاشا درد ہے ان کے دل میں۔

راستے میں محترمہ پاکستان کے طویل سفر کی کہانی سناتی رہیں کہ کیسے اور کس طرح قائدؒ اور ان کے ساتھیوں نے آزادی حاصل کرنے کے لیے نہ دن دیکھا' نہ رات۔ بس ایک ان تھک جذبہ تھا۔ لگن تھی کہ پاکستان بنانا ہے۔ خلوصِ نیت سے کوئی کام کیا جائے جس میں لالچ نہ ہو' اپنی غرض نہ ہو اور نیک نیتی ہو تو قدرت بھی مدد کرتی ہے۔ حیرت ہے وہ نسل کیا ہو گئی جنہوں نے پاکستان حاصل کرنے کی جنگ لڑی۔

محمد طارق اقبال پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

11اپریل1956ء

قدرت اللہ شہاب کی شادی

آج دوپہر کو لیڈی ہدایت اللہ نے مس جناحؒ کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا تھا اور بھی بہت سی خواتین اور لوگ موجود تھے۔ ہم بھی گئے۔ بڑی پُررونق تقریب تھی۔

آج ہی قدرت اللہ شہاب کی شادی کا ڈنر بھی تھا جو حال ہی میں شادی کر کے اپنی دلہن کو ساتھ لائے ہیں۔ سکندر مرزا اور بیگم سکندر مرزا بھی آئے ہوئے تھے اور بے شمار سرکاری و غیر سرکاری لوگ بھی۔ مس جناحؒ کو بھی انہوں نے بلایا تھا لیکن وہ نہیں گئیں۔ وہ کسی ایسے ڈنر یا فنکشن میں نہیں جاتیں جہاں سرکاری حکام یا اعلیٰ افسر مدعو ہوں۔

12اپریل1956ء

بنیئے کی باریک چالیں

آج حسین شہید سہروردی محترمہ کے پاس آئے۔ وہ اس وقت دستور ساز اسمبلی میں حزبِ اختلاف کے لیڈر ہیں۔ قابل اور نڈر لیڈر ہیں۔ بہت باتیں ہوتی رہیں۔ محترمہ نے آئین، حالاتِ حاضرہ پر بہت کچھ کہا اور یہ بھی سمجھایا کہ حزبِ اختلاف کے لیڈر کی حیثیت سے ان کا فرض ہے کہ وہ سچ اور صاف گوئی سے کام لیں اور حکومت کے ان فیصلوں پر ضرور نکتہ چینی کریں جو قانون کے لحاظ سے یہ حق دیتے ہیں۔ غیر قانونی بات یا حرکت کسی حالت میں بھی مناسب نہیں۔ ڈر اور خوف کی ضرورت نہیں۔ پھر بولیں:

"یہ بات ضروری نہیں کہ کوئی سیاست دان صرف حکومت میں رہ کر ہی خدمت کر سکتا ہے۔ حزبِ اختلاف میں رہ کر بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ حکمرانوں پر صحت مند تنقید میں ذاتی غرض یا طمع نہ ہو۔ ہر لحاظ سے مناسب ہے۔ لیکن صرف یہ سمجھ کر حکومت پر تنقید کی جائے کہ ان کے پاس حکومت ہے اور ہمارے پاس نہیں، ایک ذاتی اور چھوٹی بات ہو جاتی ہے اور سارا مزہ ہی کرکرا ہو جاتا ہے۔ حکومت میں تو سب کا حصہ ہوتا ہے..... حکمران کا بھی اور مخالفوں کا بھی۔ جو بات ملک اور قوم کے مفاد میں بہتر ہے اس پر کھل کر بولنا چاہیے اور تنقید کرنا چاہیے۔ اس سے بھی کافی بہتری ہو سکتی ہے۔"

سہروردی صاحب کے جانے کے بعد کہنے لگیں:

''قابل بھی ہے یہ شخص اور ایماندار بھی۔ پیسہ بنانے کا اس کو لالچ نہیں، رنگین مزاج ضرور ہے۔ یہ اس کی ذاتی زندگی ہے لیکن ایک سیاست دان کی ذاتی زندگی بھی SCANDALS سے پاک ہونا چاہیے۔ قائداعظمؒ کی ساری جوانی میں کوئی SCANDAL نہیں۔ کوئی عورت حائل نہیں۔ رتی سے جب انہوں نے شادی کی' وہ تقریباً چالیس برس کے تھے۔ ان کی زندگی پاک اور صاف تھی۔ ایک مقصد تھا' اس میں لگے ہوئے تھے حالانکہ انہیں کیا کم مواقع تھے۔ پھر اس کے بعد بھی وہ اسی طرح اپنے مقصد اور اس کے حصول کے لیے دن رات کام کرتے رہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ جو چاہتے' کر سکتے تھے لیکن وہ بے انتہا SOLID کردار کے مالک تھے اور ان کے بدترین سیاسی حریفوں کو بھی ان کی زندگی کے متعلق کبھی کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ وہ آئینے کی طرح صاف اور شفاف تھی اور ایسا آدمی بہت نڈر ہوتا ہے جس کی ایمانداری' کردار اور زندگی کے ساتھ کوئی غلط بات منسوب نہ ہو۔''

گذشتہ دنوں حسینی والا بارڈر کے پاس بھارتی فوج کی فائرنگ سے جو پاکستانی شہید اور زخمی ہوئے ہیں ان کے متعلق محترمہ کافی فکر مند ہیں۔ تقریباً چار گھنٹے بھارتی افواج نے گولہ باری کی اور ان کے طیاروں نے بھی ہمارے علاقے میں پرواز کی۔ یہ سب باتیں بین الاقوامی معاہدہ کے خلاف ہیں۔ محترمہ نے فرمایا:

''ہندو نے کبھی پاکستان کا وجود تسلیم نہیں کیا اور نہ ہی وہ کبھی کرے گا۔ ہمارے لوگ احمق ہیں جو بنیے کی چالوں کو نہیں سمجھتے اور مرعوب ہو جاتے ہیں۔ جذباتی ہیں۔ پھر قوم اور ملک کے مفاد کا انہیں وہ خیال نہیں جو ہندو کو ہے۔ اب چودہری محمد علی نے پنڈت نہرو کو پیشکش کی ہے کہ دونوں ملک لڑائی نہ کرنے کا معاہدہ کر لیں۔ سرحدی

جھڑپیں تشویشناک ہیں۔ چودہری محمد علی سرکاری ملازم رہا ہے' نہرو پرانا سیاستدان ہے اور پھر عیار سیاست دان ہے جس نے پاکستان کی جنگ میں قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کی جدوجہد سے ہمیشہ اختلاف روا رکھا ہے۔ وہ دل سے خوش نہیں کہ یہ ملک بن گیا۔ وہ چودہری محمد علی کو ایسا چکمہ دے گا کہ اسے خود پتہ نہیں چلے گا کہ وہ کیسے بے وقوف بن گیا۔ میں جانتی ہوں کہ بھارت لڑائی نہ کرنے کا معاہدہ کبھی نہیں کرے گا اس لیے کہ ہندو چاہتا ہے کہ مسلمان اس سے ہمیشہ خوفزدہ رہے۔ بھارت اور پاکستان کے تعلقات بہتر ہونے پر مسلمان کو سکون مل سکتا ہے جو وہ نہیں چاہتا۔ آخر ہمارے کروڑ ہا مسلمان بھارت میں بستے ہیں' ان کی بہتری اور حفاظت بھی ہمارے ذمہ ہے۔ ان میں سے بہت ایسے بھی ہیں جو سچے پاکستانی ہیں لیکن بھارت میں رہتے ہیں۔ ہندو پاکستان میں برائے نام ہیں اور جو ہیں' بھارت ان کے لیے متفکر نہیں۔ وہ زیادہ تر سندھ میں ہیں جو کھوکھرا پار کے ذریعے راجستھان کے راستے بھارت میں آتے جاتے ہیں۔ کوئی پابندی ان پر نہیں نہ ہی انہیں کوئی پوچھتا ہے......''

بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کے ساتھ ایسا نہیں۔ وہ ہندو کے رحم و کرم پر ہیں' ان کی اقتصادی حالات کمزور ہے۔ وہ پسے ہوئے ہیں۔ اپنے گھر بار چھوڑ نہیں سکتے۔ ہندو کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتے کسی محاذ پر۔ یہ تو ہماری حکومت کا کام ہے کہ ان کے تحفظ کا بھی سوچے۔ ایک مضبوط پاکستان ان کا بہت بڑا سہارا ہے۔ پاکستان کی جنگ جب لڑی جا رہی تھی' قائداعظمؒ کی سوچ یہ نہیں تھی کہ آبادی کا اتنا بڑا تبادلہ ہوگا۔ یہ بھی ہندو کی عیاری ہے کہ کشت و خون کا ڈرامہ کھیلا جس میں لاکھوں جانیں ضائع ہوئیں اور آبادی کا اتنا بڑا تبادلہ مجبوراً ہوا۔

اب حالات یہ ہیں کہ ہمیں خود بھی مضبوط ہونا ہے اور بھارت کے مسلمانوں کا بھی خیال رکھنا ہے۔ ہمارے فرائض ہیں ان کی طرف...... لیکن ہم چشم پوشی کر رہے ہیں۔ ہماری حکومت کا تو یہ حال ہے کہ مغرب کی خوشامد میں لگے ہوئے ہیں۔ حکومت امریکی ایڈ بند ہو جانے کے خیال سے ہی وحشت زدہ ہو جاتی ہے۔ غریب' چھوٹے اور پسماندہ ملک بڑے ملکوں سے امداد لیتے ہیں لیکن جو رویہ اور طریقہ ہماری حکومت اپناتی ہے اس میں ملک کا وقار اور عزت کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔ حکومت کو اندازہ ہی نہیں کہ یہ لوگ کسی طرح ملک اور قوم کو نقصان پہنچاتے ہیں۔"

رات کھانے پر محترمہ کے چند ملنے والے مدعو تھے۔ بمبئی کے لوگ ہیں۔ اپنے عزیزوں کو ملنے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک صاحب بیرسٹر تھے جو بمبئی ہائیکورٹ میں پریکٹس کرتے ہیں۔ بتا رہے تھے کہ بمبئی میں سوسائٹی اور ماحول روشن اور کشادہ ہے۔ پنجاب اور دوسری جگہوں پر ایسا نہیں...... بمبئی میں ہندو مسلم کشیدگی نظر نہیں آتی۔ سب اپنے اپنے کام میں لگے ہیں اور بڑے شہروں والی مصروفیت اور افراتفری ہے۔ اب تو بھارت کے مختلف حصوں سے لوگ بمبئی آ کر بس گئے ہیں اور روزگار کی تلاش میں یہاں آ جاتے ہیں۔ تقسیم سے پہلے کا بمبئی اب بہت پھیل گیا ہے اور لگتا ہے اور پھیلے گا۔ پسماندہ علاقوں میں وہی فٹ پاتھوں پر خاندان بستے ہیں جن کی طرف حکومت کی کوئی توجہ نہیں۔ یا شاید کر ہی نہیں سکتے۔ اس لیے کہ بھارت کے مسائل بھی بے شمار ہیں۔ اس کے ساتھ وسائل کم ہیں اور آبادی کا مسئلہ بہت سنگین ہے۔ ساتھ ہی بے روزگاری بھی ہے۔ سوشل حالات بھی ایسے ہیں کہ ذات پات کا چکر بھی موجود ہے۔ اس وجہ سے بھی ہندو پھنسا ہوا ہے اور سارے مسائل سے نپٹ نہیں سکتا۔

13 اپریل 1956ء

ماہ رمضان کا اصل مقصد

آج یکم رمضان المبارک ہے۔ کل شب رمضان شریف کا چاند دیکھا۔ بارگاہ ایزدی میں دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے اور پھر میں محترمہ کو چاند کی مبارک باد دینے گئی۔ انہوں نے ہم سے پوچھا کہ ہم روزے رکھتے ہیں؟ صبح سحری ہمیں اپنے کمرے میں وقت پر پہنچ جایا کرے گی۔ یہاں اکثر نوکر بھی روزہ دار ہوں گے۔

مس جناحؒ رمضان میں ایک دو مرتبہ لوگوں کو افطار پر مدعو کرتی ہیں اور نوکروں کو سحری اور افطار کے لیے فالتو چیزیں دیتی ہیں۔ آج کہہ رہی تھیں:

"افسوس صرف اس وقت ہوتا ہے جو رمضان کے اصل مقصد کا کسی کو خیال نہیں ہوتا۔ ویسے فاقے سے ہوتے ہیں لیکن جھوٹ' فریب اور حرام کی کمائی سے پرہیز نہیں کرتے۔ ہر وہ کام کرتے ہیں جن سے نماز اور روزہ بے فائدہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اصل چیز سپرٹ (SPIRIT) ہے اگر وہی مفقود ہو تو دوسری باتیں اپنی اصلیت کھو دیتی ہیں۔"

15 اپریل 1956ء

مسئلہ کشمیر اور خودغرض سیاستدان

آج دوپہر کے بعد محترمہ کچھ دیر کے لیے حسبِ معمول سٹڈی میں آ کر بیٹھیں تو میں نے ڈرتے ڈرتے محترمہ سے پوچھا کہ گزشتہ دنوں اخبار میں میجر جنرل اکبر خان کا ایک بیان تھا کہ اگر پاکستان کے سابق برطانوی کمانڈر جنرل گریسی قائداعظمؒ کا یہ حکم مان لیتے کہ پاکستانی فوج سیالکوٹ کے راستے جموں پر حملہ کر دے اور مسئلہ کشمیر پیدا نہ ہونے دے تو حالات بہت مختلف ہوتے۔ کیا یہ سچ ہے؟

محترمہ کہنے لگیں:

''میں زیادہ نہیں جانتی۔ لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ 1947ء کے آخر میں کشمیر میں جو کچھ ہوا' قائداعظمؒ کافی حد تک اس سے لاعلم تھے۔ بلکہ بالکل نہیں جانتے تھے اور انہیں بہت افسوس تھا کہ بالکل بھونڈے اور UNORGANIZED طریقے سے ایسا قدم اٹھایا جس میں ذرا بھر سوچ سے کام نہیں لیا گیا تھا اور جس نے ملک کو سیاسی طور پر بہت مجروح کیا اور مسئلہ کشمیر پیدا کر دیا جس کا خمیازہ ہم ابھی تک بھگت رہے ہیں اور جانے کب تک ہماری نسلیں اس غلطی کی سزا بھگتیں گی۔ قائداعظمؒ ان دنوں شدید علیل تھے' صحت جواب دے گئی تھی' اعصاب پر فسادات اور نئے ملک کے مسائل کا بوجھ تھا۔ کام کی زیادتی تھی۔ لیاقت علی خان کو بھی بحیثیت وزیراعظم اس منصوبے کا علم نہیں تھا۔ قبائلیوں کا حملہ حکومت کے لیے بہت غیرمتوقع تھا۔ سرحد کے

پٹھان چند پرانے فوجیوں اور خان قیوم نے مل جل کر یہ منصوبہ بنایا تھا جو اگر طریقے سے مرتب کیا جاتا اور حکومت کی رضامندی اس میں شامل ہوتی تو شاید 1947ء میں ہی کشمیر آزاد ہو جاتا۔ لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ اس سے مسئلہ کشمیر پیدا ہو گیا اور بھارت کو موقع مل گیا کہ وہ اقوام متحدہ میں پاکستان کو حملہ آور ثابت کرے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ چند غیر ذمہ دار لوگوں نے بہت خودغرضی اور جلد بازی کا مظاہرہ کیا جس کا خمیازہ جانے کب تک پاکستان بھگتے گا۔ ایسی اہم باتیں اور اہم فیصلے اس طرح تو نہیں ہوتے۔ ویسے مسلح افواج میں غیر ملکی افسر نہیں ہونے چاہئیں۔ اب اس روز مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ کے ظہیر الدین احمد اور شیخ مجیب الرحمٰن نے بھی یہی مطالبہ کیا ہے اور بالکل ٹھیک کیا ہے۔ انہوں نے تو خود اسلحہ تیار کرنے کی اہمیت بھی بیان کی ہے۔ یہ سب باتیں درست ہیں۔ لیکن ان باتوں کا کیا جواب ہے جب اپنے ہی افسر' اپنے ہی سیاستدان اور فوجی ملک اور قوم کے مفاد کا ذرا بھر نہ سوچیں اور ایسی حرکتیں کریں جو ہمارے لیے باعثِ شرم ہوں۔ حیرت ہو گی کہ ہمارا موجودہ کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان جب مشرقی پاکستان میں کچھ عرصہ کے لیے ایک اعلیٰ فوجی منصب پر تعین تھا تو یہ خبریں آتی تھیں کہ وہ بھارت کے ساتھ سمگلنگ میں ملوث ہے۔ مشرقی اور مغربی بنگال کا بارڈر بالکل ملتا ہے۔ لوگ آتے جاتے ہیں۔ سامان بھی ادھر سے اُدھر آتا جاتا ہے۔ اتنی سختی نہیں ہوتی۔ جب سرحدوں کے محافظ ہی ایسی حرکتیں کریں گے تو دوسروں پر کیا گلہ ہے جن کے اختیارات بھی محدود ہیں۔''

میں نے کہا: ''محترمہ! آخر لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ کیا وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر ملک مضبوط نہ ہوا تو ان کا بھی ٹھکانہ نہ ہو گا؟''

کہنے لگیں: ''ایسے لوگ انتہائی خودغرض ہوتے ہیں۔ انہیں صرف اپنا خیال ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنے لیے جیتے ہیں اس سے آگے ان کی سوچ نہیں ہوتی۔ SELFISH ہوتے ہیں اور ذاتی فائدہ سامنے ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان کی قیادت بھی اس وقت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو سیاہ و سفید کے مالک بنے ہوئے ہیں لیکن انتہائی خودغرض اور حریص ہیں۔ کرسی کی حرص، روپے پیسے اور منصب کی حرص اور یہ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے ہر جائز اور غیر اخلاقی طریقہ بھی استعمال کرتے ہیں اور اس چکر سے کبھی نہیں نکلتے۔ بدقسمتی تو یہ ہے کہ ان کے کاموں اور سوچ کی وجہ سے ساری قوم ذلت اور پریشانی اٹھاتی ہے اور انہیں احساس تک نہیں ہوتا کہ ان کا اندازِ فکر قوم کو کتنا نقصان پہنچاتا ہے۔ عوام زیادہ تر جاہل ہیں انہیں کچھ سمجھ نہیں۔ تعلیم عام ہونی چاہیے تاکہ لوگوں میں شعور پیدا ہو لیکن ابھی تک اس سلسلے میں زیادہ کچھ نہیں ہوا اور نہ ہی حکمرانوں کی نیت ہے کہ تعلیم عام ہو۔ لوگ اندھیرے میں رہیں گے تو انہیں اپنی من مانی کرنے کا موقع ملے گا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ملاء کو زیادہ اہمیت نہ مل جائے کیونکہ جہالت سے لوگ مذہب کے کمزور سہارے لیتے ہیں اور قائداعظم نے کبھی پاکستان کو ایک مذہبی یا مولویوں کی ریاست بنانے کا تصور بھی نہیں کیا۔ ملک کے آئین کے لیے بھی ان کا ذہن بڑا واضح تھا۔ کہتے تھے ہمارے پاس قرآن ہے، ہمیں آئین بنانے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ افسوس کہ ان کی زندگی نے وفا نہیں کی ورنہ ملک کی واضح سمت راہنمائی کر سکتے تھے۔

محترمہ ملکی حالات کا جب اس طرح ذکر کرتی ہیں تو افسردہ ہو جاتی ہیں۔ انہیں ضرور دکھ ہوتا ہوگا کہ قائداعظم کی سوچ اور نظریے کے مطابق ہمارا ملک استوار نہیں ہو رہا۔ یہ ملک تو ایک عام آدمی، ایک عام مسلمان، ایک عام شہری کے لیے بنا

تھا۔ جس میں اس کے مفادات محفوظ ہوں گے اور وہ وقار سے زندگی بسر کرے گا۔ ابتدا تو اچھی نہیں۔ جانے آئندہ آنے والے سالوں میں کیا ہو۔ خدا کرے بانیِ پاکستان کے خوابوں کی تعبیر مایوس کن نہ ہو۔

آج شام ملاقاتیوں میں مسلم لیگی لیڈر ممتاز محمد دولتانہ اور ان کی بیگم الماس دولتانہ محترمہ سے ملنے آئے۔ میں باغ میں گلاب کے پھولوں کا گلدستہ اپنے کمرے کے لیے بنا رہی تھی کہ میں نے انہیں جاتے دیکھا۔ ان کے جانے کے بعد محترمہ تھوڑی دیر کے لئے چہل قدمی کرنے کی غرض سے باغ میں آئیں۔ میں بھی ان کے ساتھ چلتی رہی۔ کبھی کبھی واک کرتی ہیں ورنہ روز شام لمبی ڈرائیو کے لیے جاتی ہیں۔

محترمہ کو آج گلاب کے تختے بڑے جاذب نظر لگے۔ گرمی کی آمد آمد ہے۔ لیکن گلاب پر بہار ہے۔ تقریباً ہر رنگ کے گلاب ان دنوں باغ میں ہیں اور فضا میں گلاب کی بھینی بھینی مہک بسی ہوئی ہے۔ حال ہی میں ایک نیا مالی آیا ہے جو اپنا کام بڑا اچھا کرتا ہے۔ پھولوں کو دیکھ کر کہنے لگیں: ''نیا مالی ذمہ دار اور ایماندار ہے۔ یہ بھی تو ایمانداری ہے کہ ہم اپنا کام صحیح طرح کریں۔ جو بھی ہو، کام چوری اور ذمہ داری سے فرار حاصل کرنا بھی تو بے ایمانی ہے''۔

میں آج محترمہ کے متعلق سوچتی رہی کہ ان کی زندگی بھی کتنی ولولہ انگیز رہی ہے۔ کتنے لوگوں کو قریب سے جانتی ہیں، کتنے لوگوں کا باریکی سے جائزہ لیتی ہیں۔ کتنے لوگوں کا کردار سمجھتی ہیں۔ بے حد ذہین خاتون ہیں۔ ایک طویل عرصہ انہوں نے قائداعظم کی تنہائی بھی دیکھی ہے اور ان کی سیاسی مصروفیات بھی دیکھی ہیں۔ ان کی تگ و دو، سارے برصغیر میں تھکا دینے والے سفروں میں بھی ان کی ہم سفر رہی ہیں۔ ان لوگوں سے بھی ملی ہیں جو بیسویں صدی کے عظیم مفکر اور سیاست دان تھے۔ ایسے

سوشل ہنگاموں میں بھی شامل رہی ہیں جو انگریزوں کے دور کا ایک تابندہ دور تھا۔ زندگی کا وہ رخ بھی دیکھا ہے جس میں مسکراہٹیں تھیں، روشنیاں تھیں اور مصروفیت تھی۔ پھر اندھیرے بھی دیکھے ہیں جب سیاسی لحاظ سے حالات مایوس کن تھے اور قائداعظم اپنے موقف، اپنے مقصد کے حصول کے لیے انگریزوں اور ہندوؤں سے نبردآزما تھے۔ ہر جگہ ان کے ساتھ گئیں۔ یورپ اور انگلینڈ میں بھی قائداعظم اور ان کی بیٹی دینا جناح کے ساتھ چند سال گزارے۔ اور ایسے نشیب و فراز بھی دیکھے جن میں روشنی کی رمق نہیں تھی۔ لیکن قائداعظم ہار ماننے والے آدمی نہیں تھے۔ اپنی عظیم بہن کا ساتھ ان کے لئے ایک سہارے سے کم نہیں تھا۔ جب ہر موڑ پر، ہر آزمائش میں، ہر گھڑی میں انہوں نے اپنے اس بھائی کا ساتھ نبھایا جو مسلمانوں اور ایشیا کا ایک عظیم لیڈر بنا اور جو نڈر تھا، بے باک تھا، ایماندار تھا اور کسی قیمت پر کسی سے سودے بازی نہیں کرتا تھا، جسے جس کسی نے خریدنے کی کوشش کی وہ خود ہی شرمندہ ہوا۔ دونوں بہن بھائی عظیم تھے۔ خدا محترمہ کو زندگی دے اور وہ اسی ہمت اور جذبے کے ساتھ ہمارے حوصلے بڑھاتی رہیں۔

اس روز خورشید نے ان سے کہا تھا کہ قائداعظم کی سوانح عمری لکھنے کے لئے ان کی مدد بے حد ضروری ہے۔ جو وہ جانتی ہیں، کوئی بھی نہیں جانتا۔ انہوں نے ہامی تو بھری کہ وہ خورشید کے ساتھ کئی نشستوں میں اس اہم کام کو پورا کریں گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہر ایک لکھنے والے پر انہیں اعتماد نہیں۔ اس لیے وہ اپنے ذاتی مشاہدات اور تحریریں انہیں نہیں دینا چاہتیں۔ توڑ موڑ کر بات لکھ دیتے ہیں اکثر لوگ جس سے اصل مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بابائے قوم پر ہر کوئی کیسے لکھ سکتا ہے۔ ایک ایسے شخص پر قلم اٹھانا اور ایک ایسی تحریک کے متعلق لکھنا جو تاریخ میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے، اتنا آسان کام نہیں۔

خورشید سے آج کہنے لگیں کہ وہ ان اہم سالوں کے متعلق خود کیوں نہیں لکھتے جب وہ قائداعظم کے سیکرٹری تھے۔ تحریک پاکستان چند دنوں اور مہینوں کی تحریک نہیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ اصل کام اور تگ و دو تو 1940-47 تک ہوئی اور سب سے زیادہ کام 1944-47 تک ہوا۔ جب خورشید قائداعظم کے ساتھ تھے، انہیں واقعی یہ کام کرنا چاہئیے۔ وہ صحافی بھی ہیں۔ لکھ بھی سکتے ہیں اور ان پر یہ اخلاقی فرض بھی ہے۔ آئندہ نسلوں کے لیے انہیں وہ سب یادداشتیں محفوظ کر لینی چاہیں جن سے پاکستان معرض وجود میں آیا۔ پھر ابھی تو یادیں تازہ ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ باتیں اور یادیں مدھم بھی ہو جاتی ہیں۔ اس عمر میں یہ کام شروع کر دیں تو اچھا ہے۔

میں نے آج خورشید سے محترمہ کے ساتھ اس موضوع پر بات کرنے کے بعد کہا کہ میں بھی اس سلسلے میں ان کی کچھ مدد کر سکتی ہوں۔ کم از کم نوٹس لے سکتی ہوں۔ ہنستے ہوئے کہنے لگے ”تم اپنی الٹی سیدھی خبریں ہی لکھا کرو، یہ کام میں خود کروں گا“۔

اصل بات یہ ہے کہ گھر کی مرغی دال برابر۔۔۔ میں یقیناً مدد تو کر سکتی ہوں۔ محاورے بھی کتنے صحیح ہوتے ہیں بالکل واقعات اور لوگوں کے حسب حال!

کاش! خورشید یہ کام کریں! انہیں شروع تو کرنا چاہیے۔

16اپریل1956

قائداعظمؒ کی خواہش

امریکی فوجی امداد کے تحت کچھ جیٹ طیارے کراچی پہنچے ہیں۔ آج محترمہ کے پاس کافی لوگ آئے اور وہ اس موضوع پر بہت دیر تک بولتی رہیں۔ کہنے لگیں:

''امداد کے بغیر دورِ حاضرہ کی دنیا میں گزارہ کسی کا بھی نہیں اور پھر غریب پسماندہ اور تیسری دنیا کے ملک تو ضرورت مند بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ڈر اس بات کا ہے کہ امریکی امداد، ہمیں گداگر نہ بنا دے۔ اس لیے کہ ہمارے حکمران امداد لے کر قوم کی غیرت اور وقار کو مجروح کرتے ہیں۔ اس بات کا انہیں احساس نہیں کہ دوسروں کے سہارے جینے والی قومیں غیرت سے نہیں جی سکتیں۔ امداد لے کر صرف اس پر خود کو منحصر کرنا کوئی عقلمندی نہیں۔ اصولوں کا سودا تو نہیں ہونا چاہیے۔ امداد لینے کا بھی آخر ایک طریقہ ہوتا ہے۔

ایک صحافی نے مغربی پاکستان کے وزیرِاعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب کے مسلم لیگی لیڈروں کے ساتھ اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا کہ ''کیا یہ ان لیڈروں کا اس طرح سوچنا درست ہے کہ مخالف گروپ اور ایک پاکستان دشمن سیاسی شخصیت کو اتنا بڑا عہدہ دینے کا کیا مقصد ہے؟ سندھ میں بھی ایوب کھوڑو، میر غلام علی تالپور اور عبدالستار پیرزادہ مل کر ڈاکٹر خان صاحب کی مخالفت کر رہے ہیں اور وہ اپنے موقف میں سچے ہیں۔ جس آدمی نے کبھی تحریک پاکستان کی حمایت نہیں کی، اسے آخر وزیرِاعلیٰ کیوں بنایا گیا؟''۔

محترمہ کہنے لگیں: ''انسان کی وفاداریاں OVER NIGHT نہیں بدلتیں۔ ہر شخص کے ماضی کے کردار پر ہماری نظر ضرور رہنی چاہیے۔ ساری زندگی ایک شخص نے نظریہ پاکستان کی مخالفت کی ہے، قائداعظم کی مخالفت کی ہے، ان کی تگ و دو کی مخالفت کی ہے۔ ایسا شخص صرف ایک اعلیٰ منصب کی خاطر ملک اور تحریک کا حامی کیسے بن سکتا ہے۔ یہی ہماری غلطیاں ہیں جو ہم بار بار کرتے ہیں اور مخلص اور دیانتدار لوگوں کو نہیں پہچانتے۔ تاریخ ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہے اور تاریخ ہی ہمیں راستہ دکھاتی ہے لیکن ہم سبق حاصل نہیں کرتے۔

ڈاکٹر خان صاحب کا سارا خاندان کٹر کانگریسی ہے۔ ان کے بڑے بھائی کو تو سرحدی گاندھی کا خطاب کانگریس نے دیا ہے۔ ساری زندگی گاندھی کے خاص چیلے رہے ہیں۔۔ تحریک پاکستان کی بھرپور مخالفت کی ہے، پھر اسی ملک میں رہتے ہیں اور وفاداری کانگریس اور بھارت کے ساتھ ہے۔ کانگریس کی تحریک جو ''اکھنڈ بھارت'' کی تحریک تھی اور جس میں پاکستان کا وجود کا کوئی تصور نہیں تھا، ان لوگوں نے اس تحریک کے لیے انگریز کے دور میں جیلیں بھی کاٹیں، تکلیفیں بھی اٹھائی ہیں لیکن تحریک پاکستان سے ہمیشہ دشمنی کی ہے۔ ایک بار قائداعظم نے بہت تھکے ہوئے کہا تھا ''میں انگریزوں اور ہندوؤں سے اتنا خائف نہیں جتنا ان مسلمانوں سے جن کی ہمدردیاں کانگریس کے ساتھ ہیں اور جو کھل کر تحریک پاکستان کی مخالفت کرتے ہیں بلکہ صرف مخالفت ہی نہیں کرتے، ڈٹ کر زہر اگلتے ہیں۔ یہ خاندان گاندھی کے پیروکار رہے ہیں۔ کھدر پہنا اور ایک ہندوستان کا نعرہ لگایا۔ اب پاکستان میں رہتے ہیں لیکن بھارت کے چکر لگاتے ہیں۔ کیا کیا راز وہاں پہنچاتے ہیں کوئی نہیں جانتا۔ ایسے لوگوں پر تو کڑی نگاہ ہونی چاہیے۔ وہ اس ملک کے سگے نہیں، پھر انہیں ایسے

عہدے دیے جائیں جونہایت حساس ہوتے ہیں اور جن پر ایک ایسے شخص کا تقرر ہونا چاہیے جوکم از کم پاکستانی تو ہو اور پاکستان کے وجود کو تسلیم تو کرے۔ اب سندھ میں جی ایم سید ہیں۔ اس نے بھی ساری زندگی پاکستان کی بھرپور مخالفت کی ہے بلکہ وہ سندھ میں علیحدگی پسندی کی تحریک میں بھی پیش پیش ہے۔

اگر پاکستان میں صوبہ پرستی کا تعصب پھیلا تو یہ ملک قائم نہیں رہ سکے گا۔ صوبہ پرستی تو بہت مہلک ہے ہمارے لیے۔ پہلے ہی مشرقی اور مغربی پاکستان میں ایک ہزار میل کا فاصلہ حائل ہے، کلچر اور رہن سہن میں فرق ہے۔ پھر ایسے لیڈر جنھیں کھلی چھٹی ہے ان پر کوئی پابندی نہیں۔ اس تعصب اور صوبہ پرستی کو بڑھائیں گے اور یہ چیز پاکستان کو بہت نقصان پہنچائے گی۔ ویسے بھی نیا ملک ہے، غربت ہے، مسائل ہیں، وسائل کی کمی ہے۔ پھر ایسے رجحانات تو اور بھی خطرناک ہیں ہمارے لیے۔

حکمران آخر کیوں نہیں سوچتے! ان پر کچھ ذمہ داریاں ہیں اس منصب کی۔۔۔ قائداعظم کو پاکستان بننے کے بعد قدرت نے مہلت نہ دی۔ پھر ان دنوں شدید بیمار تھے۔ اعصابی کمزوری کا شکار تھے۔ اس عرصہ میں بھی وہ اس طرح کام نہ کر سکے جو وہ کرنا چاہتے تھے۔ مثلاً ان کا ارادہ تھا کہ مسلم لیگ کا ایک سیکرٹریٹ بنائیں گے، تحریک پاکستان کی ساری دستاویزات، تحریک کے سارے مراحل کا ذکر اور اس سفر کی کہانی پر وہاں کام ہوگا جس سے پاکستان حاصل کیا گیا۔ قابل اور وہ مسلم لیگی ورکرز یہاں تعینات کئے جائیں گے جو اس تحریک کے چشم دید گواہ ہیں اور جنھوں نے اس طویل اور کٹھن سفر میں قائداعظم کا ساتھ دیا۔ وہ تو پاکستان بننے سے پہلے کرنا چاہتے تھے لیکن کام کا بوجھ اتنا تھا کہ نہ کر سکے۔ بعد میں بھی کرنا چاہتے تھے لیکن مہلت نہ ملی۔ لیاقت علی خان کو علم تھا۔ ان کے ساتھ انھوں نے اس سلسلے میں صلاح مشورہ بھی کیا تھا۔ ان کا فرض تھا کہ بحیثیت پرائم منسٹر وہ یہ کام شروع کروا دیتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اب مسلم لیگ کے اہم ریکارڈز کے لیے میں فکرمند ہوں۔ وہ موجود ہیں لیکن طریقے سے انہیں جمع ابھی بھی نہیں کیا گیا"۔

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "محترمہ آپ کی موجودگی میں آپ سے بہتر کام کون کر سکتا ہے۔ مسلم لیگ کے ریکارڈز اور تحریک پاکستان کے متعلق آپ ذمہ کیوں نہیں اٹھاتیں۔۔ آپ نے تو قائداعظم کے ساتھ اس تحریک میں ایک بھرپور رول ادا کیا ہے۔ آپ سے بہتر تو اس کام کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتا"

فرمانے لگیں: "لیاقت علی خان نے کبھی مجھ سے کوئی مشورہ نہیں لیا تھا بلکہ کبھی زیادہ ملنے بھی نہیں آتا تھا۔ اس کی وجہ شاید اس کی بیوی ہو جسے میں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ لیاقت اور وہ دونوں اس بات کو جانتے تھے۔ میں کسی کو صرف چند ذاتی کمزوریوں کی وجہ سے ناپسند نہیں کرتی بلکہ اس کا پورا کردار اور عمل میرے سامنے ہوتا ہے۔ رعنا لیاقت علی خان کبھی بھی اس قابل نہیں تھی کہ اس پر اعتبار کیا جائے یا اسے اہمیت دی جائے۔ لیاقت علی خان پر وہ حاوی تھیں۔ لیاقت علی خان تقسیم سے پہلے مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری تھے اور اس دور میں وہ بہت اہم عہدہ تھا۔ تحریک کے لئے انہوں نے کام ضرور کیا لیکن قائداعظم کو بھی کچھ احساس ہو گیا تھا کہ اس اہم عہدے کے لیے کوئی ان سے بہتر آدمی ہونا چاہیے تھا۔ اس زمانے میں ایسا سوچا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ ہر لمحہ قیمتی تھا۔ ہر لحظہ کام تھا۔ مسلم لیگ میں اتنی بڑی تبدیلی سے لیگ اور تحریک متاثر ہو سکتی تھی"۔

پھر کچھ خلا میں دیکھتے ہوئے بولیں "پاکستان ان کے ساتھ مسلم لیگ کی ایک اچھی ٹیم نے حاصل کیا۔ وہ جانتے تھے لیکن ایک بار انہوں نے کہا جب پاکستان کا فارمولا مان لیا گیا کہ پاکستان میری بہن اور میرے سیکرٹری کی وجہ سے حاصل ہوا۔ سیکرٹری سے اُن کا مطلب "خورشید" تھا۔ سیکرٹری نے اس نوعمری میں بھی بہت محنت

سے تحریک کے لیے کام کیا اور قائداعظم کا اعتبار بھی حاصل کیا۔ اس لیے انہیں افسوس تھا جب وہ کشمیر جاتے ہی گرفتار ہو گیا تھا۔ مجھے انہوں نے کہا بھی کہ جب وہ واپس آئے اس کے لیے ضرور کچھ سوچنا۔ اس نے تحریک پاکستان میں ایک بھرپور کردار ادا کیا ہے اور میرے سیکرٹری کی حیثیت سے کبھی اس نے کام اور فرض میں کوتاہی نہیں کی اس لیے میں نے بارایٹ لاء کرنے کے لیے اصرار کیا۔ جب وہ واپس آیا۔ یہ اس کی خاطر قرض تھا جو ہم نے ادا کرنا تھا''۔

خورشید تو اس وقت موجود نہیں تھے جب وہ یہ باتیں کر رہی تھیں۔ لیکن میں تشکر کے جذبات سے معمور ہو گئی۔ بابائے قوم اور ان کی عظیم بہن کا ایسے سوچنا کتنا بڑا اعزاز ہے خورشید کے لیے اور میرے لیے بھی......

آج کی گفتگو بڑی جذباتی تھی۔ بہت لطف آیا اور میں نے تاریخ کی ان یادوں میں کھو گئی جب برصغیر میں آزادی کی جنگ لڑی جا رہی تھی اور قائداعظم اپنے مخلص ساتھیوں کے ساتھ دن رات اس میں مصروف تھے۔ ان کے مخلص ساتھیوں میں سب سے اہم نام تو محترمہ فاطمہ جناحؒ کا ہے جو اس تحریک کی روح رواں ہیں۔

ہماری حکومت کی تو بدبختی ہے کہ کسی نے انہیں وہ مقام نہیں دیا جس کی وہ اہل ہیں۔ ان کی باتیں تو تاریخ کا حصہ ہیں۔ انہیں محفوظ کر لینا چاہیے تا کہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے تحریک پاکستان کے حوالے سے ان کی شخصیت زندہ جاوید رہے۔

آج ساری باتیں میرے ذہن میں بسی رہیں۔ رات کھانے پر صرف ہم تینوں تھے۔ محترمہ اور خورشید سیاست پر بہت باتیں کرتے تھے۔ میں سنتی رہتی ہوں اور کبھی ہی کچھ بولتی ہوں۔ مجھے تو محترمہ نے کچھ کچھ سیاست دان بنا دیا ہے اس لیے کہ میری دلچسپی ملک کی سیاست میں بڑھتی جا رہی ہے۔ تاریخ کی طالبہ کی حیثیت سے

مجھے ویسے بھی سیاست میں دلچسپی ہے کیونکہ تاریخ کو سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پھر ہمارے گھر کا ماحول بھی ایسا ہی رہا ہے۔ ایک روشن خیال اور پڑھے لکھے گھرانے میں میں نے آنکھیں کھولی ہیں۔ میرے ابا ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں، جنہیں ادب، سیاست، مذہب اور سب ایسی باتوں سے گہرا شغف ہے۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تربیت میں بھی دلچسپی لی ہے۔ ایسے ماحول، تعلیم اور پھر تربیت کا اثر انسان کی شخصیت پر ضرور پڑ جاتا ہے۔

لیکن محترمہ کے گھر کا ماحول بھی تو بڑا افسانوی ہے۔ وہ خود ایک عظیم شخصیت ہیں اور پھر ملک کے نامور سیاست دان، صحافی اور پڑھے لکھے لوگ یہاں ان کے پاس آتے ہیں۔ ہر موضوع پر باتیں ہوتی ہیں۔ بحث ہوتی ہے، نکتہ چینی ہوتی ہے۔ خواہ مخواہ انسان کا شعور بیدار ہوتا ہے اور کچھ جاننے اور سمجھنے کی صلاحیت جاگتی ہے۔

محمد طارق اقبال پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

17اپریل1956

اوپر سے نیچے تک انقلاب

آج کھانے کے بعد کشمیر کے مسئلے پر باتیں ہوتی رہیں۔ خورشید کہنے لگے "پنڈت نہرو نے پھر اپنا مطالبہ دہرایا ہے کہ ریاست کشمیر کی موجودہ سرحدوں کو دائمی قرار دے دیا جائے۔ حکمران خاموش ہیں۔ بھارت کی نیت کشمیر کے لیے ٹھیک نہیں"۔ محترمہ کہنے لگیں۔ "اصولی طور پر پنڈت نہرو کا یہ کہنا ہی غلط ہے۔ غیر جمہوری ہے۔ بھارت کے پرائم منسٹر کی حیثیت سے ایسا بیان غیر ذمہ داری بھی ہے کیونکہ وہ خود پارلیمنٹ میں اس بات کا اعتراف کر چکا ہے کہ کشمیر کا فیصلہ لوگوں کی مرضی اور رائے شماری سے ہوگا۔ اور بھارت کشمیر پر زبردستی قابض نہیں رہے گا۔ لیکن پنڈت نہرو ہمیشہ طفلانہ حرکتیں کرتا ہے۔ مدبر سیاست دانوں والی اس میں کوئی بات نہیں۔ ایک بات کہہ کر خود ہی اس سے پھر جاتا ہے۔ زبان بدلتا ہے اور الفاظ کا پاس نہیں رکھتا۔ یہ بات تو گاندھی میں بھی تھی۔ بارہا سیاست میں ایسے مواقع آئے کہ وہ کبھی کچھ کہتا اور کبھی کچھ۔ ایک تو ان کانگرسی لوگوں کے ذہن CONFUSED تھے۔ یہ مسلمانوں اور پاکستان کے لیے کبھی بھی نیک نیت نہیں تھے اور نہ ہی کبھی ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے پاکستان کے وجود کو ذہنی طور پر ابھی بھی قبول نہیں کیا اور نہ ہی کبھی کریں گے۔ ہندو بنیادی طور پر متعصب ہے اور وہ اس حصار سے باہر نہیں آ سکتا۔ یہ بات تو ہمیں سمجھنا چاہیے اور ہمارے حکمرانوں کو ذہن میں رکھنی چاہئے۔ مجھے

ڈر ہے کہ اگر ہم نے حالات کا صحیح تجزیہ نہ کیا اور ایک مضبوط حکومت پاکستان میں قائم نہ کر سکے جسے لوگوں کی بھرپور حمایت حاصل ہو تو کہیں ہم ان عارضی سرحدوں سے بھی محروم نہ ہو جائیں۔ بھارت تو ساری ریاست کا مالک بننا چاہتا ہے۔ یہ جو 4ہزار مربع میل کا آزاد کشمیر کا علاقہ ہمارے پاس ہے اسے وہ بھی کھٹکتا ہے اور اس علاقے میں ہماری حکومت نے منسٹری آف کشمیر کے ذریعے کلرکوں کی حکومت قائم کی ہوئی ہے جو قطعاً مضبوط نہیں ہے۔ چند افسر حکمران بنے ہوئے ہیں۔ صدر کے اختیارات بھی محدود ہیں اور منسٹری ہی سارے نظم و نسق کو چلاتی ہے"۔

خورشید نے میری تائید کی اور کہا "آزاد کشمیر حکومت واقعی پاکستان کے ایک جائنٹ سیکرٹری کے حکم سے چلتی ہے۔ کوئی وقار نہیں، کوئی حقوق نہیں۔ اور پھر وہاں بھی حکمران اپنی نااہلیت چھپانے کے لیے منسٹر کے ایک ادنیٰ کلرک کی بھی خوشامد کرتے ہیں۔ صدر ریاست جائنٹ سیکرٹری سے ملنے آتا ہے تو باہر انتظار کرتا ہے۔ کوئی عزت نفس نہیں"۔

محترمہ کہنے لگیں: "اوپر سے نیچے تک انقلاب کی ضرورت ہے۔ جب پاکستان میں حالات ایسے ہیں تو آزاد کشمیر میں ہم بہتری کی توقع کیسے رکھ سکتے ہیں۔ پاکستان جب بنا تو ان لوگوں کو جنہوں نے ملک بنایا، مل کر ایسا آئین اور منصوبہ بنانا چاہیے تھا۔ قائداعظم کو تو مہلت ہی نہ ملی۔ پھر نئے ملک کے مسائل۔ ہندوؤں کی چالاکی، مہاجرین کی بھرمار، آبادکاری کا مسئلہ، کام ہی کام تھے، دشواریاں ہی دشواریاں تھیں۔ ان کے بعد سب کو مل جل کر اس ملک کی بہتری کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کرنا چاہیے تھا۔ لیکن سب اپنی کرسی کے چکر میں پھنس گئے یا دولت اور عہدے سمیٹنے میں مصروف

ہو گئے حالانکہ میں ابھی بھی یہ کہوں گی کہ مسلم لیگ کے لیڈروں نے ناجائز طریقے
سے دولت نہیں حاصل کی۔ بس کچھ اچھے لیڈروں کی کمی سے یہ بحران ہوا۔ کچھ لوگوں
کی اپنی خود غرضی تھی اور کچھ ہماری کم عقلی۔ اور سب سے بڑی بات کہ ملک سے محبت
جب تک نہ ہو، نہ ہم خود اور معاشرے کو بہتر کرنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔ پھر ابھی
تک ہمیں یہ سمجھ نہیں آئی کہ ہندو بہت چالاک اور شاطر ہے۔ وہ بہت دور کی سوچتا
ہے۔ مسلمان احمق ہے پھر نیت اچھی بھی ہو تو آئندہ کا نہیں سوچتا۔ دیوار سے باہر اسے
نظر نہیں آتا۔ ہمارا عمل بھی بسا اوقات ایسا ہوتا ہے گویا ہماری ذات ہی اہم ہے۔ ملک
اور قوم اہم نہیں ہے۔ ایک عجیب بات ہم میں یہ بھی ہے کہ صرف ہمارے کرنے سے
کیا ہوگا۔ ہمارے سوچنے سے کیا ہوگا حالانکہ یہ منفی سوچ ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کی
سوچ، ہر ایک کا کردار قوم اور اس کے مفاد پر اثر انداز ہوتا ہے"۔

آج رات باتیں طویل ہو گئیں اور ہم دیر تک محترمہ کے پاس بیٹھے رہے۔
محترمہ ہمارے ساتھ دروازے تک آئیں اور شب بخیر کہہ کر جب ہم جالی دار برآمدے
میں آئے تو انہوں نے دروازہ کو اندر سے بند کیا۔ کچھ دیر ان کے قدموں کی چاپ سنائی
دیتی رہی۔ وہ مین گھر میں اکیلی ہوتی تھیں۔ اندر سے دروازہ بند کرتی ہیں۔ صبح ان کا بیرا
گھنٹی بجاتا ہے۔ وہ دروازہ کھولتی ہیں۔ وہ چائے اور اخباریں لے کر ان کی خوابگاہ میں
آتا ہے اور ایک گھنٹہ کے بعد وہ تیار ہو کر ناشتے کے لیے نیچے آتی ہیں۔

ایک دفعہ بتا رہی تھیں کہ انہوں نے چند بار عورت خدمت گار کو رکھا ہے جو
ان کے ساتھ والے کمرے میں سوئے۔ لیکن اس سے انہیں پریشانی ہی ہوئی کیونکہ
بارہا ایسا ہوا کہ رات کو نوکرانی وہاں نہیں ہوتی تھی۔ پھر نوکر اتنے زیادہ ہیں صرف ایک

عورت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ نچلے طبقے کی وہ عورت ویسے بھی غیر محفوظ ہے۔ نہ اسے
خود کوئی سمجھ ہے، نہ حالات اس کے لیے سازگار ہیں۔ نہ تعلیم ہے، نہ مالی حالت اچھی
ہے۔ چھوٹی عمر میں والدین اپنی بیٹیوں کی شادیاں کر دیتے ہیں۔ وہ جوان ہونے سے
پہلے بوڑھی ہو جاتی ہے۔ ساس، سسر، نندوں کا ظلم، خاوند کا رویہ، بچوں کی پرورش اور
غربت۔ اس طرح زندگی گزر جاتی ہے اور اس کا حل یہی ہے کہ معاشرہ بہتر ہو، تعلیم
عام ہو، مالی خوشحالی ہو اور ملک میں استحکام ہو۔ لیکن یہ سب کچھ کیسے ہوگا۔ انقلاب ہی
آئے تو بات ہے۔ اچھے حکمران ملک میں انقلاب لا سکتے ہیں۔ اس میں بھی تو وقت
لگے گا لیکن بات شروع تو ہو۔۔۔۔۔

• 18 اپریل 1956

مکمل عورت کی صفات

پرسوں سے خورشید ایک کیس کے سلسلے میں لاہور گئے ہوئے ہیں۔ میں رات کو مس جناحؒ کے ساتھ والے کمرے میں سوتی ہوں۔ کہہ رہی تھیں کہ اکیلی نیچے کے کمرے میں نہ سوؤں۔

اوپر کی خاموشی اور اتنے کمرے دیکھ کر مجھے اور بھی احساس ہوا کہ وہ بالکل تنہا اوپر سوتی ہیں اور ذرا بھی نہیں ڈرتیں۔ نہایت نڈر اور بہادر خاتون ہیں۔ آج وہ بستر پر لیٹ گئیں تو سامنے والی کرسی پر میں ان کے قریب بیٹھ کر کافی دیر تک باتیں کرتی رہی۔

وہ اکثر مجھ سے میرے گھر والوں کے متعلق بھی پوچھتی ہیں۔ آج باتوں باتوں میں جانے کیسے یہ ذکر چل نکلا کہ عورت کی اپنی ذات میں کچھ ایسی کشش ہونی چاہیے کہ وہ صرف اپنے شوہر کی نام کی وجہ سے ہی نہ پہچانی جائے۔ کہنے لگیں:

''اکثر معروف اور بڑے آدمیوں کی بیویاں محض اس لیے سوسائٹی میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں وہ فلاں شخص کی بیوی ہے۔ ورنہ ان کی اپنی ذات میں کچھ نہیں ہوتا۔ آج مجھے کوئی بتا رہا تھا کہ وہ اس دن ایک کالج کے فنکشن میں ایک وزیر کی بیوی نے صدارت کی اور جو تقریر لکھ کر انہیں دی گئی تھی وہ بھی صحیح طرح نہ پڑھ سکیں۔ پھر ان کا انداز گفتگو اور لباس ایسا تھا کہ انہیں کسی طرح بھی ایک تعلیمی ادارے کے فنکشن میں صدارت نہیں کرنا چاہیے تھی۔ ضروری تو نہیں عورت صرف لکھی پڑھی

ہو۔ وقار، تمکنت، اور GRACE ایسی چیزیں ہیں جو ایک عورت میں ہونی ضروری ہیں اور یہی وہ اوصاف ہیں جو عورت کو ایک مکمل عورت بناتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ایک ''مکمل عورت'' کون ہے؟ ماڈرن عورت یہ سمجھتی ہے کہ چونکہ وہ انگریزی بول سکتی ہے، فیشن کے مطابق کپڑے پہن سکتی ہے اس لئے اس میں عورت کی تمام خوبیاں موجود ہیں حالانکہ یہ بات نہیں۔ عورت تو محبت، شفقت اور ہمدردی کا ایک بحر بیکراں ہے جس سے اس کے گھر والے، اس کے احباب اور ہمسائے سب سیراب ہوتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہماری عورتیں ایسا نہیں سوچتیں۔ عورت کی تنگ نظری کی وجہ سے گھروں میں طوفان اٹھتے ہیں۔ پریشانیاں جنم لیتی ہیں اور چین وسکون نام کی کوئی شے نظر نہیں آتی''۔

پھر بولیں:

''تم جیسی پڑھی لکھی لڑکیوں کا فرض ہے کہ کسی مشین کی طرح مصروف عمل ہو کر دوسروں کو اپنا ہم خیال بنائیں۔ ہر بات میں مردوں کی برابری کی کوشش اور خواہش معاشرے میں بعض ایسے اہم مسائل پیدا کر دیتی ہے جس سے سارا سکون غارت ہو جاتا ہے اور انسان کے آپس کے تعلقات قائم نہیں رہ سکتے''۔

میں نے پوچھا کہ پاکستانی عورت اس وقت جہاں کھڑی ہے اور جن قدروں کو اپنا رہی ہے کیا اس سے وہ اس مقام تک پہنچ سکتی ہے جس کا تصور شاید قائداعظم کے ذہن میں اس نوآزاد مملکت کی عورت کے بارے میں تھا؟۔

کہنے لگیں: ''ہرگز نہیں، وہ عورت کو صرف شمع محفل نہیں بنانا چاہتے تھے۔ آزادی نسواں کا مطلب لوگ غلط سمجھتے ہیں۔ آزادی کا مطلب بھٹکنا نہیں بلکہ ان راہوں پر عمل پیرا ہونا ہے جن پر چلنے میں عزت و آبرو، وقار اور عروج نصیب ہوتا ہے۔

عورت پر زیادہ سختی کرنا اور دباؤ ڈالنا بھی زیادتی ہے۔ اس طرح وہ بھٹک سکتی ہے۔

میں نے کہا: ''محترمہ! یہ بھی تو سوچئے کہ معاشرے میں کتنے ایسے لوگ ہیں جو آزادی کی فضا میں سانس لیتے ہیں اور جنہیں وہ تمام حقوق حاصل ہیں جن کے سہارے زندگی گزارنا خوشگوار لگتا ہے۔۔ بالکل آٹے میں نمک کے برابر۔ ہمارے بے شمار گھروں میں ابھی تک عورت مرد کے ظلم وستم کا شکار ہے۔ وہ نہ تو اس کی ضروریات پوری کرتا ہے اور نہ اسے آزادی کے ساتھ زندہ رہنے کا حق دیتا ہے۔ بلکہ اس کی آزادی اس طرح سلب کر کے بیٹھا کہ وہ بے چاری دم بھی نہیں مار سکتی۔ کتنی ہی ایسی عورتیں ہیں جو روزانہ ناکارہ، آوارہ، اور بدکار شوہروں کی وحشت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ وہ زندہ ہیں لیکن ایک لاش کی مانند ہیں۔ آخر معاشرے کے ان گھناؤنے جرائم کا کون ذمہ دار ہے؟ اور عورت پر اتنا ظلم کیوں ہوتا ہے''؟

انہیں میرا یہ سوال بہت دلچسپ لگا، کہنے لگیں:

''تم ٹھیک کہتی ہو، ان سب باتوں کے لیے ایک صحت مند معاشرے کی ضرورت ہے۔ معاشرتی برائیاں آخر کیوں جنم لیتی ہیں؟ اس کی وجوہات کیا ہیں؟ ان کے متعلق کبھی کوئی نہیں سوچتا۔ ایک شخص زیادتی کر کے یہ نہیں دیکھتا کہ اس کا یہ فعل معاشرے پر کیا اثر ڈالے گا۔ میرے خیال میں تو تعلیم ہی ان برائیوں کا حل ہے۔ لوگ حیوان نہیں رہے، دوسروں کے حقوق پہچانتے ہیں، اور انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے لیکن اس کے لیے وقت درکار ہے۔ صدیوں سے بنے ہوئے فرسودہ اصول اور نظریات ایک دن میں تو نہیں بدل سکتے۔ پھر عورت بھی تو اس سلسلے میں بہت کچھ کر سکتی ہے۔ کئی گھروں میں خاوند اس لیے اپنی بیوی پر ظلم کرتا ہے کہ اس کی ماں یا

بہن اس کے خلاف مرد کے کان بھرتی ہیں۔ بعض اوقات یہی بات بیوی دہراتی ہے اور اس طرح عورت ہی عورت پر ظلم کرتی ہے۔ وسیع النظری اور کشادہ دلی ہی غالباً ان سب برائیوں کو ختم کرنے کا موثر ذریعہ ہے''

میں نے کہا: ''یہ بات تو عجیب سی لگتی ہے کہ مہذب اور تعلیم یافتہ مرد بیوی کے لیے کوتاہ نظر اور ظالم ہیں''۔

کہنے لگیں:

''یہ بھی ہوتا ہے کہ اس میں بڑی حد تک MAN-MADE سوسائٹی کا دخل ہے۔ عورت کو صرف اس بات پر ماتم نہیں کرنا چاہیے کہ وہ عورت بن کر پیدا ہوئی ہے اور تمام ظلم اسے سہنا ہیں۔ بلکہ اسے یہ سوچنا چاہیے کہ وہ کس طرح مرد کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ اس کے جذبات اور احساسات کا قدر دان ہو۔ بردباری، متانت، اور محبت سے وہ بہت کچھ حاصل کر سکتی ہے اور اس مرحلے پر بھی عورت ہی عورت کی بہترین معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ ہر ماں کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو ایسی تربیت دے''۔

گھڑی دیکھی تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ محترمہ کو پیاس محسوس ہوئی۔ پانی تو تھا لیکن میں نے انہیں کہا کہ اگر وہ چاہیں تو میں انہیں فریج سے جوس نکال کر لا دوں؟

کہنے لگیں: ''اگر تمہیں نیچے کی منزل میں جانے سے گھبراہٹ نہ ہو تو ضرور لا دو''

میں ہمت کر کے گئی۔ ایک عجیب سی خاموشی پورے ماحول پر طاری تھی۔ جلدی سے فریج کھولا اور جوس نکال کر اوپر لے آئی۔ محترمہ نے پیا اور پھر بیٹھے بیٹھے نیم دراز ہو گئیں۔

محمد طارق اقبال
پاکستانی ڈائجسٹ
ڈاٹ کام

میں ابھی ابھی اپنے کمرے میں آئی ہوں۔ اب سونے کا پروگرام ہے۔

سامنے کی کھڑکی کھلی ہے اور نیچے لان میں پیپل کے تین درخت رات کی تنہائی میں بہت دیوقامت لگ رہے ہیں۔ یہ درخت مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر چیڑ کے درخت یاد آجاتے ہیں اور اپنے بچپن کا وہ زمانہ نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے جب ہم کشمیر میں تھے اور وادی گل مرگ میں گرمیوں کے دن گزارا کرتے تھے۔ چیڑ کے بلند قامت درختوں کے جنگل اور سرمئی پہاڑوں کے طویل سلسلے۔۔ کیسے خوبصورت اور جاذب نظر تھے وہ مناظر بھی۔۔۔ مجھے گل مرگ کی عمیق گھاٹیوں کی سرسراہٹ یاد آگئی۔ بچپن کو بیتے ہوئے ایک زمانہ ہوگیا۔ یہ سب یادیں بچپن کے اسی دور کے ساتھ وابستہ ہیں۔ انسان تنہا ہوتو کتنے پیار سے آآکر دامن تھام لیتی ہیں۔

19اپریل1956

معتدل لباس

گرمی بڑھ گئی ہے۔ مس جناحؒ اب صرف ہلکے کپڑے پہنتی ہیں۔ گرم سویٹر صرف شام کو پہنتی ہیں۔ آج شام میں لان میں ٹہل رہی تھی۔ اپنے مہمانوں کے رخصت ہونے پر وہ بھی باغ میں آگئیں۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کا ساتھ دیا۔

پوچھنے لگیں۔

''کیا کررہی ہو؟''۔

میں نے بتایا کہ گرمی کے باعث پھول اور پتے کچھ مرجھا گئے ہیں، وہ پہلے جیسے نہیں لیکن پھر بھی میں نے ان کے کمرے کے لیے دوگلدستے بنالیے ہیں۔

کہنے لگیں۔

''کراچی میں باغ کو سنبھالنا بہت مشکل ہے۔ اب تو موسم کا اثر ہے، دوسرے مالی بھی کام نہیں کرتے''

پھر بولیں:

''تم شام کو کپڑے تو بدلا کرو۔ ایسے پھیکے رنگ کے کپڑے پہن کر پھر رہی ہو''۔

مجھے خیال آیا کہ انہیں تو شوخ رنگ پسند نہیں، پھر جانے ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔ بولیں:

''صرف وقت اور موقع کا خیال ضرور رکھنا چاہیے۔ اب بازار میں عورتیں بنارسی ساڑھیاں پہن کر اور بڑے بڑے جوڑے بنا کر شاپنگ کرنے کے لیے آتی ہیں۔

محمد طارق اقبال پاکستانی ڈائجسٹ ڈاٹ کام

اس روز میں اپنے ڈینٹسٹ (DENTIST) کے پاس گئی تو ایک بیگم صاحبہ سفید ساڑھی پہن کر آئی ہوئیں تھیں۔ اس طرح بعض عورتیں ماتم کی محفلوں میں بھی شوخ لباس پہنتی ہیں، چنانچہ لباس موقع محل اور محفل دیکھ کر پہننا چاہیے۔ اس علاقے میں پنجابی عورتیں بہت آ گئی ہیں۔ اور لباس اور بناؤ سنگھار میں کبھی اعتدال کو قائم نہیں رکھتیں۔ معلوم نہیں، انہیں کیا لطف آتا ہے جون' جولائی کے گرم اور تپتے ہوئے دنوں میں شوخ ریشمی کپڑے پہنے بھاری زیوروں سے لدی ہوتی ہیں۔ میں نے تو ایک بیگم صاحبہ کو صاف کہہ دیا کہ مجھے ان کے لباس سے کوفت ہوتی ہے''۔

آج شام بہت سے لوگ انہیں ملنے آئے جن میں مسٹر اور مسز دولتانہ بھی شامل تھے۔ لیڈی ہدایت اللہ حسب معمول آج بھی یہاں تھیں۔ آج محترمہ ان سے ان کے خاندانی امور پر باتیں کرتی رہیں۔

آج مس جناح کا ڈرائیور چلا گیا ہے۔ دو بار ان سے رقم لے کر اس نے گاڑی پر پوری خرچ نہیں کی۔ بل جانے کہاں سے بنوالایا۔ آج انہیں کچھ شک ہوا۔ انہوں نے کمپنی والوں سے پوچھا۔ انہوں نے تردید کی کہ اتنا بل ہم نے نہیں بنایا۔ محترمہ کو بہت غصہ آیا اور ڈرائیور کو نکال دیا، حالانکہ انہیں ڈرائیور کے بغیر بہت تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

20 اپریل 1956

عورت اور ماڈرن سوسائٹی

20 اپریل اور گرم موسم۔۔ جب سے واپس آئی ہوں، موسم برا غیر شاعرانہ سا ہے۔ خورشید کئی دنوں سے بے حد مصروف ہیں۔ کسی مقدمے کے سلسلے میں آج کل رات بارہ بجے سے پہلے نہیں آتے۔ مجھے ان پر بہت ترس آتا ہے لیکن میں کچھ نہیں کہتی۔ زرد اور تھکے تھکے سے لگتے ہیں۔ آج شب کھانے کے بعد مس جناح بہت دیر تک بیٹھی رہیں۔ ہم دونوں ڈرائینگ روم کے ساتھ والے چھوٹے کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ اس کمرے کی بڑی بڑی کھڑکیاں باغ کی سمت کھلتی ہیں۔ رات چاندنی تھی اور ہوا بھی چل رہی تھی۔ باغ میں پھولوں کی لہلہاتی پتیاں رات کی خاموشی میں بہت خوبصورت اور جاذب نظر لگتی ہیں۔ باتوں کے دوران میں کبھی کبھی باہر بھی دیکھنے لگتیں۔ گیٹ کے پاس پولیس مین بندوق اٹھائے ہوئے ادھر سے اُدھر گشت کرتا نظر آجاتا ہے۔

آج باتیں تو بہت تھیں لیکن سب سے دلچسپ موضوع ''عورت اور ماڈرن سوسائٹی'' تھا۔ مس جناح جب ایسے مسئلوں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں گھنٹوں بیٹھی سنتی رہوں۔ وہ ایک روشن خیال عورت ہیں لیکن اس کے ساتھ ان میں باریک بینی (OBSERVATION) کی وہ جھلک ہے جسے ہم شرافت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

خورشید کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگیں کہ ''آج وہ پھر دیر سے آئیں گے''۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ ابھی شاید دو چار روز انہیں ایسی ہی مصروفیت رہے گی۔ میں سوچتی ہوں اگر عورتوں کو بھی مردوں کی طرح یوں ہر وقت باہر جانا پڑے تو کیا ہو۔ عورت فطرتاً کمزور واقع ہوئی ہے اور وہ باہر کی اتنی شدید ذمہ داریاں اٹھانے کی اہل نہیں۔ عورت کی سوشل زندگی کا تذکرہ آ گیا۔ کہنے لگیں۔

عورت کی زندگی بھی عجیب ہے۔ شادی سے پہلے والدین اس پر ایسی پابندیاں عائد کرتے ہیں جو وہ اس کی حفاظت اور تربیت کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ شادی کے بعد جب شوہر کے گھر میں اسے آزادی ملتی ہے تو وہ ہر جگہ جا سکتی ہے۔ شوہر کے دوستوں کے ساتھ بلا تکلف باتیں کرتی ہیں۔ پارٹیز اور فنکشنوں میں جاتی ہے تو پابند زندگی کے بعد ان باتوں کا اس پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ وہ ذہنی توازن کھو بیٹھتی ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے مردوں کا رویہ بڑا قابل مذمت ہے۔ عورت ان کے لیے کوئی ایسی چیز ہے جسے انہوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ شکل و صورت اچھی ہو تو وہ اس پر اور بھی توجہ دیں گے جس کا نتیجہ دونوں کے لیے خراب ہوتا ہے۔ زندگی کے ابتدائی سال گھر کی پابند زندگی میں گزارنے کے بعد وہ اس توجہ اور دلچسپی کو بہت غلط رنگ میں لیتی ہے اور پھر اس کا انجام بڑا بھیانک ہوتا ہے۔ مرد تو ایسی زیادتی ہمیشہ کرتے ہیں۔ ان کی زندگی ہی ایسی ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود ان پر اس کا ذرا اثر نہیں ہوتا۔ وہ گھر اور باہر کی زندگی، دونوں قائم رکھتے ہیں لیکن عورت کو یہ سب کچھ راس نہیں آتا۔ اس کی ایسی زندگی کا اثر اس کے بچوں اور آئندہ نسلوں پر پڑتا ہے۔

IF A MAN IS BAD HE RUINS HIMSELF BUT IF A WOMAN IS BAD SHE RUINS THE WHOLE FAMILY.

اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم اپنے حالات اور کمزوریوں کو سامنے رکھتے ہوئے زندگی گزاریں۔ ایسا کوئی کام نہ کریں جس کا انجام برا ہو۔ زندگی کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار

اور پر مسرت بنانے کی کوشش کریں۔ خوشی اور مسرت صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب کہ ہماری خانگی زندگی پر سکون اور اچھی ہو۔ باہر کی وقتی خوشی کس کام کی جو ہمیں دائمی راحت اور سکون نہ دے سکے"۔

میں ان کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔ پھر بولیں:

"انسان کتنا احمق واقع ہوا ہے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی وہ حماقتیں کرتا ہے۔ زندگی اتنی مختصر ہے کہ پلک جھپکتے میں بہترین سال گزر جاتے ہیں۔ پھر اسے بہتر سے بہتر طریق پر کیوں نہ گزارا جائے۔ اپنی مجبوریوں اور کوتاہیوں پر اظہار تاسف کرنے سے بہتر ہے کہ ہم ان سے تمنا سیکھیں اور اس کے سہارے مشکلات اور ناکامیاں، آسائش اور کامیابیوں میں بدل جاتی ہیں۔ زندگی بہت قیمتی ہے۔ اس کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ اسے فضول باتوں اور اداس لمحوں کی نذر کرنا ایک فاش غلطی ہے۔ مسکراتے ہوئے زندگی بسر کرنا ہم سب کا نصب العین ہونا چاہیے۔ اس طرح ہم یقیناً ان دشوار مرحلوں سے بہ آسانی گزر جائیں گے جو بعض اوقات چٹان کی طرح ہمارے راستے میں حائل ہو جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں انسانیت کے ان بنیادی اصولوں کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جنہیں ہم اخلاق اور شرافت کا نام دیتے ہیں۔ غلط راہوں پر چل کر زندگی کا لطف اٹھانا شدید حماقت ہے۔۔۔ خصوصاً ایک عورت کے لیے جس پر تمام سوسائٹی کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ مرد اگر حد سے تجاوز کرے تو کچھ زیادہ برا معلوم نہیں ہوتا لیکن عورت کو قدرت نے ایسا بنایا ہے اور سماج میں انفرادی طور پر اس کی پوزیشن کچھ اس طرح کی ہے کہ اگر وہ حد سے بڑھے تو نہایت مہلک نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ وہ پورے معاشرے میں CHEAP ہو کر رہ جاتی ہے۔ لوگوں کی نگاہوں میں اس کا مقام ایک حقیر شے سے بھی گر جاتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ عورت اپنی نسوانیت کو برقرار رکھے اور کبھی بھی اپنی حدود سے

بڑھنے کی کوشش نہ کرے۔ عورت کی نسوانیت، خدا کی ایک عنایت ہے۔ اسے کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔

اگر وہ مردوں کی طرح بے پایاں حقوق اور آزادی حاصل کرنے کے لیے اندھا دھند اس طلسم میں کھو گئی تو وہ اپنا اصل کردار کھو بیٹھے گی اور کردار ہی ایک ایسی انمول چیز ہے جو اس کے اندر عزت و توقیر کا جذبہ پیدا کرتا ہے''۔

انہوں نے گھڑی دیکھی۔ بارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''اب سونا چاہیے، کافی دیر ہوگئی ہے''۔

خورشید ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ محترمہ مجھے دروازے تک شب بخیر کہنے آئیں۔ کہنے لگیں:

''تمہیں ڈر تو نہیں لگے گا اکیلے میں''۔

میں نے دبی مسکراہٹ میں کہا۔

''ڈر کیسا، ویسے رات کو اکیلے میں کچھ عجیب سا ضرور لگتا ہے۔ دراصل عورت ہوں نا۔۔۔اور عورت مرد سے ہر بات میں مختلف ہوتی ہے''۔

وہ ہنسیں اور کہنے لگیں۔

''اب اپنی ہر کمزوری کو عورت پن کے ساتھ منسوب نہ کرو، بعض باتوں میں تمہیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ تم مرد سے کسی صورت کم نہیں۔۔۔ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے۔۔۔صرف چند باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے''۔

میں نے انہیں شب بخیر کہا۔ دروازہ بند کرنے کی آواز آئی اور میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ شب خوابی کا لباس تبدیل کرتے ہوئے بھی ان کا پر رعب چہرہ میری نگاہوں کے سامنے ہی تھا۔

22 اپریل 1956

خود فریبی کا حصار

آج دوپہر کو بہت دلچسپ بحث چھڑ گئی۔ بحث کا موضوع تھا کہ ہم لوگ خود فریبی کے حصار میں زندہ ہیں۔ دوسروں کو اور اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں۔ سستی چیز خرید کر اس کی قیمت زیادہ بتاتے ہیں۔ سستا کپڑا پہنتے ہیں لیکن قیمت دوگنی بتاتے ہیں۔ آج بمبئی کی ایک خاتون محترمہ کے پاس آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے حال ہی میں اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کی ہے۔ اس کے متعلق بتا رہی تھیں کہ دلہن کی ماں شادی سے پہلے ہمیشہ کہتی تھی کہ اس کی بیٹی سلائی بہت عمدہ کرتی ہے لیکن شادی کے بعد معلوم ہوا کہ اس نے کبھی سوئی میں دھاگہ تک نہیں ڈالا۔ اس طرح جو زیورات اسے دیئے، وہ بھی معمولی اور ہلکے سے۔ جب کہ لوگوں کو یہ بتایا تھا کہ بھاری اور قیمتی زیورات دوں گی۔ ہم نے ان سے کسی قسم کا مطالبہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی ہماری ایسی کوئی خواہش ہے لیکن پھر بھی ان کی ہر بات میں دھوکہ اور فریب ہوتا ہے۔ ساڑھی تو پانچ سو، ہزار سے کم بتاتی ہی نہیں، حالانکہ ہم نے کبھی ان سے قیمت نہیں پوچھی۔ میں تو اب اپنے بیٹے کے لیے پریشان ہوں کہ اگر بیٹی میں یہی عادتیں ہوئیں تو ایسی بیوی کے ساتھ گزارا مشکل ہو جائے گا۔

محترمہ خوب ہنسیں اور کہنے لگیں۔

''یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ اکثر لوگ احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔ اور ایسی باتوں سے اپنی برتری جتاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ اس قسم کی باتوں سے وہ

اپنے آپ کو دوسروں کی نظروں سے گرا رہے ہوتے ہیں۔ ہمارا کردار ہر طرح سے ہم پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہمارے لوگ ان باتوں سے دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انہیں یہ علم نہیں ہوتا کہ ان باتوں سے کسی پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اصل چیز تو خود سب کو نظر آ جاتی ہے۔ سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے اس قسم کی باتیں ایک اچھے انسان کو زیب نہیں دیتیں''۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ دور سے کسی عورت کے رونے کی آواز آئی۔ محترمہ نے توجہ سے سنا تو معلوم ہوا کہ یہ آواز نوکروں کے کوارٹروں سے آ رہی ہے۔ بیرے کو بلا کر پوچھا تو اس نے بتایا کہ جمعدار نے اپنی بیوی کو مارا ہے۔ مس صاحبہ! وہ تو روز مارتا ہے، آج زیادہ مارا ہوگا۔ اس لیے اس کے رونے کی آواز یہاں تک آ رہی ہے۔

محترمہ فوراً وہاں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں بھی ساتھ گئی۔ پہلے جمعدار کی بیوی کو بلایا۔ اس کے جسم پر نیل کے نشان تھے اور اس کی قمیض کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ وہ رو رو کر بتا رہی تھی کہ اس نے بڑی بری طرح سے مجھے مارا ہے اور بات کچھ بھی نہیں ہوئی۔ جمعدار شرمندہ سا کھسیانی شکل بنائے ایک طرف کھڑا تھا۔ محترمہ نے اس سے پوچھا:

''اپنی بیوی کو کیوں مارتے ہو، تمہیں شرم نہیں آتی؟''۔

کہنے لگا ''جناب بڑی ڈھیٹ عورت ہے۔ میرے دو چھوٹے بھائی ہیں میرے پاس رہتے ہیں، ماں باپ مر چکے ہیں۔ یہ انہیں کھانا نہیں دیتی اور ان پر ظلم کرتی ہے۔ روز کہتا ہوں کہ ان کے پیٹ کی بددعا نہ لو لیکن اثر نہیں ہوتا''۔

وہ عورت رو رو کر فریاد کر رہی تھی کہ یہ جھوٹ کہتا ہے۔

محترمہ نے دونوں کو ڈانٹ کر ایک طرف کیا اور کہا:

''اپنا رویہ ٹھیک کرو، دوسری بار اگر ایسی مار پیٹ ہوئی تو تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گی''۔

وہاں سے واپس آ کر کہنے لگیں:

''دیکھا تم نے اس ساری کہانی کی ایک ٹریجڈی ہے، غربت اور تنگ نظری۔۔۔ غریب جمعدار کی بیوی اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر خاوند کے بھائیوں کو نہیں کھلانا چاہتی۔ جہاں اس قسم کے حالات نہیں ہوتے وہاں عورت تنگ نظری کی وجہ سے ان باتوں پر جھگڑتی ہے اور بعض اوقات حسد کا جذبہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کہیں اور متوجہ نہ ہو۔ کتنی افسوسناک ہے یہ صورت حال''۔

میں نے کہا ''محترمہ! ایک اچھا معاشرہ، جہاں سب لوگ صحت مند ماحول میں سانس لیں، محض خواب سا لگتا ہے۔ خبر نہیں ہم کبھی وہ دن دیکھیں گے بھی یا نہیں، جب ہمارے سب لوگ سکھ کا سانس لیں گے اور چین کی زندگی گزاریں گے''۔

جھٹ بولیں: ''ضرور دیکھیں گے۔ اگر تمہارے حکمرانوں کی یہی حالت رہی جس پر یہ لوگ اب قائم ہیں تو زندگی مشکل سے مشکل تر ہو جائے گی۔ امیر زیادہ سے زیادہ امیر ہوتا جائے گا اور غریب غریب تر..... متوسط طبقہ پس کر رہ جائے گا۔ میں موجودہ حالات سے بالکل مطمئن نہیں''۔

مس جناح ایسی باتیں اکثر کرتی ہیں کہ وہ ملک کے حالات سے مطمئن نہیں۔ وہ تحریک پاکستان میں بانی پاکستان کی معاون رہی ہیں اور انہوں نے شب و روز کی جدوجہد کے بعد مسلمانوں کے لیے یہ خطہ زمین حاصل کیا ہے۔ یقیناً انہوں نے کسی اور معاشرے کا خواب دیکھا جس کی تعبیر آزادی کے بعد رونما ہونا تھی لیکن یہ سب کچھ ان کے معیار سے کس قدر جدا اور ہٹ کر ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک الگ ملک ایک آزاد ملک صرف چند لوگوں کے ذاتی مفاد کا آلہ کار بن گیا۔

23اپریل1956

مسلم لیگ کے اختلافات

مغربی پاکستان کے وزیراعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب نے مسلم لیگ کے مقابلے میں ری پبلکن پارٹی قائم کر لی ہے اور قیامِ پاکستان کے بعد پہلی بار مغربی پاکستان میں مسلم لیگ حکمران جماعت نہیں رہی اور اب حزب اختلاف کا کردار ادا کرے گی۔ پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں جو سردار عبدالرب نشتر کی صدارت میں ہوا اور جس میں وزیراعظم چودھری محمد علی اور وزیر قانون مسٹر چندریگر بھی شامل ہوئے۔ مسلم لیگ کے سات وزیروں نواب ممدوٹ، حسن محمود، قاضی فضل اللہ، سردار عبدالحمید دستی، کرنل عابد حسین، ارباب نور محمد خان اور سید جمیل حسین رضوی کو مسلم لیگ سے خارج کرنے کی تجویز منظور کی ہے۔ تاہم اگر یہ وزیر وزارت سے استعفیٰ دے دیں تو انہیں مسلم لیگ سے نکالنے کا فیصلہ نہیں کیا جائے۔

آج اس سلسلے میں محترمہ سے بہت لوگ ملنے آئے۔ جب کوئی قومی بحران ہو، یا مایوسی ہو مخلص لوگوں کو محترمہ کی ذات میں ہی امید کی کرن نظر آتی ہے۔ ان کی رائے، ان کے خیالات کو لوگ بہت اہمیت دیتے ہیں اس لیے کہ وہ پاکستان کی ہمدرد ہیں۔ انہیں کسی منصب یا عہدے کی ضرورت نہیں۔ جو بات انہیں ناگوار گزرتی ہو یا سیاسی طور پر اس کے ردعمل کا انہیں خیال ہو، یا پاکستان کی بقا اور قائداعظم کے ارشادات کے منافی ہو تو وہ کھل کر اظہار خیال کرتی ہیں۔ وہ نڈر ہیں، مخلص ہیں اور سیاست کو خوب سمجھتی ہیں۔ قائداعظم کے ساتھ ایک طویل وقت گزارا ہے۔ ان کی

رفاقت انہیں نصیب رہی ہے جس سے ان میں ملک کے حالات کو سمجھنے کا شعور موجود ہے۔ پھر وہ مخلص ہیں، دیانتدار ہیں۔ قابلیت اور شعور کے ساتھ اگر جذبے میں بھی دیانت ہو تو انسان کی سمجھ بوجھ کو کوئی CHALLANGE نہیں کر سکتا۔ ان کی رائے ویسے بھی بہت وزن دار ہوتی ہے۔

آج بہت ناراض تھیں، خفا تھیں۔ انہوں نے کہا کہ مخدوم زادہ حسن محمود نے تمام مسلم لیگی وزیروں کی طرف سے ڈاکٹر خان صاحب کی ری پبلکن پارٹی میں شریک ہونے کا جو فیصلہ کیا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اسے صرف وزارت اور کرسی کے غرض ہے۔ اصول ایسے لوگوں کے بڑے کچے ہوتے ہیں۔ کوئی معیار نہیں ہوتا۔ قوم کے مفاد کا خیال نہیں۔ نہ ہی مستقبل پر نظر ہے کہ ان حرکات کا آئندہ آنے والے دور پر کیا اثر پڑے گا اور آنے والی نسلوں پر ردعمل کیا ہوگا۔

سیاست میں تبدیلیاں ہوتی ہیں لیکن بنیادی اصول تو نہیں بدلتے۔ افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے لوگوں کو اصولوں کی ہی پروا نہیں۔ قائداعظم نے ساری زندگی اصولوں کا خیال رکھا اور اس وجہ سے پاکستان حاصل ہوا کہ وہ سوچ سمجھ کر جو فیصلہ کرتے تھے اس پر ڈٹ جاتے تھے۔ پھر کوئی نقصان، کوئی کمی ان کے لیے کبھی تکلیف دہ نہیں ہوتی تھی۔ اصول تو زندگی ہے اور ایک باوقار زندگی کے لیے اصول تو واضح کرنے پڑتے ہیں۔

خورشید کہنے لگے ''فیروز خان نون بھی ری پبلکن پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں اور ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ انہیں 189 ارکان کی حمایت حاصل ہے۔''

محترمہ کہنے لگیں: ''سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ ایسے لوگوں کے اپنے نظریے نہیں ہوتے۔ وقت کے ساتھ بدلتے ہیں، اپنی رائے نہیں ہوتی۔ چند وقتی

فائدوں کے لیے کسی چیز کی پروا نہیں کرتے اس لیے پارٹیوں میں اور ملک میں استحکام نہیں ہوسکتا۔ اگر اپنی ذات کا نہ سوچا جائے تو بہت بہتری ہوسکتی ہے مگر کتنے لوگ ایسا کرتے ہیں۔ اور جو کرتے ہیں وہ بہت کم ہیں۔ لیکن وہی لوگ ملکوں میں انقلاب لاتے ہیں، تکلیفیں اٹھاتے ہیں اور اصول سے جینا بہت بڑا اعزاز ہے، جو کسی کو میسر آجائے''۔

محترمہ مسلم لیگ کے اختلافات پر برہم بھی ہوتی ہیں اور پریشان بھی۔ اس جماعت نے قائداعظم کی قیادت میں پاکستان بنایا۔ بڑی قربانی اور تکلیفوں سے یہ ملک حاصل ہوا ہے۔ سالہا سال کی جدوجہد سے یہ ملک ملا ہے۔ اسے قائم رہنا چاہیے اور کسی دوسری جماعت کو برتری حاصل نہیں ہونی چاہیے مسلم لیگ کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ یہ تحریک پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے اور تحریک پاکستان کے ساتھ قائداعظم اور ان کے وہ عظیم ساتھی بھی شامل ہیں جنہوں نے دن رات اس تحریک کے لیے خلوص سے کام کیا۔ خوش قسمت تھے وہ لوگ جو قائداعظم کے ساتھ اس تحریک میں شامل تھے۔ کتنے ہی ایسے محبِ وطن راستے میں ہی اپنے کارواں سے بچھڑ گئے۔ منزل پالینے کی خوشی میں نہ اپنے آرام کا سوچا نہ دنیاوی جاہ وحشمت کا۔ اپنے خاندانوں سے دور رہے لیکن اس مردِ مجاہد کا ساتھ دیا اس لیے کہ وہ سچا تھا، مخلص تھا، دیانتدار تھا اور مسلمانانِ ہند کا ہمدرد تھا۔ انہیں آزادی دلوانا چاہتا تھا، الگ خطہ زمین کا خواب دیکھتا تھا جس میں ان کے حقوق ہوں گے اور ایک عام شہری کو بھی زندگی گزارنے کی سہولتیں میسر ہوں گی۔ کچھ ایسے بھی جانثار ہیں جنہوں نے آزادی کی صبح بھی طلوع ہوتے نہ دیکھی۔ کتنے ہی ایسے گمنام مجاہد ہماری مٹی میں دفن ہیں، جنہوں نے زندگی بھر پاکستان حاصل کرنے کے لیے قائداعظم کے مشن میں ان کا ساتھ دیا اور کوئی ان کا نام تک نہیں جانتا۔ انہیں بھی نام ونمود کی پروا نہ تھی اور اگر یہ جذبہ اس وقت لوگوں میں نہ

ہوتا تو ہوسکتا ہے پاکستان معرضِ وجود میں بھی نہ آتا۔ جذبے ہی تو انسان کو منزل تک پہنچاتے ہیں۔

محترمہ اس ساری قربانی ایثار اور جدوجہد کی عینی شاہد ہیں۔ ایک دن بتا رہی تھیں کہ وہ تقریباً چالیس برس قائداعظم کے ساتھ رہیں۔ یہ ایک طویل مدت ہے بلکہ ایک پوری عمر ہے۔ اس لیے انہیں دکھ بھی ہوتا ہے جب قائداعظم کے پاکستان میں لوگوں کے حقوق پامال ہوتے ہیں اور حکومت میں استحکام نہیں اور حکمران عوام کے نزدیک نہیں۔ اس دن باتوں میں کہنے لگیں ''مجھے تو لگتا ہے کہ برصغیر میں ابھی بھی مغل شہنشاہ حکومت کررہے ہیں۔ عوام کی خدمت نہیں، حکمران بس عیش وعشرت میں ہی زندگی سمجھتے ہیں، حالانکہ پاکستان ایک عام مسلمان، ایک عام شہری کا ملک ہے۔ ایک بار تحریک پاکستان کے زمانے میں قائداعظم کو عوام نے جوش وخروش میں ''شہنشاہ'' کے لقب سے نوازا تو انہوں نے اس وقت خاموش کردیا اور اونچی آواز میں کہا ''پاکستان میں کوئی شہنشاہ نہیں ہوگا۔ سب کے برابر کے حقوق ہوں گے، مساوات ہوگی''۔

انہیں تو قائداعظم کے ارشادات بھی یاد نہیں۔ اور جو نشر ہوتے ہیں یا اخباروں میں آتے ہیں وہ مخصوص عبارت کے ساتھ توڑ موڑ کر پیش کرتے ہیں جو غلط ہے۔ مذہب، حکومت اور لوگوں کے حقوق کے متعلق ان کے خیالات کھل کر پبلک کے سامنے آنے چاہئیں۔ اب اخباروں اور خاص موقعوں پر بھی ان کی ایک خاص تقریر اور ایک خاص پوز ہی نظر آتا ہے شیروانی میں۔ حالانکہ انہوں نے یہ لباس تو زندگی میں چند بار ہی پہنا۔ ساری عمر عمدہ باہر کے سلے ہوئے سوٹ پہنتے رہے۔ اس لباس میں اگر ان کی تقریریں عوام کو دکھائی جائیں تو قائداعظم کی شخصیت کیا کم ہوجائے گی؟ یہ سب بازاری باتیں ہیں۔ ان سے کسی کی شخصیت کا اندازہ لگانا بہت ہی غلط بات ہے۔ عوام

بھولے ہیں، ان پڑھ ہیں ایسی باتوں سے ان کے ذہن کو بھی زنگ لگ جاتا ہے۔ سب بیکار کی باتیں ہیں، ہمارے حکمرانوں کی۔۔۔"

میں اور خورشید شام کو واک کے لیے فریر ہال کی طرف جاتے ہیں۔ آج واپسی پر ایک گھر کے سامنے ایک خاتون نے روک لیا جو باہر ہی کھڑی تھیں۔ ان سے میں پہلے بھی نور الصباح بیگم کے ہاں مشاعرے پر مل چکی ہوں۔ بیگم زاہدہ خلیق الزمان تھیں۔ بہت بھاری جسم کی ہیں، غرارہ پہنتی ہیں۔ دوپٹہ اوڑھتی ہیں، منہ میں ہر دم پان کی گلوری اور باتیں بہت کرتی ہیں۔ ہم سے باتیں کرتی رہیں اور بہت اصرار سے کہا کہ تم لوگ اتنے نزدیک ہو میرے پاس آیا کرو۔ ہم جلدی جلدی معذرت کر کے فلیگ ہاؤس آئے کیونکہ کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ محترمہ اس وقت برآمدے میں چہل قدمی کر رہی تھیں۔ کہنے لگیں تم لوگ بہت تیز چل کر آ رہے ہو کیا بات ہے؟ ہم نے بتایا کہ کھانے کا وقت ہو رہا تھا اور بیگم خلیق الزماں نے راستے میں روک لیا تھا۔ ان کا نام سن کر محترمہ کچھ برہم ہو گئیں۔ بولیں "اس عورت کے ہاں کبھی نہ جانا اور بالکل ملنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا تعلق ایسے طبقے سے ہے جو اپنی عادتیں کبھی نہیں چھوڑتے۔ خلیق الزمان نے بھی اس سے دوسری شادی کی۔ بڑا ہنگامہ ہوا۔ خاندان والے بھی ناراض ہوئے۔ لوگوں نے بھی انگلیاں اٹھائیں لیکن مردوں پر جب عشق کا بھوت سوار ہوتا ہے تو وہ کسی چیز کی پروا نہیں ہوتی۔ اس عورت نے بھی اپنے طریقے نہیں چھوڑے۔ وہی حرکتیں، وہی اطوار، وہی اٹھنا بیٹھنا۔ ویسے شاعرہ ہے، شعر کہتی ہے لیکن مہذب لوگوں میں ملنے جلنے کے قابل نہیں۔ خلیق الزمان بھی بس اس کا ہی ہو کر رہ گیا۔ ورنہ اچھا اور قابل آدمی تھا"۔

عجیب بات ہے مسکرا کر بولیں "میرا تجربہ ہے کہ مرد عمر بڑھنے کے ساتھ ایسی طفلانہ حرکتیں ضرور کرتے ہیں۔ نوجوان لوگ کریں تو عجیب نہیں لگتا لیکن ایسی عمر میں اس طرح کے جذباتی عشق مضحکہ خیز ہیں۔ لیکن ایسے ہی ہوتا ہے۔ اب فیروز خان نون نے جب دہلی میں اپنی خوبصورت غیر ملکی سیکرٹری سے شادی کر لی تو وہ نوجوان نہیں تھا بلکہ اس کے نوجوان بچے تھے۔ لیکن شادی کر لی۔ اس وقت نہیں سوچتے یہ مرد۔ نہ عزت کا خیال ہوتا ہے نہ خاندان کا، نہ بیوی بچوں کا۔ عجیب بات ہے بڑے کم مرد اچھے کردار کے مالک ہوتے ہیں ورنہ ذرا موقع ملا تو کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کریں گے۔ پھر عورت کے معاملے میں تو مرد ویسے ہی کمزور ہے"۔

کھانے پر آج دوسری چیزوں کے ساتھ حلیم اور نان بھی تھے۔ محترمہ نے وہ کھایا۔ نان اور حلیم لیڈی ہدایت اللہ کے گھر سے آئی تھی جو انہوں نے خود پکائی تھی۔ بہت مزے دار تھی۔ خورشید بتانے لگے کہ حلیم کی طرح کشمیر میں ہریسہ بنتا ہے جو اس سے بہت بہتر ہوتا ہے۔ اس میں دالیں کم اور گوشت زیادہ پڑتا ہے۔ کہنے لگیں تمہیں بنانا آتا ہے تو کسی دن باورچی کی مدد سے بنا دو کچھ مہمانوں کو بلا لیں گے۔

خورشید ہنستے ہوئے کہنے لگے اسے ہریسہ بنانا کہاں آتا ہوگا۔ البتہ میں آپ کو ایک دن پکا کر کھلاؤں گا۔ میں نے تو انگلینڈ میں بھی ایک بار بنایا تھا۔ اور مجھے سارے دوستوں نے کہا تھا کہ تم یہاں ایک ریسٹورنٹ کھول لو۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں اگر میں ایک ریسٹورنٹ کھولوں تو بہت اچھی طرح چلا سکتا ہوں۔

کشمیری کھانوں پر تفصیلی باتیں ہوتی رہیں۔ محترمہ نے بمبئی کے کھانوں کا بھی بتایا۔ ساتھ ہی کہنے لگیں "ویسے مجھے کھانے پکانے سے دلچسپی نہیں ہوئی، نہ ہی میں نے کبھی کچھ سیکھنے کی کوشش کی۔ بس میرا ذہن ہی نہیں تھا اس طرف۔ حالانکہ انگلینڈ میں جب قائداعظم کے ساتھ کافی عرصہ رہی تو بہت ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ ایک بار سردیوں میں قائداعظم نے سوجی کے حلوے کی فرمائش کی تھی۔ مجھ سے وہ بھی اچھا نہیں بن سکا۔ ویسے کھانا پکانا آنا چاہیے خاص طور پر عورتوں کو۔۔۔

24 اپریل 1956

قائداعظمؒ کی بیماری

محترمہ اپنے ایک بنگالی بیرے کی ہمیشہ سے مداح رہی ہیں کہ وہ کام بھی اچھا کرتا ہے اور کبھی وقت بے وقت چھٹی نہیں مانگتا اور پھر ہمیشہ اپنے سوتیلے بھائی کو اس لیے خود پڑھا رہا ہے کہ اس کے ماں باپ نہیں ہیں۔ اس روز کہہ رہا تھا۔

''مس صاحبہ! ہم تو غربت کی وجہ سے نہ پڑھ سکے۔ یہ تو پڑھ کر بابو بن جائے''۔ انہیں یہ بیرہ بہت پسند ہے۔

آج وہ سرخ آنکھیں لیے ان کے پاس آیا کہ اس کے بھائی نے اس کی بے عزتی کی ہے اور گالی گلوچ کے ساتھ اس پر ہاتھ بھی اٹھایا ہے۔

لیکن کیوں؟ محترمہ بولیں۔

اس بار وقت پر اس کی فیس تو ادا کر دی تھی لیکن اس کی فرمائش پر اسے نئے کپڑے خرید کر نہ دے سکا۔ بس اس بات پر وہ آپے سے باہر ہو گیا اور مجھے مارنے لگا''۔

میں نے کہا ''کتنا احسان فراموش ہے۔ اسے تو اپنے بھائی کا شکر گزار ہونا چاہیے جو شب و روز محنت کر کے اپنے سوتیلے بھائی کو پڑھاتا ہے''۔

محترمہ کہنے لگیں۔

''یہ ساری قوم ہی احسان فراموش ہے۔ اس نے قائداعظم کے ساتھ وفا نہ کی۔ ان کی بیماری میں انہیں اچھی MEDICAL AID نہ پہنچا سکے اور مجھے افسوس

اس بات کا ہے کہ قائداعظم کو بھی اس بات کا علم تھا کہ ان کی بیماری کے دوران حکومت وقت کے علمبرداروں نے ان سے اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ قائداعظم کی صحت نے جب تک اجازت دی وہ اپنی طاقت سے بڑھ کر حکومت کے کاموں کو سرانجام دیتے رہے۔ ضروری کاغذ روزانہ کراچی سے ان کے پاس پہنچتے تھے۔ وہ بیمار تھے، شدید بیمار۔۔۔ 1947 کے خونی فسادات، سرحدوں کی تقسیم میں انگریزوں کی بے ایمانی، مسلمانوں کا قتل عام اور لاکھوں مہاجرین کا مسئلہ، جنہیں روٹی اور جگہ چاہیے تھی۔ ان کی نحیف و نزار صحت کے لیے یہ تمام باتیں جان لیوا ثابت ہوئیں۔ نئے ملک کے مسائل اور خالی خزانہ ان کے لیے بہت پریشان کن تھا۔ اس لیے جب بیمار ہوئے تو یکدم شدید بیمار ہوئے۔ لیکن وقت گزر چکا تھا ان کا صحیح طرح علاج بھی نہ ہو سکا۔ ان کے انتقال کے بعد ہوائی اڈے پر جو ایمبولینس آئی وہ بھی ٹھیک نہیں تھی۔

یہ اس محسن کے ان احسانات کا صلہ تھا جو اس نے ہم اپنی قوم پر کئے تھے''۔

میں نے آبدیدہ ہو کر کہا۔

''محترمہ! عوام تو خون کے آنسو روئے تھے۔ ہر ایک کی زبان پر یہی تھا کہ قائداعظم کو ملکی بقا کے لیے ضرور زندہ رہنا چاہیے تھا۔ اب اس ملک کا کیا ہوگا''۔

کہنے لگیں: ''یہ ٹھیک ہے کہ ایک عام شہری کے دل میں قائداعظم کے لیے بہت عزت اور احترام ہے بلکہ مجھے بھی وہ بہت احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اپنے ذاتی کاموں کے لیے بازار چلی جاؤں تو تم نے دیکھا ہوگا لوگ راستہ چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے ہیں۔ لیکن وقت کے حکمرانوں نے ان کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے اور اس کا مجھے بے حد قلق ہے۔ انہیں ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا''۔

میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ محترمہ، قائداعظم کے ذکر سے ہمیشہ افسردہ ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ آج بھی وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں اور کہنے لگیں:

''چلو، دیکھیں، مالی نے نئی قلمیں لگائی ہیں یا آج بھی بہانہ کر کے جلد چلا گیا ہے۔'' وہ اٹھیں اور میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی باغ میں آ گئی۔ باغ میں گرمی کے اثرات کے باوجود بہار کا سا سماں نظر آیا۔ سامنے سنتری بندوقیں تھامے گشت کر رہے تھے۔ جھٹ بولیں:

''مجھے اس پہرے سے سخت نفرت ہے۔ میں نے پولیس والوں سے کہا ہے کہ ان لوگوں کو یہاں سے ہٹا دیں لیکن وہ نہیں مانتے۔ کہتے ہیں کہ یہ ہمارا فرض ہے اور اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے مجبور ہیں۔ ان کو اپنے اصل فرائض بھی تو یاد ہونے چاہئیں۔ بے معنی فرائض یاد رکھنے کا آخر کیا فائدہ؟''۔

27اپریل1956

میری سالگرہ

آج میری سالگرہ تھی۔ میں نے آج محترمہ سے کہا کہ ہم دونوں رات کا کھانا باہر کھائیں گے۔ کئی دفعہ ہم چلے جاتے ہیں لیکن آج انہوں نے جانے کیسے پوچھ لیا:

''کیوں کوئی خاص بات ہے یا کسی نے مدعو کیا ہے''۔

ایک دم میرے منہ سے نکل گیا ''آج میری سالگرہ ہے''۔ اپنی دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ بولیں:

''مجھے کیوں نہیں بتایا۔ آج تم لوگ کھانا گھر میں کھاؤ گے۔ ہم خود تمہاری سالگرہ منائیں گے''۔

میں خوشی سے جھوم اٹھی۔

رات کھانے پر پلاؤ، فرائی مچھلی، گوشت کا قورمہ، شامی کباب اور سبزی تھی۔ بعد میں حسب معمول پھل اور سویٹ ڈش موجود تھی۔ میز پر بڑی بڑی موم بتیاں روشن تھیں۔ پلیٹیں اور دوسری کراکری بالکل نئی تھی۔ روز ہم جن پلیٹوں میں کھانا کھاتے ہیں وہ پلین سفید ہیں لیکن آج قرمزی رنگ کی گولڈن حاشیے والی پلیٹیں تھیں اور کریم رنگ کے لمبے گلاس۔

کہنے لگیں:

یہ گلاس قائداعظم نے پیرس کی ایک پرانی دکان سے خریدے تھے اور انہیں بہت پسند تھے''۔

محمد طارق اعوان پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ محترمہ نے کس محبت کے ساتھ میری زندگی کا اہم دن منایا۔ خدا کی مہربانی ہے کہ ان جیسی ہستیوں کے دل میں میرے لیے اتنی محبت ہے۔

گلاس میں پانی پیتے ہوئے مجھے قائداعظم کا خیال آ گیا جو اتنے بڑے سیاستدان ہونے کے ساتھ ساتھ اتنے نفیس مزاج تھے۔ اس گھر میں ان کے ہاتھوں کی خریدی ہوئی چیزیں ان کے بے پناہ ذوق وشوق کا احساس دلاتی ہیں۔

اتنا خوش پوش انسان اتنا بااصول اور پھر ان کی یہ بہن، جن کے ساتھ انہوں نے اپنی زندگی کے اتنے قیمتی سال گزارے، عام لوگوں سے کتنی ہٹ کر ہیں۔ ان کی باتیں سوچ کر انسان کیا کچھ تصور میں نہیں پاتا۔

28 اپریل 1956

مٹی کے ٹی سیٹ

آج محترمہ نے چند لوگوں کو افطار پر بلایا تھا۔ ان کے بے تکلف احباب تھے۔ سموسے، پکوڑے اور کباب گھر میں بنے۔ سینڈوچ اور فروٹ چاٹ میں نے بنائی۔ تازہ ٹماٹر اور مالٹے کا مشروب تھا۔ پھر مٹھائی، چائے اور چند نمکین چیزیں۔

آج ساری چیزیں مٹی کی بنی ہوئی خوبصورت پلیٹوں میں لگائیں۔ محترمہ بتا رہی تھیں کہ وہ ایک بار حیدرآباد گئی تھیں تو وہاں سے مٹی کے برتن خرید کر لائی تھیں۔ زرد، فیروزی اور سرخ رنگ میں نقوش والے برتن انہیں بے حد پسند ہیں۔ کہنے لگیں:

''اچھی اور قیمتی چیزیں استعمال کرنے میں بھی دل خوش ہوتا ہے لیکن بعض اوقات ایسی سستی اور ملک کے عام فنکاروں کی چیزیں بھی بہت اچھی لگتی ہیں۔ لیکن ہمارے لوگوں کی عجیب عادت ہے مہنگی چیزوں میں زیادہ فخر محسوس کرتے ہیں اور اگر زیادہ مہنگی نہ بھی ہوں تو عادتاً انہیں زیادہ مہنگی بتاتے ہیں۔ اب اس روز ایک جگہ جانے کا اتفاق ہوا تو ایک بیگم صاحبہ اپنے قیمتی چائنا اور قیمتی ساڑھیوں کی بڑھ چڑھ کر قیمت بتا رہی تھیں، حالانکہ نہ کسی نے پوچھا اور نہ ہی ایسا موضوع تھا کہ وہ ایسی بات کرتیں''۔

محترمہ بولیں کہ میں نے اس کے جواب میں نہیں کہا کہ۔

میں تو بوہری بازار سے اکثر کٹ پرائس کی دکانوں سے اپنی شلواروں اور قمیضوں کے ٹکڑے خریدتی ہوں۔ بڑی دکانوں کی نسبت بہت سستے ہوتے ہیں۔ آخر

اس میں کیا برائی ہے؟ اور آج کل میں گجرات کے بنے ہوئے مٹی کے ٹی سیٹ میں چائے پیتی ہوں۔ بڑی خوشی ہوتی ہے جب انسان اپنے ملک کی چیزیں استعمال کرے۔''

اس خاتون کے چہرے پر میں نے شرمندگی کے آثار محسوس کئے۔ مجھے احساس ہوا کہ انہوں نے گفتگو کا موضوع فوراً بدلنا چاہا ہے۔

کہنے لگیں: ''احساس کمتری کا شکار ہیں اور کوئی خاص خوبی ان میں ہوتی نہیں تو نام ونمود کے لیے ان چیزوں کا سہارا لیتے ہیں۔ آخر ایک اچھے انسان کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔ سستی مہنگی دونوں قسم کی چیزیں انسان خریدتا ہے اور استعمال کرتا ہے۔ اس میں برائی کونسی ہے؟''

محترمہ خوب ہنسیں۔ آج بہت خوش تھیں۔ صبح ہم قائداعظم کے مزار پر بھی گئے اور فاتحہ پڑھی۔ محترمہ جب بھی قائداعظم کے مزار پر جاتی ہیں لیڈی ہدایت اللہ ضرور ساتھ ہوتی ہیں۔ وہاں جا کر اداس ہو جاتی ہیں۔

یکم مئی 1956

صوبائی تعصب کے خطرات

اور لوگوں کے علاوہ آج ڈھاکہ سے ایک پارلیمانی وفد محترمہ سے ملنے آیا۔ کافی دیر تک ان کے پاس بیٹھیں۔ کھانے کے بعد مشرقی بنگال کے متعلق باتیں کرتی رہیں۔ حال ہی میں جو طوفان باد و باراں وہاں آیا تھا اس سے کافی تباہی ہوئی ہے۔

کہنے لگیں: مشرقی بنگال ہمیشہ مشکلات کا شکار رہا ہے اور یہاں سے جو مدد وہاں جاتی ہے وہ ساری کی ساری مصیبت زدہ افراد کو نہیں ملتی ویسے بھی حکومت کے بعض عناصر بنگال کو پاکستان سے الگ سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کے لئے ہمدردانہ جذبات نہیں رکھتے''۔

میں نے کہا: ''محترمہ! بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بنگال کے لوگ مغربی پاکستان کے مقابلے میں احساس کمتری کا شکار ہیں۔ اس لئے وہ بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں، ورنہ انہیں باقاعدہ ہر موقع پر امداد ملتی ہے۔ اگرچہ وہ دور افتادہ علاقہ سہی آخر ہمارے ملک کا ایک حصہ ہے''۔

کہنے لگیں۔ ''بعض اوقات حالات ہی ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ انسان احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ پاکستان صرف ''مغربی پاکستان'' ہی تو نہیں ''مشرقی پاکستان'' بھی تو ہے۔ کیا ہوا جو ہزاروں میل کا فاصلہ حائل ہے۔ ایک بار ایک پڑھے لکھے شخص نے مجھے کہا تھا کہ مشرقی پاکستان ہمارے پاس نہ بھی ہو تب بھی پاکستان کی بقا کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں نے انہیں خوب ڈانٹا کہ یہ صوبہ پرستی آخر کیوں؟ کل کو سندھ الگ ہو جائے، سرحد الگ ہو جائے، بلوچستان الگ ہو جائے تو

پھر بھی تم جیسے لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ملک کا ہر حصہ بے حد اہم ہے اور اس کے لیے کسی قسم کا تعصب بہت برے اثرات کا حامل ہو سکتا ہے۔ صوبائی تعصب بہت خطرناک چیز ہے اور قائداعظم نے اسے ختم کرنے کی بہت کوشش کی تھی۔ بنگال کے لوگوں کو بعض اوقات کم تر سمجھا جاتا ہے۔ کئی لوگ کہتے ہیں کہ وہ ہندو نواز ہیں اور ان کی زندگی میں ہندو تہذیب کی جھلک نظر آتی ہے۔ میں نے بنگالیوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ اتنے ہی محبِ وطن ہیں جتنے کہ دوسرے اچھے پاکستانی...... انہیں بھی اس سرزمین سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کسی اور پاکستانی کو ـــ لیکن میں ڈرتی ہوں کہ کسی دن یہ صوبائی تعصب، ان کے ذہن میں زبردستی ڈالا ہوا احساسِ کمتری انہیں پاکستان کا دشمن نہ بنا دے۔ وہ ہندوؤں کے قریب تر ہیں۔ مغربی اور مشرقی بنگال کی سرحدوں پر لوگ وہاں سمگلنگ اور اس قسم کی دوسری حرکتوں کی وجہ سے بارہا پکڑے گئے ہیں۔ ایک بار تو قائداعظم کی زندگی میں ان کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا تھا اور ایک اعلیٰ سرکاری فوجی افسر اس میں ملوث تھا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ اسے ایک اور موقع دے دیا گیا اور وہ ذلت و رسوائی سے بچ گیا۔ لیکن ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہندو ہمیشہ ہماری تاک میں ہے۔ جب بھی اسے موقع ملا وہ پاکستان کو نقصان پہنچانے اور بلیک میل کرنے کی کوشش کرے گا۔ مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان سے زیادہ غربت ہے۔ اس لیے ہم ان لوگوں کو یہ موقع کیوں دیں کہ وہ کسی بات پر ہم سے بدظن ہوں۔ یہ چیز ہماری نو آزاد مملکت کے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے''۔

بعض باتیں مجھے سمجھ نہیں آئیں۔ محترمہ ہر بات کی باریکیوں کو خوب اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ وہ بہت دوررس ہیں۔ ہر چیز کے ہر پہلو کا بڑی گہری نظر سے مشاہدہ کرتی ہیں۔ آخر ایک عظیم سیاست دان بھائی کی بہن جو ٹھہریں۔ باتیں بھی تو ان کی طرح ہی کرتی ہیں۔

2 مئی 1956ء

ایک جذبہ، ایک مشن

آج محترمہ دس بجے کے بعد اپنے بیرے کی بیوی کو ہسپتال لے کر گئیں جو بیمار ہے اور اسے کسی ہسپتال میں داخلہ نہیں مل رہا تھا۔ جب واپس آئیں تو بہت ناراض تھیں۔ کہنے لگیں:

''ملک کے ایک عوامی ہسپتال میں ایک مریض کو بغیر کسی سفارش کے داخلہ نہیں ملتا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ آخر یہ ہسپتال کس مرض کی دوا ہیں، جب لوگ ان سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ میرے جانے پر انچارج ڈاکٹر شرمندہ ہوا اور بولا کہ آپ کیوں تشریف لائیں۔ میں نے کہا کہ دو روز سے اس غریب کا شوہر یہاں چکر لگا رہا ہے اور تم اس کی بیوی کو ہسپتال میں داخل نہیں کرتے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہمدردی، احساس اور ذمہ داری کا مادہ ہم میں مفقود ہے''۔

میں نے کہا۔ ''محترمہ! قائداعظم نے جب پاکستان حاصل کرنے کے لیے دن رات جدوجہد کی تو یہی قوم ان کے ساتھ تھی اور اتحاد و اتفاق سے درپیش حالات کا مقابلہ کرنے میں ان کے ساتھ تھی۔ اب تو ملک اپنا ہے، ہر چیز اپنی ہے پھر خدا جانے یہ لاپروائی کیوں ہوتی ہے۔ آخر ہم یہ سب کچھ کیوں نہیں سوچتے''۔

کہنے لگیں۔

''واقعی یوں لگتا ہے کہ وہ لوگ کوئی اور تھے جنہوں نے یہ ملک بنایا۔ اب تو اچھے لوگ حالات سے بددل ہو گئے ہیں یا ایسے لوگوں کو زیادہ موقع مل گیا ہے جن کے

پاس اتنا کچھ آ گیا ہے کہ وہ ذہنی توازن قائم نہیں رکھ سکتے۔ 1947ء میں جو شخص ایک معمولی کلرک تھا وہ اب ایک بہت بڑا افسر ہے۔ معمولی حیثیت کے لوگ فیکٹریوں اور ملوں کے مالک ہیں۔ اتنا کچھ مل جانے پر وہ اور بھی حریص ہو گئے ہیں۔ اور پھر جس قوم میں خود غرضی آ جائے وہ حیوانوں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ انسان کی صلاحیتوں کو زنگ لگ جاتا ہے۔ ایک مشہور فلسفی نے کہا ہے:

THE TRUE TEST OF A MAN IS HOW FAT HE IS SELFLESS.

ایک بے غرض انسان کبھی انسانیت سوز حرکتیں نہیں کر سکتا۔ یہ بھی اکثر ہوتا ہے کہ بعض اوقات ہمارے لوگ صرف لاپروائی سے غلط کاموں کے مرتکب ہوتے ہیں مثلاً آج ہسپتال میں ڈاکٹر اپنی ڈیوٹی پر موجود نہیں تھا۔ اس کا پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ جس شخص کو اس کی جگہ ہونا چاہیے تھا وہ ایک گھنٹے سے چائے پینے کہیں گیا ہوا ہے۔ اب ایسے وقت میں کوئی ایمرجنسی کیس بھی آ سکتا ہے۔ آخر یہ لوگ کیوں نہیں سوچتے کہ ایک آدمی کی غلطی یا لاپروائی سے قومیں تباہ ہو جاتی ہیں''۔

''محترمہ! پھر اس کا علاج کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں نے افسردگی سے پوچھا ''آخر قائداعظمؒ کے پاکستان کو ہم کیسے مستحکم کر سکتے ہیں''۔

بولیں:

''صرف ایک جذبہ ہونا چاہیے۔ ایک مشن ہونا چاہیے۔ ہر گھر میں ہر ماں اپنے بچے کو سکھائے۔ ہر باپ بچوں کے دماغ میں ڈالے۔ اچھے والدین ہی اچھے بچوں کی تربیت کرتے ہیں۔ پھر تمہارے جیسے نوجوان لوگوں کا کام ہے کہ جب تم مل جل کر بیٹھو تو ادھر ادھر کی باتوں کے علاوہ آپس میں قوم کی بہتری کے بارے میں بھی سوچا کرو۔ تم لوگ بہتر ہو گے تو قوم بہتر ہو گی۔ قوم بہتر ہو گی تو ملک بہتر اور خوشحال

ہو گا۔ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

میں نے ایسے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو بعض اوقات صرف باتیں کرتے ہیں لیکن ان کا عمل کچھ نہیں ہوتا۔ اس وقت ہمیں عمل کی ضرورت ہے۔ ایک غریب آدمی کو ہسپتال میں داخلہ نہیں ملتا۔ ایک بچہ سکول میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ایک نوکری حاصل کرنے کے لیے اوپر کے لوگوں کو رشوت دینا پڑتی ہے۔ یہ تمام باتیں آخر کیوں نہ ہوں۔۔۔ اگر قوم کی ہر برائی کو ہم اپنی ذاتی کمزوری سمجھیں تو ملک کی یہ حالت کبھی نہ ہو''۔

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

3 مئی 1956

ایوب کھوڑو کی طرف سے ضیافت

آج مسٹر ایوب کھوڑو اور ان کی بیگم نے محترمہ کے اعزاز میں رات کا کھانا دیا تھا۔ ہم بھی مدعو تھے۔ بہت سے لوگ تھے۔ سفارت خانہ کے لوگ، سیاست دان، اخبار نویس اور ان کے بے شمار احباب وغیرہ۔ ان کے کشادہ لان میں شامیانے لگے تھے اور بجلی کے قمقمے جھلملا رہے تھے۔ محفل پر لطف تھی اور کھانا بے حد لذیذ۔ مسٹر کھوڑو، پرانے مسلم لیگی اور سیاستدان ہیں اور محترمہ کے ساتھ ان کے کافی مراسم ہیں۔ کبھی کبھی فلیگ سٹاف ہاؤس بھی آ جاتے ہیں۔ مسز کھوڑو بھی سیاست سے کافی دلچسپی رکھتی ہیں۔ آج مختلف موضوع زیر بحث رہے اور مس جناحؒ شگفتہ انداز میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتی رہیں۔

رات کو کافی دیر سے واپس آئے۔ اب رمضان شریف بھی ختم ہونے کو ہے۔ محترمہ اپنے نوکروں کو جو روزہ دار ہوتے ہیں سحری اور افطار دونوں کے لیے فالتو چیزیں دیتی ہیں۔ کام میں گڑبڑ یا اوقات میں ادھر اُدھر ہو جانا انہیں سخت ناپسند ہے۔ اس لیے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بہت سخت گیر طبیعت کی مالک ہیں حالانکہ وہ کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتیں۔

آج ان کا سیکرٹری دو روز کی چھٹی کا کہہ کر چوتھے روز بھی نہیں آیا۔ یہ بات انہیں بہت بری لگتی ہے۔ آج صبح میں نے ساری ڈاک دیکھی اور محترمہ کے سامنے پیش کی۔ آج انہیں ایک کاریگر (پلمبر) کا بھی انتظار تھا جو تین روز سے آنے کا کہہ رہا

ہے لیکن ابھی تک نہیں آیا۔ ان کے غسل خانے کے نلکے اور شاور میں پانی رک رک کر آ رہا ہے اور وہ ٹھیک کروانا چاہتی ہیں۔ ان باتوں سے انہیں بہت چڑ ہے۔ آج غصے سے بولیں:

''جو لوگ بات کہہ کر پوری نہیں کرتے یا ان کی قطعاً نیت نہیں ہوتی کہ پوری کریں گے، ان سے کسی چیز کی توقع رکھنا عبث ہے۔ آخر اس قوم کا کیا بنے گا؟''۔

6 مئی 1956

قائداعظمؒ - ایک راسخ العقیدہ مسلمان

محترمہ کے کوئی عزیز ان دنوں بمبئی سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ آج ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ وہ بار بار انہیں یہ کہتے رہے کہ وہ ایک بار ہندوستان ضرور آئیں غیر سرکاری طور پر۔ لیکن محترمہ یہی کہتی رہیں کہ میرا وہاں جانا مناسب نہیں۔ ہندوستان والے یہاں اکثر آجاتے ہیں۔ ان سے وہاں کی خبر معلوم ہو جاتی ہے۔ جن حالات میں ہم نے اس ملک کو چھوڑا، ان کے پیش نظر اب وہاں جانے کو دل نہیں چاہتا۔ ایک خاص مقصد تھا، ایک عزم تھا جس کی خاطر ہم نے ایک خطہ اپنے لیے چن لیا۔ اب میں ہندوستان جا کر کیا کروں گی۔

صحیح ہو یا غلط لیکن یہ ہماری چوائس CHOICE تھی لیکن جس جذبے سے یہ ملک بنا، اس کی تعبیر وہ نہیں نکلی جو ہم نے سوچی تھی۔ پھر اداس ہو کر بولیں:

I AM GLAD QUAID-E-AZAM DID NOT LIVE TO SEE ALL THIS.

ہندوستان میں اکثر جو فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہتے ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے بولیں: "تم لوگ وہاں سات کروڑ ہو، ایک طاقت ہو، ایک تنظیم ہو۔ تم ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو جاؤ اور اتحاد سے کفار کا مقابلہ کرو۔ تم لوگوں میں یہاں والوں سے زیادہ مضبوط اتحاد ہونا ضروری ہے کیونکہ یہاں اور وہاں کے حالات میں فرق ہے۔ اپنی روایات کو قائم رکھنا اور ان پر عمل کرنے بے حد ضروری ہے۔ جو قومیں اپنی روایات،

رسم و رواج، زبان اور لباس وغیرہ کو فرسودہ سمجھ کر غیروں کی تقلید کرنے لگ جاتی ہیں ان کا انجام اچھا نہیں ہوتا"۔

میں بولی: "محترمہ! اس چیز کا آخر علاج کیا ہے کہ ہمارے ملک میں مغربی اثرات بڑھ رہے ہیں اور ہم زبان، لباس اور بود و باش میں مغربیت کا اثر قبول کر رہے ہیں"۔

کہنے لگیں:

"دنیا ایک چھوٹی سی جگہ ہے۔ یہاں پر ایک ملک یا قوم کا دوسرے ملک اور قوم پر اثر ڈالنا ایک قدرتی سی بات ہے لیکن بنیادی طور پر ہمیں اپنی روایات و اقدار کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

یہ روایات و اقدار ہر گھر میں سکھائی جانی ضروری ہیں اور اس کے لیے ایسی ماؤں کی ضرورت ہے جو اپنے بچوں کو اپنے ماحول اور کلچر کے مطابق تربیت دیں۔ علم اور صحیح علم صرف ڈگریوں وغیرہ سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس تعلیم سے ملتا ہے جو ہم خود اپنے آپ اور اپنے ماحول سے حاصل کرتے ہیں۔ دراصل پاکستان بننے کے بعد مسلمانوں کو بہت کچھ مل گیا ہے اور اب وہ اپنا توازن کم ہی برقرار رکھ سکیں گے"۔

پھر محترمہ نے چندان بیگمات کا ذکر کیا جو تحریک پاکستان میں پیش پیش تھیں اور اب چند سالوں میں اتنی بدل گئی ہیں کہ ان سے نفرت محسوس ہونے لگتی ہے۔ ایک بیگم کا ذکر کرتے ہوئے بولیں:

"اس روز میرے پاس آئیں تو میں نے ان کی جواں سال بچی کا حال پوچھا، کہنے لگیں، مس جناح! اتنا عمدہ راک اینڈ رول کرتی ہے کہ آپ دیکھ کر حیران رہ جائیں۔ فرنچ پڑھ رہی ہے اور ساتھ ہی رقص کی تربیت بھی حاصل کر رہی ہے۔ اور

محمد طارق اقبال پاکستانی یو ٹی ڈاٹ کام

میں نے اسے کہا کہ تم اور تمہارا شوہر بہت فخر محسوس کر رہے ہو کہ بیٹی مغرب کے انداز اپنا رہی ہے۔ کل کو تو یہ نوجوان نسل بالکل ہی اپنے والدین کو یہ کہہ کر دھتکار دے گی SHUT UP OLD BAGS ذرا سوچیے تو سہی ہم کدھر جا رہے ہیں''۔

محترمہ کے مہمان بولے:

''ہندوستان میں تو ابھی یہ بھی رجحان ہے کہ مسلمان لڑکیاں ہندوؤں سے شادی کرنے کا سوچتی ہیں کیونکہ ہندو زیادہ اچھے عہدوں پر فائز ہیں اور مسلمانوں سے زیادہ خوشحال بھی اور آزاد بھی ہیں۔ اور مسلمان لڑکیاں، سوائے چند خاندانوں کے جو ابھی تک اپنی پرانی قدروں کو لیے بیٹھے ہیں، ہندوؤں سے خوب ملتی ہیں اور ان کی چیزیں اپناتی ہیں''۔

بولیں: ''بچے کو بنیادی طور پر اپنے مذہب سے لگاؤ ہونا چاہیے۔ بچپن میں اس کے دل میں مذہب کی محبت اسے کبھی بھٹکنے نہ دے گی۔ اب قائداعظم کے مخالف ہمیشہ انہیں مغربی تہذیب کا دلدادہ سمجھتے تھے۔ ان کی خوش پوشی اور روانی سے انگریزی بولنے کی مہارت سے غلط اندازہ لگاتے تھے۔ لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ قائداعظم صحیح راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور انہیں اپنے مذہب سے والہانہ عقیدت تھی۔ اس لیے ہندو انہیں خرید نہ سکا اور نہ ہی انگریز کو یہ جرات ہوئی کہ ان کے نظریات بدل سکے۔ اس کے باوجود انہوں نے کبھی ایک مذہبی پیشوا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ایک بار لکھنؤ میں شیعہ سنی فساد ہو گیا۔ لوگوں نے قائداعظم سے اپیل کی کہ وہ اس سلسلے میں وہاں ایک جلسہ کریں۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا اور بولے:

''میں کوئی مذہبی لیڈر نہیں، پیشوا نہیں کہ مذہب پر لوگوں کو کچھ کہوں۔ یہ تو علماء کا کام ہے''۔

بحث بہت دلچسپ رہی اور کافی دیر تک ہم اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے اور بمبئی کی مشکلات کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے رہے۔

محترمہ جھٹ بولیں:

''اسی لیے تو تم لوگوں نے ایک الگ ملک بنایا تھا۔ لیکن لگتا ہے، بہت جلد وہ ساری مشکلات یہاں پیدا ہو جائیں گی۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن خود مسلمان ہے اور اس بات کا احساس تک نہیں ہے''۔

7 مئی 1956

مشرقی پاکستان کے مسائل

آج کراچی یونیورسٹی سے چند بنگالی طلبا محترمہ کو ملنے آئے ، دبلے پتلے ، سانولے بنگالی طالب علم مشرقی پاکستان کے ابتر حالات کے متعلق محترمہ سے باتیں کرتے رہے۔ ان دنوں مولانا بھاشانی نے جو عوامی لیگ کے لیڈر بھی ہیں، مشرقی پاکستان میں نازک غذائی صورت حال کے باعث بھوک ہڑتال کی ہوئی ہے۔ طلبا نے بتایا کہ چاول تو وہاں ناپید ہو گیا ہے اور چاول وہاں کی خوراک ہے۔ اس کے بغیر تو بنگالی گزارہ نہیں کرسکتا۔ کم ہے اور گراں بھی۔ بالکل قحط کی صورت ہورہی ہے وہاں۔ سارے ملک میں اناج کی فراہمی ایک شدید اور سنگین مسئلہ بن گیا ہے۔ حکومت کی مدد کافی نہیں۔ عام آدمی تک تو ویسے ہی مدد نہیں پہنچتی خاص طور پر دیہاتوں میں تو لوگ بھوک سے مررہے ہیں۔ آبادی بھی زیادہ ہے اور خوراک برائے نام۔

عجیب بات ہے کہ بنگالی کاریگر دن رات محنت کرتا ہے۔ ریشم اور پٹ سن کی ساری مصنوعات مشرقی پاکستان میں تیار ہوتی ہیں اور سارے مغربی پاکستان کی ضروریات پوری کرتی ہیں۔ لیکن اس کے بننے والے بھوک اور افلاس کا شکار ہیں۔ لوگ محسوس کرتے ہیں کہ مغربی پاکستان کا رویہ مشرقی پاکستان سے ٹھیک نہیں۔ تقریبا ہر سال سیلاب سے بھی بہت تباہی آتی ہے اور مغربی پاکستان سے جو مدد ملتی ہے وہ وہاں کی ضروریات کے لیے ناکافی ہوتی ہیں۔ اس سے وہاں بے اطمینانی ہے اور لوگ خوش نہیں۔ انہیں سمجھ نہیں آتی کہ اس کا اظہار کیسے کریں اور یہاں کی حکومت کو کیسے قائل کریں کہ انہیں زیادہ سے زیادہ مدد اور سہولتیں ملنی چاہئیں۔

محترمہ نے ان کی باتیں سنیں اور کہا "مجھے مشرقی پاکستان میں بسنے والے غریب بنگالیوں سے بے حد ہمدردی ہے۔ وہ اتنے ہی محب الوطن ہیں جتنے ہمارے یہاں کے لوگ۔ لیکن افسوس حکومت اپنے فرائض میں کوتاہی کرتی ہے۔ ہمارے افسر بھی اپنے فرائض نہیں سمجھتے بلکہ مغربی پاکستان سے جو افسر فوجی یا سول وہاں تعین ہوتے ہیں ان کا رویہ حکمرانوں کا سا ہوتا ہے۔ جس طرح انگریز افسر ہندوستان کو اپنی ایک کالونی سمجھتے تھے اور ہندوستانی کو کالا سمجھ کر توہین آمیز سلوک بھی کرتے تھے۔ اسی طرح مغربی پاکستان کے افسر وہاں جا کر ایسا کرتے ہیں حالانکہ وہ بھی ملک کا حصہ ہے۔ حکومت کو ان کی بہتری اور بھلائی کا خیال رکھنا چاہیے لیکن حکمران سمجھتے ہیں کہ ہر سیلاب کے موقع پر ان کی امداد کرنا ہی کافی ہے۔ یہاں اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کی فکر میں مشرقی پاکستان کے مسائل تو انہیں بالکل ہی یاد نہیں رہتے۔

اب ان دنوں چودھری محمد علی مغربی پاکستان کے وزارتی بحران کو دور کرنے کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ دولتانہ اور گورمانی کو بھی اس نے کراچی بلایا ہے۔ وزیراعظم کی حیثیت سے یہ اس کے فرض میں شامل ہے لیکن اور بھی فرائض ہیں۔ وزیراعظم کو مشرقی پاکستان کا دورہ سال میں کم از کم ایک بار ضرور کرنا چاہیے تاکہ خود حالات کا جائزہ لے۔ اس علاقے کو ہماری توجہ کی ضرورت ہے۔ وہاں یہاں سے بھی زیادہ غربت ہے۔ پھر تقریبا ہر سال سیلاب آتے ہیں، بارشیں زیادہ ہونے کی وجہ سے فصلیں بھی متاثر ہوتی ہیں۔ آبادی بھی مغربی پاکستان سے زیادہ ہے۔ معاشی بدحالی بڑے بڑے مسائل پیدا کردیتی ہے۔ لوگ بددل ہوجاتے ہیں اور پھر ہمیں یہ خیال کیوں نہیں آتا کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کا بارڈر بالکل ہم سے ہم آہنگ ہے۔ سرحدوں پر زیادہ پابندی بھی نہیں۔ لوگ آتے جاتے ہیں۔ ڈھاکہ کے لوگ کلکتہ میں اور کلکتہ

کے ڈھاکہ میں لین دین کرتے ہیں۔ رشتہ داری اور شادی بیاہ کی وجہ سے بھی آپس
میں ملے ہوئے ہیں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ ڈھاکہ میں ہندو تہذیب کا کافی اثر ہے۔ ساڑھی تو خیر
مسلمان عورت پہنتی ہی ہے لیکن اکثر ماتھے پر تلک بھی لگاتی ہے۔ پھر ان کے تہوار بھی
وہاں منائے جاتے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ بنگالی اچھا مسلمان نہیں۔ لیکن ان کے رہن
سہن اور اٹھنے بیٹھنے میں ہندوؤں کی تہذیب کی بڑی جھلک ہے۔ بنگالیوں سے اچھا
سلوک نہ ہوا تو ہندو اس چیز کا فائدہ اٹھائے گا اور مسلمان کو مسلمان ہی بدظن کرے گا۔
شکایت تو انہیں پہلے ہی مغربی پاکستان سے ہے۔ اس طرح اور موقع ملے گا پھر
جغرافیائی لحاظ سے مشرقی اور مغربی پاکستان ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ یہ
بات بھی ہماری کمزوری کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس وجہ سے بھی ہمیں زیادہ محتاط رہنا
چاہیے کہ بنگالی ہم سے بدظن نہ ہو اور اس کا جھکاؤ بھارت کی طرف نہ ہو۔

ہندو تو ویسے بھی عیار ہے، ایسی صورت حال کا خوب فائدہ اٹھانا جانتا ہے۔
اب سوچتی ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے متعلق محترمہ کی باتیں کتنی دور
رس تھیں۔ ہم نے اپنی عاقبت نااندیشی اور لاپروائی سے مشرقی پاکستان کو 1971 میں
کھو دیا اور پاکستان کا ایک بازو کٹ گیا۔ کاش! محترمہ کی باتوں کو اہمیت دی جاتی۔
لیکن پاکستان میں جو بھی حکومت آئی اس نے محترمہ کے تجربے اور صلاحیتوں سے کبھی
کوئی فائدہ نہیں اٹھایا حالانکہ قائداعظم کی بہن کی حیثیت سے اور تحریک پاکستان کی
ایک سرگرم ورکر کی حیثیت سے انہیں اتنا وقار ملنا چاہیے تھا جس کی وہ اہل تھیں۔ لیکن
انہیں تو ارباب اختیار نے بالکل فراموش کر دیا۔ یہ تو ان کی اپنی قابلیت تھی۔ اس کے
باوجود کہ حکومت نے انہیں اہمیت نہ دی، انہوں نے ملکی سیاست اور ملکی حالات میں
ایک نمایاں کردار ادا کیا۔

محترمہ مشرقی پاکستان کے حالات سے خاصی فکرمند ہو جاتی تھیں۔ آج
باتوں باتوں میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ" 3 جون 1947 کے پلان کی وجہ سے
پاکستان آئین ساز اسمبلی کے وہ لوگ جو پاکستان کے حق میں تھے ان کو مشرقی پاکستان
کے کوٹے سے آئین ساز اسمبلی کا ممبر تو بنایا گیا لیکن ان کا بنگال کی سرزمین سے کوئی
تعلق نہ تھا۔ یہ بے انصافی تھی۔ اب کابینہ میں بھی بنگالیوں کی نمائندگی ان کی آبادی
اور رقبے کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ پھر زبان کا مسئلہ بھی ہے۔ اس مسئلے پر وہ بھی
جذباتی ہو جاتے ہیں۔ ان سب کو سلجھانے کی ضرورت ہے۔ پھر بنگالیوں کو سب
باتوں پر اعتماد میں لینا چاہیے تاکہ انہیں کسی کمی کا احساس نہ ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔
مجھے ڈر ہے کہ ان حالات میں اختلافات کی خلیج اتنی نہ بڑھ جائے"۔

اتنے سال گزر جانے کے بعد اب سوچتی ہوں کہ مجیب الرحمان کے
1970 کے الیکشن میں 6 نکات پاکستان کے خلاف تو نہیں تھے اور نہ ہی پاکستان سے
علیحدگی کی کوئی ایسی تحریک کا احساس ہوتا تھا۔ مولانا بھاشانی اور مجیب الرحمٰن تحریک
پاکستان میں قیام پاکستان کے حق میں تھے۔ پاکستان حاصل کرنے میں ان کی
خدمات ہیں۔ اب اس الیکشن میں عوامی لیگ اکثریت سے جیتی تھی۔ مشرقی اور مغربی
پاکستان اس وقت ایک ملک تھا۔ اصولی طور پر حکومت مجیب الرحمان کو ملنی چاہیے تھی
اور وہی پرائم منسٹر بننے کا حق دار تھا لیکن ایسا نہ ہوا۔ اختلافات بڑھے، بغاوت ہوئی،
خانہ جنگی کی صورت ہوئی، مغربی پاکستان میں بھٹو وزیراعظم بن گئے اور ملک دو ٹکڑے
ہو گیا۔ اس وقت بے انصافی نہ ہوتی تو شاید مشرقی پاکستان بھی ہمارا ہوتا لیکن چند لوگ
صرف اپنی ذات اور عہدے کے لیے ملک کی تقدیروں کے فیصلے کر دیتے ہیں جن کے
اثرات بہت دوررس ہوتے ہیں۔

محترمہ کے سارے خدشات آنے والے حالات کا پیش خیمہ تھے۔ لیکن کسی نے کان نہ دھرا۔ خود جب وہ چند سالوں کے بعد ایوب خان کے مقابلے میں صدارتی انتخاب میں امیدوار تھیں تو سب سے زیادہ ووٹ انہیں مشرقی پاکستان سے ہی ملے تھے۔

آج صبح گیارہ بجے کے قریب جب میں محترمہ کے پاس حسب معمول آ کر بیٹھی تو مجھے وہ رات والی اس شادی کا پوچھنے لگیں جہاں ہم گئے تھے۔ میں نے شادی کے متعلق بتاتے ہوئے انہیں یہ بھی بتایا کہ رات ایک عجیب سی خاتون سے بھی ملاقات ہوئی۔ رنگ برنگ کپڑے، گلے میں موتیوں کی مالائیں، ماتھے پر تلک اور بالوں پر شوخ رنگ کے ربن بندھے، ہاتھوں میں بڑے بڑے کنگن، بڑا عجیب سا حلیہ تھا ان کا۔ پتہ چلا کہ مشہور آرٹسٹ عطیہ بیگم ہیں۔

محترمہ نے بتایا ”آرٹسٹوں کے متعلق تو میں سوچتی ہوں یہاں اچھا سلوک نہیں ہوگا۔ بعض لوگ خواہ مخواہ پاکستان کو ”ملاازم“ کا رنگ دینا چاہتے ہیں حالانکہ تحریک پاکستان میں صرف اسلامی سوشلزم کا ذکر ہے۔ ”ملاازم“ کا نام ونشان نہیں۔ نہ ہی قائداعظم کے ذہن میں اس ملک کے متعلق ایسا تصور تھا کہ ملا کو یہاں کس طرح کی اہمیت ملے گی۔ اس کا کام قوم اور ملک میں فالتو مداخلت کرنا نہیں۔ لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ بعض مفاد پرست لوگ ہمارے عوام کو گمراہ کرنے کے لیے مذہب کا اس طرح سہارا لیتے ہیں جس میں کوئی وزن نہیں ہوتا۔ لیکن لوگوں کو احساس دیتے ہیں کہ مذہب اور اس کی تعلیم اس طرح اہم ہے کہ دوسری باتیں بے شک پامال ہو جائیں۔ مذہب کے متعلق بات کرنا ویسے بھی ایک نازک مسئلہ ہوتا ہے۔ لوگ جذباتی ہو جاتے ہیں اور آپ انہیں قائل نہیں کر سکتے۔

خدا نہ کرے ہم جہالت کا شکار ہوں۔ مذہب کی آڑ لے کر جہالت سے لڑنا ویسے ہی ناممکن ہے۔ فنون لطیفہ تو ہماری ثقافت ہے، انہیں پامال نہیں ہونا چاہئے۔ آرٹ کا فروغ جس شعبے میں بھی ہو، پاکستان میں ہونا چاہئے۔ اس سے زندگی میں رنگ بھرتا ہے۔

جماعت اسلامی اور ایسی دوسری مذہبی جماعتیں بھی لوگوں کو گمراہ کرتی ہیں بلکہ اسلام کو EXPLOIT کرتی ہیں۔ اسلام کے نام پر اتنا بڑا دھوکا لوگوں کو دینا اور بھی بری بات ہے۔ اور حیرت تو یہ ہے کہ جماعت اسلامی نے تحریک پاکستان کی بھرپور مخالفت کی تھی۔ اسلام کے نام پر بننے والا ملک جماعت اسلامی کے لیے اہم نہیں تھا۔ اور اب جب پاکستان ایک حقیقت ہے، وہ یہاں رہ بھی رہے ہیں اور اعتراضات بھی کرتے ہیں۔

عطیہ بیگم کے متعلق محترمہ نے فرمایا ”عطیہ بیگم اور ان کے شوہر فیضی رحمین مالابار ہل پر ”جنجیرہ پیلس“ میں رہتے تھے اور ان کا اپنا تھری آرٹس سرکل تھا۔ وہاں اس دور کے تمام نامور فنکار، مصور اور شوقین لوگ باقاعدگی سے جاتے تھے جہاں ان سب کا اجتماع ہوتا۔ محفلیں جمتیں۔ شعر وشاعری، مصوری اور موسیقی کے بڑے خوبصورت اجتماع ہوتے۔ یہ سب فنون روح کی غذا ہیں اور صحت مند معاشرے کے لیے ضروری بھی ہیں۔ لوگوں کو راحت ملتی ہے، کچھ وقت سکون سے لطف اندوز ہونے کا ملتا ہے اعتدال کے ساتھ ان میں کوئی برائی نہیں۔

مجھے کسی نے بتایا ہے کہ عطیہ بیگم اور ان کا شوہر ان دنوں بہت کسمپرسی کی حالت میں رہتے ہیں۔ ویسے زمانے نے فنکاروں کے ساتھ ہمیشہ زیادتی کی ہے۔ ان کی وقعت اور اہمیت کا اعتراف ان کے جانے کے بعد ہی ہوتا ہے۔

آج شام میں محترمہ کے ساتھ کالج کے ایک فنکشن میں گئی۔ وہاں گرل گائیڈ کا ایک اجتماع بھی تھا اور محترمہ نے ان سے سلامی لی۔ وہ پاکستان گرل گائیڈز کی منتظم اعلیٰ بھی ہیں۔ واپسی پر فاطمہ جناحؒ سکول دیکھنے گئیں۔ سکول بن گیا ہے تقریباً کام بھی شروع ہو گیا ہے، سٹاف بھی ہے اور لڑکیاں بھی داخل ہو رہی ہیں۔ حسن شیخ اس کے منتظم ہیں۔ اس سلسلے میں محترمہ سے اکثر ملتے ہیں۔ سکول بہت بڑا ہے اور سکیم کے مطابق یہ بہت بڑی درسگاہ ہو گی جہاں قوم کی بیٹیوں کو تعلیم ملے گی۔ محترمہ نے بارہا باتوں میں یہ کہا ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم بے حد ضروری ہے۔ اچھے سکول اور سستی تعلیم اس ملک سے جہالت دور کر سکتے ہیں۔ لیکن لگتا تو یہی ہے کہ تعلیم سستی کبھی نہیں ہو گی۔ حکومت کے سکول زیادہ نہیں اور پرائیویٹ سکول اگر کھل رہے ہیں تو ان کی غرض صرف پیسہ کمانا ہے۔ ظاہر ہے ایک غریب آدمی بچوں کی زیادہ فیس کی وجہ سے پڑھا نہیں سکے گا اور قوم جاہل رہ جائے گی۔ ایک نسل بھی اگر جاہل رہ جائے تو ایک صدی تک معاشرے پر اس کے اثرات رہتے ہیں۔ یہ تو حکمرانوں کو سوچنا چاہیے کہ تعلیم اور صحت کی سہولت تو بنیادی مسائل ہیں جن کی طرف حکومت کو توجہ دینی چاہیے۔

سکول سے واپسی پر محترمہ قائداعظم کے مزار پر رکیں اور ہم نے فاتحہ پڑھی۔ کچھ دیر وہاں خاموش کھڑی رہیں۔ کچھ سوچتی رہیں اور پھر کہنے لگیں ''اگر قائداعظم اپنی صحت سے زیادہ غفلت نہ برتتے تو شاید اب تک زندہ ہوتے۔ میں نے ان کے ساتھ بہت طویل وقت گزارا ہے۔ دن رات انہیں کام کرتے دیکھا ہے۔ پاکستان بننے سے دس سال پہلے انہوں نے بے تحاشا کام کیا۔ ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں اپنی کمزور صحت کے باوجود جاتے تھے۔ میں بارہا پریشان ہو جاتی تھی اور انہیں اصرار سے کہتی تھی کہ کچھ تو اپنے متعلق بھی سوچا کریں۔ اپنی صحت اور اپنے آرام کا خیال رکھا کریں لیکن ان کا جواب ہمیشہ ایک ہی ہوتا:

''اس وقت برصغیر کے مسلمانوں کی بقا کا سوال ہے۔ میری صحت اہم نہیں۔ ان کا سوچنا ہے جو انگریز اور ہندو دونوں کے رحم و کرم پر ہیں۔ پھر ایک بار یہ بھی کہا کیا تم نے سنا ہے کہ کوئی جنرل جس کی فوج اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہو، چھٹی لے لے''

میں نے ان سے پوچھا ''محترمہ آپ کے خیال میں قائداعظم کی سیاسی زندگی کا مشکل ترین دور کونسا تھا؟

انہوں نے کچھ دیر سوچا۔ پھر فرمایا ''1940''۔ جب لاہور ریزولیوشن پاس ہوا۔ اس کے بعد 1947 تک 7 سال ان کی سیاسی زندگی کا بہت مشکل کٹھن اور دن رات محنت کا سفر تھا۔ ایک منٹ آرام یا چین نہیں تھا۔ فرصت نہیں تھی۔ بہت کام تھا۔ گھنٹوں کام کرنا پڑتا تھا۔ کھانے اور آرام کے اوقات بھی بعض دفعہ میسر نہ آتے تھے۔ وہ مسلم لیگ کے صدر بھی تھے اور مرکزی قانون ساز اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر بھی۔ سفر کرنا پڑتا تھا۔ اسمبلی کے اجلاس میں جانا پڑتا تھا۔ کمزور صحت کے باوجود پبلک کے اصرار پر سفر کرنا پڑتا تھا۔ خود بھی محسوس کرتے تھے کہ لوگوں سے رابطہ ضروری ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں بھی ان کے اجلاس میں شریک ہوتی۔ ان کی باتیں سنتی، ان کا عزم دیکھتی اور فخر سے میرا سر اونچا ہو جاتا کہ میرا بھائی 10 کروڑ مسلمانان ہند کا واحد لیڈر ہے جس نے قوم کا بیڑہ اپنے نحیف کندھوں پر مضبوطی سے اٹھایا ہوا ہے۔

میرے بھائی کو اللہ تعالیٰ نے بڑی شہرت دی، عزت دی، دولت دی جو انہوں نے اپنے وکالت کے پیشے سے کمائی۔ ساری زندگی پھر سیاست کی اپنا خرچ کیا، آرام دہ زندگی گزاری۔ ملک کو بھی اپنی قابلیت، اپنی محنت اور اپنی دولت دی۔ خدا

نے واقعی انہیں سب اعزاز بخشا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں''۔

میں تو آج بہت حیران ہوئی جب محترمہ نے بتایا کہ'' قائداعظم نے اپنی جائیداد کے کیسے حصے کئے۔ کتنا انصاف کیا۔ لیکن زیادہ انصاف اپنے ملک اور اپنی قوم سے ہی کیا۔ انہوں نے کہا کہ تقسیم سے پہلے ہی انہوں نے اپنی جائیداد قانونی طور پر بانٹ دی۔ زیادہ دولت اور جائیداد انہوں نے انجمن اسلامیہ سکول بمبئی کو دی۔ پھر سندھ مدرسہ کراچی اور اسلامیہ کالج پشاور کو دی۔ اس کے علاوہ علی گڑھ یونیورسٹی کو بھی بہت کچھ دیا۔ یہ سب دولت اور جائیداد ٹرسٹ کے حوالے سے باقاعدہ ان اداروں کو ملتی ہے۔ دینا۔۔ اپنی بیٹی کو بھی انہوں نے دیا لیکن ان اداروں کے مقابلے میں بہت کم۔ میرے رہنے کے لیے انہوں نے ''موہٹہ پیلس'' رکھا جو کلفٹن کراچی میں ہے اور ہر ماہ ایک مناسب رقم میرے اخراجات کے لیے مقرر کی۔ میرے بعد یہ ساری جائیداد بھی قائداعظم کے بنائے ہوئے ٹرسٹ میں چلی جائے گی۔

اور میں سوچتی رہی کتنے قابل فخر ہیں ایسے عظیم لوگ جو قوم اور ملک سے لینے کی بجائے اپنی محنت کی کمائی خوشی کے ساتھ بانٹتے ہیں۔ ایسا جذبہ اگر ہمارے چند امیروں میں بھی پیدا ہو جائے تو ملک کی اقتصادی حالت کتنی بہتر ہو جائے اور ملک ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن ہو۔ میں نے محترمہ سے بھی آج اس کا اظہار کیا'' مجھے دکھ ہوتا ہے محترمہ! جب ہمارے خوشحال لوگ صرف اپنی ذات اور نمود و نمائش پر بے تحاشا روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ لیکن کسی مستحق طالب علم کا باقاعدہ مہینہ مقرر نہیں کرتے تاکہ وہ پڑھ لکھ کر ایک اچھی زندگی گزارے اور معاشرے پر بوجھ نہ بنے۔ شادیوں پر اتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے کہ اس سے ایک خاندان بن سکتا ہے''۔

کہنے لگیں'' یہ جذبے کہنے سے نہیں پیدا ہوتے، جب تک خود احساس نہ

ہو۔ اس کے لیے ایک ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ باہر کی دنیا میں لوگوں میں مادہ پرستی ہے لیکن جہاں انسانیت کا سوال ہو، وہ لوگ بڑی دریا دلی کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہاں ان باتوں میں دکھاوا ہی زیادہ ہوتا ہے''۔

آج رات کھانے کے بعد کشمیر کے مسئلہ پر محترمہ فکرمند لگ رہی تھیں۔ کہنے لگیں۔'' قائداعظم نے ایک بار کہا تھا کہ پاکستان کو کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ پاکستان قائم رہے گا لیکن اس کے لیے کشمیر کا فیصلہ پاکستان کے حق میں ہونا بہت ضروری ہے۔ تقسیم کے بعد قائداعظم بہت تھوڑا عرصہ زندہ رہے۔ اس عرصے میں وہ بیمار بھی تھے۔ بعد میں شدید بیمار ہوئے۔ علالت کے ساتھ مہاجرین کی آباد کاری، مسلمانوں کا قتل عام، لوٹ مار، نئے ملک کے مسائل، کشمیر کی جنگ سب ایسی باتیں تھیں جنہوں نے قائداعظم کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا اور وہ زیادہ عرصہ زندہ رہتے تو شاید کچھ مسائل حل ہو جاتے''۔

آبدیدہ ہو کر بولیں'' انہوں نے جوانی سے بڑھاپے تک ساری زندگی پاکستان حاصل کرنے کے لیے داؤ پر لگا دی تھی۔ کبھی اپنی پروا نہ کی''۔

کتنی تلخ حقیقتیں ہیں لیکن اپنی جگہ موجود ہیں۔ خدا محترمہ کو زندگی دے۔ ان کے جذبے اس طرح جوان ہیں جس طرح تحریک پاکستان کے طویل اور صبر آزما سالوں میں تھے۔ حکومت کو ان کی صلاحیتوں اور ان کے مقام کا خیال کرتے ہوئے انہیں وہ مقام دینا چاہیے جس کی وہ حقدار ہیں۔۔ لیکن وہ ایسا نہیں سوچتے۔ ہماری قوم بدقسمت ہے کہ بابائے قوم کی عظیم بہن ہم میں موجود ہیں اور ہم ان سے فیض یاب نہیں ہوتے!

آج شام قاضی عیسیٰ اور ان کی خوبصورت بیگم سعیدہ عیسیٰ محترمہ سے ملنے آئے۔ کچھ دیر بعد حسن اصفہانی اور ان کی بیگم بھی آئے۔ یہ سب تحریک پاکستان میں

قائداعظم کے خاص ساتھی رہے ہیں اوران کی بڑی خدمات ہیں۔ بہت کام کیا ان سب نے۔محترمہ ان کے لیے بڑے پرخلوص جذبات رکھتی ہیں۔کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔تقسیم سے پہلے کی باتیں۔تحریک پاکستان کی باتیں۔

سب موجودہ حالات سے خوش نہیں۔حسن اصفہانی صاحب تو کہہ رہے تھے کہ انہیں ڈر ہے کہیں ملک میں مارشل لاء نہ نافذ ہو جائے۔فوج کو اختیارات زیادہ مل گئے ہیں اور مرکز کمزور ہے۔یہ بات تو تحریک پاکستان اور تکمیل پاکستان کی نفی میں ہے۔ سیاست پر باتیں سن کر ذہن روشن ہو جاتا ہے، روشنی نظر آتی ہے اور ذہن میں ہلچل مچتی ہے۔خورشید کہہ رہے تھے:

POLITICS IS THE BATTLE OF LIFE.

ٹھیک ہی کہتے ہیں۔شاید ایسا ہی ہے کیونکہ واقعی اس طرح محسوس ہوتا ہے۔

8مئی 1956

عورتوں کے بارے میں ہمارے رویے

محترمہ کے عزیز جو بمبئی سے ان دنوں آئے ہوئے ہیں، پیشے کے لحاظ سے بیرسٹر ہیں۔محترمہ ہی سے ملنے کے لیے آئے ہیں اس لیے زیادہ وقت ان سے ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف رہتے ہیں۔محترمہ کو آنٹی کہتے ہیں۔ان کی ایک بہن کے بیٹے ہیں۔ نشست گاہ میں آئے تو وہ بولے:

''آنٹی! پاکستان تو اسلام کے نام پر بنا تھا کہ مسلمانوں کا ایک الگ خطہ ہو گا، ان کی روایات زندہ ہوں گی۔ وہ اپنے تمدن اور کردار سے ایک آزاد قوم کا مقام حاصل کریں گے لیکن پاکستان میں آ کر جو حالات میں نے دیکھے ہیں ان سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اصل جذبہ مفقود ہو کر رہ گیا ہے اور دولت کی حرص بہت زیادہ ہو گئی ہے۔تجارت پہلے ہندو کے پاس تھی، اب ان کے پاس ہے جس کے باعث یہ اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکے۔اسی طرح اور اسلامی روایات یا ثقافت تو کہیں نظر نہیں آتی البتہ جہاں جہاں اسلامی اصول انہیں SUIT کرتے ہیں انہیں اپنا لیتے ہیں۔مثلاً پیسہ زیادہ آ جانے سے شادیاں ضرور کریں گے۔ویسے بھی انہیں اب پہلی بیوی ان پڑھ اور پھوہڑ لگتی ہے۔انہیں تو زندگی کے تگ و دو کے لیے ماڈرن بیوی کا ساتھ چاہیے اور یہاں فوراً مذہب کی آڑ لیتے ہیں کہ اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے''۔

محمد طارق اقبال پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

محترمہ خفیف سی ہنسی ہنسیں اور بولیں:

''اب تم وہاں سے پاکستان آ کر یہ احساس تو نہ دو کہ ہم نے ایک آزاد خطہ حاصل کرنے میں غلطی کی تھی۔ جذبہ جو تھا اس کی اہمیت اپنی جگہ قائم ہے۔ ہندو کا ساتھ دینے میں مسلمان بالکل ختم ہو جاتا۔ یہی تو ہندو کی گیم تھی جسے قائد اعظم نے بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔ اب اپنی حماقتوں کو ہم پاکستان اور مذہب کے نام کیوں تھوپیں۔ اب تم چار شادیوں کا ذکر کر رہے ہو۔ مانا کہ مذہب اس بات کی اجازت دیتا ہے لیکن احمق مرد یہ نہیں سوچتا کہ جب اسلام میں مسلمان مرد کو چار شادیوں کی اجازت ملی، اس وقت حالات کیا تھے۔ اس سے پہلے عرب میں لوگ بہت زیادہ شادیاں کرتے تھے اور چار شادیوں کی حد اس زمانے میں بڑی مناسب تھی۔ پھر اسلامی جنگوں کی وجہ سے اکثر مسلمان عورتیں بیوہ بھی ہو گئی تھیں اور رسول کریم ﷺ نے ان کی گھر آبادی کا بہترین طریقہ یہی سمجھا کہ مسلمان مرد ایک سے زیادہ شادیاں کریں۔ زمانے کے لحاظ سے وہ ٹھیک تھا لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔

اقتصادی لحاظ سے آج کل ایک عام شہری کے لیے ایک سے زیادہ بیوی کا بوجھ اٹھانا ناممکن ہے۔ پھر تعجب ہے کہ ہمارے مرد ہمیشہ اس بات کی کیوں آڑ لیتے ہیں۔ ہمیں حالات کے ساتھ اپنے آپ کو بدلنا چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ آج سے ہزار سال پہلے جو بات ضروری سمجھی جاتی تھی وہ اب بھی ویسی ہی اشد ضروری ہو۔ مسلمان لکیر کے فقیر ہیں اور اپنے مطلب کے لیے غیر ضروری اور غیر اہم باتوں کا سہارا لینے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے۔

مردوں کو بچپن سے برتری کا احساس گھروں میں دلایا جاتا ہے۔ ماں عورت

ہونے کی حیثیت سے بیٹوں کے مقابلے میں بیٹیوں سے زیادہ اچھا سلوک نہیں کرتی جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گھروں میں بہن بھائی جب اکھٹے ہوتے ہیں تو بھائیوں میں احساس برتری کا مادہ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ وہ بہنوں کو ڈانٹتے بھی ہیں اور رعب بھی جھاڑتے ہیں اور ہر بات پر اسے اس کی کمزوری کا احساس دلاتے ہیں۔ یہ بہت بری بات ہے۔ اس کا اثر لڑکی کی آئندہ زندگی پر بھی پڑتا ہے۔ وہ جوان ہو جانے پر بھی ہر وقت بعض باتوں میں سہمی سہمی سی رہتی ہے۔ کوئی کام آزادی سے نہیں کر سکتی۔ ہر بات میں اس پر ایک ناقابل بیان خوف طاری ہو جاتا ہے''۔

پھر ایک واقعہ سنانے لگیں کہ:

''تقسیم سے پہلے دہلی میں ایک مرتبہ وہ خان آف قلات کے ہاں گئیں۔ ان کی بیگم ان کے ساتھ ڈرائیو (DRIVE) کے لیے جا رہی تھیں۔ باغ میں ان کا ایک چھ سال کا لڑکا اپنی موٹر سے کھیل رہا تھا۔ مس جناحؒ کو دیکھ کر قریب آ گیا۔ انہوں نے کہا کہ DRIVE کو چلو گے؟ تو برا سا منہ بنا کر کہنے لگا:

''جی نہیں میں عورتوں کے ساتھ باہر نہیں جایا کرتا''۔

اندازہ کیجیے کہ ایک چھ سالہ لڑکے کے تاثرات بھی ایسے ہو سکتے ہیں۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ اسے شروع ہی سے یہ احساس دلایا گیا ہے کہ وہ اپنی بہن سے ہر لحاظ سے برتر ہے اور یہی اثر اس کی ساری زندگی پر حاوی رہتا ہے۔

عام طور پر بھی بھائی کبھی بہنوں اور ماؤں سے MIX UP نہیں ہوتے۔ صرف اس لیے کہ انہیں ان کی محبت دلچسپ نہیں لگتی۔۔۔ یہ سب کیوں؟ یہ معمولی بات نہیں۔ یہ مسلمان مرد کی اخلاقی گراوٹ کی ایک بہت بڑی وجہ ہے۔

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

اس کے برعکس ہندو عورتیں بھی ''پتی پوجا'' کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتی ہیں۔ مسلمان عورت سے بھی زیادہ شوہر کے آرام کا خیال رکھتی ہیں۔ لیکن ایک بات ضرور ہے کہ ان کے مردوں کو ان کا خیال ہوتا ہے۔

مس جناح کی باتیں سن کر ان کے وہ عزیز بولے:

''آپ درست کہتی ہیں لیکن اس ظلم اور ناانصافی کے خلاف خود مسلمان عورتیں ہی آواز کیوں نہیں اٹھاتیں۔ وہ یہ سب کچھ کیوں سہتی ہیں؟''۔

مس جناح ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگیں:

''لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ہماری عورتوں میں اس بات کی اہلیت نہیں، ہماری چند فی صد عورتیں بھی، جنہوں نے سوسائٹی میں جانا شروع کیا ہے۔ اس قابل نہیں ہیں۔ ضرورت سے زیادہ آزادی بھی انہیں راس نہیں آتی اور باہر نکلنے والی عورتیں بجائے اس کے کہ کام کریں، محض سکینڈل کا شکار ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس میں عورتوں اور مردوں دونوں کا قصور ہے۔ دراصل حالات اس وقت تک بہت بہتر نہیں ہوں گے جب تک سارے نظام میں ایک انقلاب نہ آئے اور ہم میں سے پھر کوئی امیر اور کوئی غریب اپنی اس قومی پستی پر غور نہ کرے''۔

آج ایسا دلچسپ موضوع زیر بحث تھا کہ جب میں کمرے میں آئی تو ساڑھے تین بج رہے تھے۔ خورشید ابھی تک لاہور سے واپس نہیں آئے۔ غالباً آج آجائیں گے۔ میں بعض اوقات سوچتی ہوں کہ اگر یہاں مس جناح کی پرخلوص محبت میسر نہ ہوتو میرا یوں زیادہ وقت تنہا گزارنا مشکل ہو جائے۔ وہ کتنی دلچسپ باتیں کرتی ہیں۔

رات کھانے کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے بات یہاں آکر رک گئی کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ مجموعی طور پر تمام دنیا کے مسلمانوں کی حالت نہایت پست ہے۔ صرف معمولی فرق ہے ورنہ ہم میں بعض خامیاں ایسی ہیں جو دنیا کی دوسری قوموں میں نہیں ملتیں اور ہم یہ محسوس کرتے ہوئے بھی خود کو تبدیل نہیں کرنا چاہتے۔

کہاں آج سے صدیوں پہلے ہم دنیا کی دوسری اقوام سے ہر شعبہ زندگی میں افضل تھے اور اب یوں لگتا ہے گویا ہم سماجی، اخلاقی اور مالی حالات میں صدیوں پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ کتنا افسوس کا مقام ہے لیکن اس کی اصل وجہ ہم میں سے کسی نے کبھی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

معمولی معمولی بات پر ہم لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ دھوکہ دہی کو کردار کا نام دیتے ہیں۔ چند سکوں کی خاطر قوم اور ملک سے بھی دغا کر جاتے ہیں۔ اخلاقی طور پر پستی کا شکار ہیں۔ آخر یہ سب کیوں؟۔

مس جناح کہنے لگیں:

''دراصل اس تمام پستی کی اصل وجہ ہمارا وہ پردہ سسٹم ہے جس سے ہماری عورتیں گھر کی چار دیواری میں بند رہتی ہیں اور انہیں اپنے گردوپیش کے حالت اور اپنے ملک کے متعلق کوئی واقفیت ہی نہیں ہوتی۔ ان کی انفرادی حیثیت محض بچوں کی ماں اور شوہر کی لونڈی کی سی ہوتی ہے جس کا ظاہراً نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس جہالت اور اندھیرے ماحول میں وہ ایک بہترین ماں ثابت نہیں ہو سکتیں۔ ایک اچھی ماں سوسائٹی کی بنیادیں استوار کرتی ہے لیکن ایسی صورت میں وہ بچوں میں وہ اوصاف پیدا

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

نہیں کر سکتی تو ایک زندہ اور خوددار قوم کے لیے ضروری ہیں۔ مسلمان مرد فطرتاً لاپروا واقع ہوا ہے۔ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت باہر گزارتا ہے۔ گھر کو ایک ہوٹل سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا اور اس طرح ایک عام مسلمان گھرانے کا ماحول درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ شوہر کو بیوی سے وہ دلچسپی نہیں ہوتی جو ایک محبت کرنے والے مخلص شوہر کو ہونی چاہیے اور باپ بچوں میں وہ دلچسپی نہیں لیتا جس کے نہ ہونے سے بچوں کو ایک اچھے گھر کا ماحول نصیب نہیں ہوتا اور جس کا اثر بچے کی آئندہ زندگی پر بہت برا پڑتا ہے۔ مسلمان ماں جاہل ہے اور مسلمان باپ لاپروا۔ ایک امیر مسلمان باپ عیاش واقع ہوا ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی قوم روپے کا ایسا ناجائز استعمال کرتی ہو جس طرح مسلمان امیر کرتے ہیں۔ ورنہ یورپ، امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں اگرچہ مرد عورتوں پر روپیہ خرچ کرتے ہیں، شراب اور قہوہ خانوں میں اپنی راتیں بسر کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ایک اعتدال ضرور ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمان مرد جو کچھ کرتا ہے اندھا دھند کرتا ہے"۔

میں یہ دلچسپ اور ٹھوس باتیں سن کر بہت افسردہ ہو گئی۔ محترمہ نے میری طرف دیکھ کر کہا:

"تمہاری GENERATION پر تو بہت ذمہ داریاں آ پڑی ہیں۔ تم کیوں گھبرانے لگیں۔ تم پڑھی لکھی ہو۔ ان سب بے انصافیوں کے خلاف تمہیں آواز اٹھانا ہے۔ اپنے حقوق کی جدوجہد کے لیے ہمت کرنا ہے، شور مچانے اور بے کار باتوں سے آج تک کچھ حاصل نہیں ہوا۔ عمل کی ضرورت ہے۔ ہمت، عمل اور خلوصِ دل سے تم لوگ وہ پاکستان ضرور حاصل کر لو گے جس کے لیے اتنی قربانیاں ہم سب

نے دی۔ قائداعظم نے آپ لوگوں کو ملک دے دیا۔ اب سنبھالنا اور بنانا آپ لوگوں کا کام ہے۔ بدقسمتی سے وہ زیادہ دن ہمارے ساتھ نہ رہے۔ زندگی انہیں مہلت دیتی تو وہ شاید اور بہت کچھ کرتے لیکن اب سب کچھ آپ لوگوں نے کرنا ہے۔ ایک ایک فرد سے قوم بنتی ہے۔ تمہارا فعل بھی قومی کردار تشکیل کرتا ہے اور یہی بات ہم سب کو سمجھنا ہے"۔

آج رات جب سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو یہ سب باتیں میرے ذہن اور دل و دماغ پر حاوی تھیں۔ میں سوچتی رہی اور پھر یوں لگا گویا ایک سکون مجھے مل گیا ہے اور میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے خود سے کہا:

"ان شاءاللہ ہم ایک نیا پاکستان بنائیں گے۔ ایک صحت مند معاشرہ، ایک پروقار قوم دنیا کے نقشے پر ابھرے گی۔ ہم افلاس کے خلاف جدوجہد کریں گے۔ سماجی بے انصافیوں کے خلاف آواز اٹھائیں گے اور اپنے حقوق کا تحفظ کریں گے۔

محترمہ! خدا آپ کو عمرِ خضر عطا فرمائے تاکہ آپ ہمارے شعور کو بیدار کرتی رہیں......" اور میں کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ ایک بے طرح اطمینان کے ساتھ......

10 مئی 1956

چھوٹے چھوٹے جھوٹ

آج حسب معمول جب ہم سٹڈی میں آ کر بیٹھے تو محترمہ اپنے دونوں بیروں کے متعلق بتانے لگیں کہ کچھ ضروری کاغذ سیکرٹری کو دینا تھے۔ ایک کہتا ہے کہ میں مصروف ہوں۔ میں نے دوسرے سے کہا کہ وہ پہنچا دے۔ دوسرا کہتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ دونوں میں سے کوئی تو جھوٹ بولتا ہے لیکن مانتا ایک بھی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جھوٹ بولنے میں ہم لوگ کوئی شرم محسوس نہیں کرتے اور نہ ہی یہ خیال آتا ہے کہ ہم کوئی غلط کام کر رہے ہیں۔ جھوٹ بولنے میں گویا کوئی قباحت ہی نہیں ہے۔

اپنے ڈرائیور کے متعلق بتانے لگیں کہ:

اگر چہ وہ نوکروں کو پیشگی تنخواہ دینے کی قطعاً قائل نہیں کیونکہ یہ خلاف اصول ہے۔ قائداعظم بھی ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ تنخواہ میں ایک دن کی دیر نہیں لیکن وقت سے پہلے دینا بھی غلط ہے۔ لیکن یہ ڈرائیور ہمیشہ بیوی کی بیماری کا بہانہ کر کے مجھ سے پیشگیاں وصول کرتا رہا۔ وہ میں اس لیے دیتی رہی کہ وہ وقت کا پابند تھا اور گاڑی بھی اچھی چلاتا تھا۔ اس بار دو روز کی چھٹی پر گیا، چار روز تک واپس نہیں آیا تو انہوں نے اس کے دیے ہوئے پتے پر دوسرے نوکر کو لانڈھی بھیجا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہ اکیلا ایک کوارٹر میں رہتا تھا۔ بیوی بچے یا تو تھے ہی نہیں یا اس کے ساتھ نہیں تھے۔ وہاں سے اچانک کسی کو بتلائے بغیر اپنے وطن چلا گیا ہے۔ اسے کئی لوگوں کے پیسے بھی دینا تھا جنہیں کچھ بتائے بغیر وہ چپ چاپ چل دیا۔

کہنے لگیں:

''بات اتنی سنگین نہیں لیکن ہے بھی۔ ایک ذرا سی بات انسان کا کردار بناتی ہے۔ آج اس نے معمولی دھوکا دیا ہے، کل بڑے دھوکے اور جرم کا مرتکب بھی ہو سکتا ہے۔ انسان ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا، لیکن یہ چھوٹی موٹی باتیں انسان کا کردار بناتی ہیں اور ہم خود کو ایک ایسے فریب میں مبتلا رکھتے ہیں جو حقیقت میں کچھ نہیں ہوتا''۔

میں نے آج گھر میں مارملیڈ بنایا۔ محترمہ کو مارملیڈ بہت پسند ہے۔ ناشتے پر ضرور کھاتی ہیں۔ مجھے کہنے لگیں:

''تم ایسی چیزیں اچھی بنا لیتی ہو، اسے ایک کاٹیج انڈسٹری کے طور پر شروع کیوں نہیں کرتیں۔ گھر بیٹھے بٹھائے شغل الگ اور آمدنی الگ''۔

میں نے کہا ''کئی بار سوچا ہے لیکن عجیب سا لگتا ہے کہ انسان اب یہ کام کرے۔ ہمارے جیسے پڑھے لکھے لوگ اور بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں''۔

بولیں: ''محنت اور باوقار محنت میں کیا عار ہے۔ ایک گھریلو عورت کے لیے نوکری کرنا اتنا آسان کام نہیں ہوتا۔ گھر چلانا اور خوش اسلوبی سے چلانا کافی محنت طلب ہے اور دن رات کی مصروفیت رہتی ہے۔ ایسا کام اس مصروفیت میں بھی باآسانی ہو سکتا ہے۔ پھر ہم لوگ ان باتوں کو کیوں برا سمجھتے ہیں۔ آخر برائی کیا ہے؟ اب میں تمہیں بتاؤں کہ میں اپنے لیے اکثر بوہری بازار کی کٹ پیس دکانوں سے کپڑے خریدتی ہوں۔ کئی بیگمات بھی اکثر میرے ساتھ جاتی ہیں۔ لیکن کپڑے کے متعلق کوئی ان سے پوچھے تو ہمیشہ الفنسٹن سٹریٹ کی کسی بڑی دکان کا نام بتاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم جھوٹی باتوں کو اپنا وقار اور عزت بنا لیتے ہیں۔ حقیقت سے

منہ چھپاتے ہیں، کتنی بری بات ہے یہ"۔

شام کو کلفٹن کی طرف ڈرائیو کرنے گئے۔ واپسی پر صدر کی ایک مخصوص دکان پر جہاں سے محترمہ ہمیشہ پھل خریدتی ہیں، ہم لوگ رکے۔ آموں اور امرودوں کا بھاؤ پوچھا تو دکاندار کہنے لگا

"آم دوسروں کے لیے پانچ روپے سیر، لیکن آپ کے لیے ساڑھے چار روپے سیر۔ امرود دوسروں کے لیے دو روپے سیر لیکن آپ کے لیے ڈیڑھ روپے سیر۔"

اس کا خیال تھا کہ اس قسم کی بات کرکے وہ انہیں متاثر کر سکے گا۔ لیکن محترمہ الٹا ناراض ہوگئیں اور بولیں:

"میرے لیے یہ علیحدہ بھاؤ آخر کیوں؟ اگر ریٹ وہی ہے تو مجھے دوسرا کیوں بتاتے ہو؟ مفت کا احسان کس لیے؟ میں ان باتوں کو بہت برا سمجھتی ہوں"۔

دکاندار کھسیانا سا ہوگیا اور معافی مانگنے لگا۔ میں نے مسکرا کر انہیں فارسی کی ایک کہاوت سنائی اور کہا کہ ایسی باتوں کو "مفت کرم داشتن" کہتے ہیں۔ بولیں:

"قصور دکاندار کا بھی نہیں، یہ بھی ایک قومی کردار بن گیا ہے کہ یونہی بغیر کسی وجہ کے دوسروں پر احسان جتانا اور جھوٹی باتوں سے انہیں متاثر کرنا۔ ہمارے لوگ ان باتوں کو سچ سمجھ کر اکثر دھوکا کھا جاتے ہیں"۔

13 مئی 1956

کم ظرف افسر

آج عید ہے۔ کل شام جب چاند دیکھا تو دعا کرنے کے بعد میں محترمہ کے پاس گئی اور انہیں مبارکباد دی۔ وہ بیرے کو عید کے انتظامات کے سلسلے میں ہدایات دے رہی تھیں۔ کہنے لگیں۔

"صبح بہت لوگ آئیں گے۔ اس لیے نماز کے بعد اسے جلد یہاں پہنچ جانا چاہئے"۔

آج صبح بہت لوگ گھر میں آئے۔ سیاست دان، اخبار نویس، پبلک کے لوگ، حکومت کے ریٹائرڈ ملازمین، پرانے مسلم لیگی، مرد اور عورتیں سب آج فلیگ سٹاف ہاؤس میں محترمہ کو عید ملنے آئے۔ سب سے خوشی خوشی عید ملتی رہیں اور دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ اور سیاست پر بھی باتیں ہوتی رہیں۔ شام کو ہنستے ہوئے کہنے لگیں۔

"حکومت کے اعلیٰ افسروں سے میں خود بھی نہیں ملتی لیکن وہ بھی ملنے نہیں آتے، مبادا کوئی حکومت کو ان کی شکایت کر دے گا۔ کوئی کردار نہیں ہے ان لوگوں کا۔۔۔ کم ظرف لوگ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ منصب اور عہدے ہمیشہ ان کے پاس رہیں گے۔ کتنی عجیب بات ہے"۔

آج دوپہر کے کھانے پر پلاؤ، بھنا ہوا گوشت، فرائی مچھلی اور قورمہ تھا۔ صبح ناشتے پر سویوں کا زردہ اور دوپہر کے کھانے پر میٹھے کی جگہ سویوں کی کھیر تھی۔ نوکروں

کے نوکروں میں محترمہ نے آج ایک سو روپے عیدی دی اور میں نے سلام کر کے شکریے کے ساتھ قبول کی۔ شام کو سوائے ایک بیرے کے انہوں نے سب نوکروں کو چھٹی دی۔ کہہ رہی تھیں کہ اس بیرے کو کل چھٹی دوں گی۔ اس کی فیملی یہاں نہیں رہتی اس لیے عید کے دوسرے روز بھی جا سکتا ہے۔ ویسے بھی محترمہ ہر نوکر کو ہفتہ میں ایک دن صبح سے شام تک ضرور چھٹی دیتی ہیں، کہتی ہیں:

''یہ ان کا حق ہے اور وہ تازہ دم ہو جاتے ہیں''۔

رات کا کھانا ہم نے باہر کھایا اور شام کو احباب سے ملنے گئے۔ محترمہ آج دن بھر مصروف رہیں۔ تھک گئی ہوں گی۔

15 مئی 1956

شگفتہ قہقہہ

آج ایک پرانے سیاستدان، ان کی بیگم اور بیٹی محترمہ سے ملنے آئے اور بہت دیر تک بیٹھے رہے۔ ان کی جواں سال بیٹی نے پتلون اور چھوٹا سا بلاؤز پہن رکھا تھا اور منہ بنا بنا کر نہایت مصنوعی طریقے سے انگریزی بولتی تھی۔ دونوں میاں بیوی اس کی باتیں سن کر خوش ہو رہے تھے اور بار بار محترمہ سے کہتے تھے کہ یہ لٹریچر میں ہمیشہ فرسٹ آتی ہے اور اسے بہت جلد کیمبرج بھجوانا چاہتے ہیں تاکہ یونیورسٹی تعلیم وہیں مکمل کرے۔ اس کا ارادہ پی ایچ ڈی کرنے کا ہے اور مشرقی تہذیب پر تھیسس THESIS لکھے گی۔ محترمہ نے نہایت شگفتہ قہقہہ لگایا اور کہنے لگیں:

''مشرقی تہذیب پر تم تھیسس لکھو گی، جو اپنا لباس پہنتے ہوئے بھی شرماتی ہو''۔

ان کے جانے کے بعد محترمہ رات کافی دیر تک بڑھتے ہوئے مغربی اثرات ان کی اندھا دھند تقلید پر باتیں کرتی رہیں۔

میں نے کہا محترمہ! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے خاندانی لوگ اپنی تہذیب کو اتنا گھٹیا کیوں سمجھنے لگتے ہیں کہ ہر چیز آہستہ آہستہ چھوڑ دیتے ہیں''۔

کہنے لگیں: ''اس میں ان کا صرف یہ قصور ہے کہ وہ نفسیاتی مریض ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ غیروں کی چیز اپنانے سے وہ کوئی بڑے آدمی بن جائیں گے اور یہ نہیں سوچتے کہ جب انہوں نے اپنا لباس چھوڑا، زبان چھوڑی، تہذیب وتمدن چھوڑا، رسم و

رواج سے شرمانے لگے تو وہ خود کیا رہیں گے۔ اپنی بعض چیزیں بری ہی سہی لیکن ہیں تو اپنی۔۔۔ اور ان کے اپنانے میں ہی ہماری عزت اور بڑائی ہے۔ مغربی قوموں کو دیکھیں تو سینکڑوں سال کی پرانی روایات کو ابھی تک سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ اس کے باوجود ان میں بڑھتی ہوئی آزادی اور بے راہ روی انہیں کہاں سے کہاں تک لے گئی ہے کہ انہیں خود بھی یہ علم نہیں ہے کہ آخر اب کیا ہوگا؟ وہ لوگ ایک دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں سے انہیں کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ یہ حقیقت ہے کہ زمانے کے بڑھتے ہوئے اثرات سے انسان بچ نہیں سکتا لیکن یہ بات کبھی نہ بھولو کہ انسان کی بنیادی قدریں BASIC HUMAN VALUES ہمیشہ وہی رہتی ہیں۔ انہیں وقت کا کوئی دھارا اور کوئی حادثہ بدل نہیں سکتا۔ یہ خود ہماری کمزوری ہے کہ ہم انہیں بدل دیتے ہیں۔ اب اس لڑکی کو دیکھو، جو ابھی آئی تھی۔ انگریزی ہم بھی بولتے ہیں اگرچہ یہ غیروں کی زبان ہے لیکن دنیا میں رہنے کے لیے اسے سیکھنا اور بولنا ضروری ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ بین الاقوامی زبان بن گئی ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ اسے یوں منہ بنا بنا کر بولا جائے کہ نفرت ہونے لگے۔ ہمارے لوگوں کا یہی قصور ہے کہ اندھا دھند دوسروں کی تقلید کرتے ہیں اور اپنی راہوں سے بھٹک جاتے ہیں''۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ محترمہ کتنے مخصوص خیالات کی مالک ہیں۔ وہ بنیادی طور پر حد سے زیادہ مشرقی روایات کی امین ہیں۔ قوم و ملت کی ایک ایک چیز سے انہیں بے پناہ لگاؤ اور محبت ہے اور وہ ان لوگوں کو انتہائی پست سمجھتی ہیں جو اپنے اصل راستوں سے بھٹک جاتے ہیں اور مغربی تہذیب و تمدن کی فرسودہ روایات کو اختیار کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

16 مئی 1956ء

رزقِ حلال

محترمہ اکثر شام کو ڈرائیو کے لئے جاتی تھیں۔ ان دنوں کراچی میں بھی اتنا رش نہیں تھا اور ڈرائیو کے لئے جانا بہت اچھا لگتا تھا۔ سمندر کی طرف جایا کرتی تھیں۔ یہاں کی ہوا معطر اور خوشگوار ہوتی تھی۔ اس شام انہوں نے ملیر جانے کا ارادہ کیا۔ کراچی میں مجھے آئے چند ماہ ہی ہوئے تھے لیکن میں ابھی تک ملیر نہیں گئی تھی۔ اس لئے میں خوش ہوئی کہ آج اس طرف ڈرائیو کے لئے جائیں گے۔

راستے میں انہوں نے بتایا کہ قائداعظمؒ کی بہت اراضی ملیر میں ہے۔ جو انہوں نے تقسیم سے کئی سال پہلے خریدی تھی جہاں پھولوں کے باغات ہیں اور مقامی فصل بھی اُگتی ہے۔ مزارعے سنبھالتے ہیں اور ٹھیکے پر یہ زمین سالوں سے ہے۔ محترمہ کو وہاں سے پھل اور سبزی وہ لوگ پہنچاتے ہیں۔ ان کے بعد یہ زمین بھی محترمہ کی دوسری ملکیت کی طرح قائد ٹرسٹ کو مل جائے گی۔ میں سوچتی رہی کہ قائد جیسا آدمی جنہوں نے قوم کا بیڑہ اُٹھایا اور اپنی محنت اور لگن سے رزق حلال میں اتنی جائیداد بنائی۔ کتنا قابل تحسین ہے۔ اس لئے وہ خوشحال ہونے کی وجہ سے پوری یکسوئی سے تحریک پاکستان اور آزادی کے حصول کے لئے کام کرتے رہے ورنہ غم روزگار کب انسان کو سکون سے کام کرنے کی مہلت دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قائداعظمؒ نے بہت تنظیم سے اپنی زندگی سنواری اور قوم کو بھی یہی درس دیتے رہے۔

میری وسیع وعریض ریتلی زمین دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ سوکھی سبزی کے ساتھ ساتھ پپیتا کے درخت بھی بہت تھے اور فالسے کی بے شمار جھاڑیاں فالسے اور ارغوانی پھل سے لدی ہوئی تھیں۔ زمیندار اور اس کے آدمی محترمہ کو دیکھ کر آئے۔ مسکراہٹ سے ان کا استقبال ہوا۔ محترمہ نے ان کا حال احوال پوچھا اور پھر دور خلا میں دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔ ''قائداعظمؒ نے یہ زمین خریدی لیکن خریدنے کے بعد کبھی یہاں نہیں آسکے۔ ان کی مصروفیات ہی کچھ ایسی تھیں کہ اپنی ذات کے لئے بھی کبھی زیادہ وقت نہ ملا۔ نہ ہی اپنے نصب العین کی وجہ سے انہوں نے اس کی ضرورت سمجھی۔''

زمیندار نے سبزیوں کے ساتھ ایک بڑی ٹوکری بھر کر فالسے کی دی۔ واپسی پر محترمہ کہنے لگیں۔ ''فالسے کا شربت بڑا اچھا ہوتا ہے۔ ٹھنڈا اور ذائقہ دار۔ قائداعظمؒ کو بھی یہ مشروب کے طور پر پسند تھا۔ مجھے بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ اگر تم نوکروں کی مدد سے بنا سکو تو کل کے ڈنر میں ہم مہمانوں کو بھی یہی دے دیں گے۔''

میں اس کم عمری میں کھانا پکانا زیادہ تو نہیں جانتی تھی لیکن اندازہ ہر چیز کا تھا۔ میں نے جواب دیا۔ ''ضرور بناؤں گی۔ تازہ رس تو بہت اچھا ہوتا ہے۔'' دوسرے روز محترمہ کے ہاں ان کے قریبی احباب کھانے کے لئے مدعو تھے۔ میں نے خانساماں کی مدد سے ایک بہت بڑے دیگچے میں فالسے چینی اور پانی ڈال کر اُبالا۔ ٹھنڈا ہونے پر چھان کر مہمانوں کو کھانے سے پہلے پیش کیا۔ سب کو بہت پسند آیا۔ محترمہ سب کو بتا رہی تھیں کہ یہ میں نے تیار کیا ہے حالانکہ ترکیب تو اندازے سے ہی اپنائی تھی لیکن شکر ہے شربت بہت عمدہ بنا۔

17 مئی 1956

بین المذاہب شادیاں

آج محترمہ کو چند خواتین ملنے آئیں۔ باتوں باتوں میں محترمہ کی ایک شناسا خاتون کا ذکر چل نکلا تو انہوں نے بتایا کہ ان کی بیٹی نے جو پیرس میں LANGUAGE پڑھنے گئی تھی، ایک فرانسیسی سے شادی کر لی۔ اس سے پہلے ان کے بیٹے نے کراچی میں ایک پارسی سے شادی کر لی تھی۔

مس جناح بہت حیران ہوئیں اور کہنے لگیں۔

''غیر مذہب کی شادیاں بہت بری ہوتی ہیں۔ نسل در نسل ان کے اثرات چلتے ہیں، شادی کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ یہ صرف ان کی زندگی کا سوال نہیں ہے بلکہ ان کی آئندہ نسلوں کی بقا کا مسئلہ بھی ہے جو نہ اِدھر کی رہیں گی نہ اُدھر کی''۔

ایک خاتون بولیں:

''محترمہ! یہ بھی ایک مسئلہ ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ دو متضاد مذہبوں اور تہذیبوں سے بچے مخلوط قسم کے خیالات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عورت کے متعلق تو مشہور ہے کہ اپنا مذہب کبھی نہیں چھوڑتی، چنانچہ اگر ایک غیر ملکی عورت ہمارے کسی مرد سے شادی کر بھی لے اور زبان سے مسلمان ہو بھی جائے تب بھی حقیقت میں اس کے لیے خاوند کا مذہب اختیار کر لینا ایک ناممکن سی بات ہوتی ہے۔ اکثر گھروں میں دیکھا گیا ہے کہ ایسی بیویاں کرسمس اور نیا سال عید سے زیادہ خوشی اور اہتمام کے ساتھ مناتی ہیں۔ اگر اسے اپنے لیے نہیں تو اپنے بچوں کی خاطر شادی کے

بعد اپنے خاوند کا مذہب اختیار کر لینا چاہیے تا کہ بچوں کے ننھے منے دل و دماغ میں کوئی کشمکش اور الجھن پیدا نہ ہو کہ ان کا راستہ کونسا ہے۔ دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ بچے ہمیشہ ماں سے متاثر ہوتے ہیں اور ماں ہی کا مذہب اختیار کرتے ہیں اور اگر وہ ماں کا مذہب اختیار نہیں کرتے تو پھر انہیں باپ کے مذہب سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

میں نے کہا:

''محترمہ بعض ماڈرن لوگ تو یہ بھی سمجھتے ہیں کہ سارے مذہب ایک ہی راستہ دکھاتے ہیں تو پھر اس قسم کی تخصیص کیوں؟''۔

کہنے لگیں۔

''یہ ٹھیک ہے لیکن عقیدے کے بغیر آپ کہاں تک رہیں گے۔ مذہب ایک ایسی قوت ہے جو اندھیروں میں محبوس دلوں کے اندر روشنی کی کرن پیدا کرتا ہے جو بھٹکے ہوئے اور گمراہ لوگوں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتا ہے۔ انسان کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ایک عقیدہ جس پر کار بند ہو کر وہ صحیح اور حقیقی زندگی بسر کر سکے۔ اگر ہم روز قرآن پاک نہیں پڑھتے، پانچ وقت کی نماز ادا نہیں کرتے، باقاعدہ روزہ نہیں رکھتے لیکن ایک عقیدہ تو ہمارا ہے۔ اور اگر ہم زندگی کے ان ارفع مقاصد کو پورا نہیں کر رہے جنہیں بحیثیت ایک مسمان ہونے کے پورا کرنا ہمارا فرض ہے تو ہمیں ہر وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ان فرائض کی ادائیگی میں اگر تساہل سے کام لیا گیا تو ہم ایک بلند مقام سے اسفل مقام پر آ جائیں گے۔ چنانچہ اس کے لیے ضروری ہے کہ مذہب پر ہمارا مکمل ایمان ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب ہمارے والدین کا مذہب بھی ایک ہو۔ جدا مذہب والے والدین اپنے بچوں کو کچھ نہیں سکھا سکتے''۔

پھر وہ افسردہ ہو کر بولیں:

''اب قائد اعظم کی زندگی ہی کو دیکھیں تو کتنا بڑا سبق ملتا ہے۔ ان کی بیوی باقاعدہ مسلمان ہوئی لیکن اس کے مرنے کے بعد بیٹی نے دوسری تہذیب میں پرورش پائی اور اولاد کے ہوتے ہوئے بھی وہ تمام عمر تنہا رہے۔ اس سے بڑی مثال ہمارے لیے اور کیا ہو سکتی ہے''۔

میں دیر تک سوچتی رہی۔ کاش! ہم لوگ محترمہ کی باتوں سے زندگی کا سبق حاصل کریں۔ وہ تو سراپا داستان ہیں۔ ایسی ایسی مدلل اور جامع باتیں کہتی ہیں کہ ہم چاہیں تو ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

19 مئی 1956

مردوں کی زیادتیاں

آج کھانے کے بعد لیڈی ہدایت اللہ نے محترمہ کو ایک بارسوخ شخصیت کے متعلق بتایا کہ اس نے ملک میں ایک عام سی لڑکی سے چوری شادی کر لی ہے اور اب اسے اپنی بیوی اور چار بچوں سے کوئی سروکار نہیں۔ بیوی بچوں کے اخراجات کا سلسلہ بھی بند ہے اور وہ عورت نہایت پریشان ہے۔ ساتھ ہی بولیں۔ وہ شخص ہمیشہ سے ایسا تھا یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

میں نے کہا۔

''پھر کیوں اس نے زندگی کے اتنے قیمتی سال ایسے مرد کے ساتھ گزار دیئے جو اتنا بے وفا تھا''۔

محترمہ بولیں۔

''ہماری عورتیں اکثر خاندان اور والدین کی ناموس اور عزت، بچوں کی بہبودی اور بہتری اور سوسائٹی میں اپنے مقام کی خاطر مرد کی زیادتیاں برداشت کرتی ہیں کیونکہ معاشرے میں ایسی عورت کا واقعی کوئی مقام نہیں ہوتا جو خاوند کو چھوڑ کر الگ ہو جائے۔ پھر بعض اوقات مالی مشکلات بھی درپیش ہوتی ہیں۔ لیکن یہ ظلم کی انتہا ہے کہ ہماری مظلوم عورتیں مردوں کے سب مظالم سہتی ہیں۔ مرد کو یقیناً کوئی حق نہیں کہ وہ شادی کے بعد بیوی بچوں کے ساتھ ایسی بے انصافی کرے اور اس سے بے وفائی کرے اور برے کاموں پر وقت اور روپیہ خرچ کرے۔ عورت کو جتنا رتبہ اور مقام

اسلام نے دیا ہے کسی دوسرے مذہب نے نہیں دیا۔ لیکن ہوتا اس کے برعکس ہے۔ دنیا میں شاید مسلمان مرد ہی اپنی بیوی پر اس قدر ظلم اور ناانصافی کرتا ہے۔ وہ اسلام میں چار شادیوں کی شرط کو جو صرف خاص حالت میں جائز ہے، جب جی چاہے اپنے لیے جائز بنا لیتا ہے۔ ہر عورت کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں اس کا خاوند ذرا سی شکر رنجی پر دوسری شادی نہ کر بیٹھے۔ یہ کتنی بڑی ذہنی کوفت ہے۔ ہماری اکثر عورتیں اس وہم سے پریشان رہتی ہیں''۔

میں نے پوچھا محترمہ! آخر یہ سب کچھ روکا کیسے جائے اور عورت کی انفرادی حالت کیسے درست ہو؟''۔

''اگر ہماری عورتیں ایک حد سے گزرنے پر مرد سے اخلاقی طور پر بدلہ لیں''۔ وہ کچھ سوچ کر بولیں ''انہیں چھوڑ دیں تو ہو سکتا ہے سوسائٹی کا یہ ناسور دب جائے۔ مردوں کے دل میں یہ بات بس گئی ہے کہ ان کی بیویاں انہیں چھوڑ کر کبھی نہیں جائیں گی۔ خاندان کی عزت، بچوں کا مستقبل، غیر شعوری طور پر شوہر سے محبت ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دے گی۔ اگر ایسا ہی ہوا تو پھر کیوں نا ایسی زندگی گزاری جائے جو خوشگوار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مثال بن جائے۔ عورت کا فرض ہے کہ وہ مرد کو سمجھائے۔ خاندان اور بچوں کی ذمہ داریاں اسے یاد دلائے۔ معاشرے میں اپنے مقام کا احساس دلائے۔ خوش خلقی سے، محبت سے اور اگر وہ زیادتی سے باز نہ آئے تو اخلاقی طور پر اس کا بائیکاٹ کرے۔ اس سے ضروری بات کے علاوہ کوئی بات نہ کرے۔ لاپروائی کا رویہ اختیار کرے اور اگر اس کا بھی اثر نہ ہو تو کچھ عرصے تک اس سے کنارہ کشی کرے۔ اگرچہ یہ بہت کٹھن اور مشکل کام ہے لیکن عورتوں کے حقوق اور ناموس کو بچانے کے لیے یہ قربانی ضروری ہے ورنہ مردوں کو بھی اپنی زیادتیوں کا

احساس نہ ہوگا۔ آج عورت کی اپنی ایک شخصیت ہے، اس کا وجود اور حیثیت ہے۔ جہاں ملک کے خوشحال گھرانوں اور بچوں کی تربیت کے سلسلے میں اسکا مقام وہی ہے جو صدیوں پہلے تھا، وہاں باہر کی زندگی اور اہم باتوں میں اس کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ عورت اپنے حقوق اور مرد اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرے''۔

محترمہ کی یہ باتیں اپنے اندر کس قدر جامعیت لیے ہوئے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ بڑی باریک بینی سے زندگی کا مشاہدہ کر کے ٹھوس نتائج اخذ کرتی ہیں۔

21 مئی 1956

نئی راہیں، نئی اُمیدیں

آج دوپہر کھانے کے بعد ہم محترمہ کے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ انہیں کچھ ضروری خطوں پر دستخط کرنا تھے جو صبح نہ کر سکی تھیں۔ سیکرٹری ٹائپ کر کے رکھ گیا تھا۔ لکھتے لکھتے اپنے آج صبح کے ملاقاتیوں کے متعلق بتانے لگیں کہ ان کی ایک پرانی ملنے والی کی نوجوان لڑکی شادی کے بعد بالکل خوش نہیں۔ میاں بہت شوقین مزاج ہے لیکن وہ لڑکی بالکل مردہ دل سی ہے۔ دراصل اس کا باپ بچپن میں مر گیا تھا اور نانی اور ممانی کے گھر میں سخت کڑی نگرانی میں ماں نے اس کی پرورش کی اس لیے لڑکی میں پہننے، گھومنے پھرنے، باتیں کرنے اور خوش رہنے کی ساری صلاحیت ختم ہو کر رہ گئی۔ ماں کو احساس ہے لیکن لڑکی کو خود میں قطعاً دلچسپی نہیں۔ نہایت افسوس ناک بات ہے۔ ماں بہت فکرمند ہے۔

میں نے کہا:

''محترمہ! ایک ناخوشگوار بچپن ہماری اکثر صلاحیتوں کو ختم کر دیتا ہے''۔

وہ جھٹ بولیں۔

لیکن زندگی میں ہر عمر اور ہر دور میں انسان کے اندر کچھ نہ کچھ سیکھنے کی صلاحیت تو ختم نہیں ہونی چاہیے''۔

''یہ ضروری نہیں ہے کہ اگر بعض حالات اور وجوہات کی بنا پر ہم وہ کچھ حاصل نہ کر سکے تو موقع ملنے پر بھی ہم اس کے لیے کوشاں نہ ہوں اور سرے سے ہمت

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

نہ ہاردیں۔ ہم خواہ کتنا سیکھ جائیں لیکن پھر بھی ہر موقع پر نئی راہیں نئی امیدیں اور نئے ولولے ہمارا خیر مقدم کرتے ہیں۔ انسان کتنا ہی مکمل کیوں نہ ہو، اسے ہر وقت کوئی نئی چیز سیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے جب بھی موقع ملے اور حالات سازگار ہوں ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ معمولی سی چیزوں پر قانع ہو کر بیٹھ جانا نہایت غلط طرزِ عمل ہے۔ اس سے زندگی میں وہ مسرت اور جاذبیت ختم ہو جاتی ہے جس کے لیے ہم عمر بھر جدوجہد کرتے ہیں"۔

"آپ بالکل درست اور بجا فرماتی ہیں۔ میں نے کبھی اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔ کاش لوگ اپنے اندر یہ جذبہ پیدا کر لیں۔

پھر بولیں۔

"ایک ناکامی، زندگی بھر کی ناکامیوں کا تو نام نہیں۔ ضروری نہیں ہم ہمیشہ ناکام رہیں یا زندگی ہمیں کوئی فائدہ نہیں دے گی۔ ہمیں کبھی ہمت نہیں ہارنا چاہیے اور مسلسل جدوجہد اور کوشش سے دامن نہیں چھڑانا چاہیے"۔

23 مئی 1956

خوشگوار گھریلو ماحول

آج محترمہ نے ایک مقامی اردو کالج میں سالانہ مباحثے (DEBATE) کی صدارت کی۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی گئی۔ ہال میں بہت سارے لوگ موجود تھے۔ لڑکیوں نے خوب زور و شور سے تقریریں کیں۔ موضوع تھا:

"موجودہ دور کی پڑھی لکھی عورت نہ صرف شمع محفل ہے بلکہ بہترین رفیقہ حیات بھی ہے"۔

کچھ لڑکیاں موضوع کے حق میں بولیں، کچھ اس کے خلاف۔۔ آخر میں محترمہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آپ نے کہا کہ:

"تعلیم اور صحیح تعلیم ہی ہمیں انسان بناتی ہے اور زندگی کی مثبت راہ پر گامزن کرتی ہے۔ تعلیم سے ہمارے دل و دماغ روشن ہوتے ہیں۔ ہماری نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور ہمارے اندر سوچنے سمجھنے کی اہلیت پیدا ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی گھر کی تربیت اور صحت مند ماحول بھی اتنا ہی اہم ہے جتنی تعلیم۔۔ یہ تربیت اور خوشگوار ماحول صرف ایک اچھی ماں ہی ہمیں دے سکتی ہے موجودہ دور میں ویسے بھی زندگی اس طرح الجھ کر رہ گئی ہے کہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی، بیوی کی حیثیت سے زیادہ کامیاب زندگی گزار سکتی ہے۔ گھر اور گھر کا خوشگوار ماحول صرف عورت پر منحصر ہے اور ایک پڑھی لکھی لڑکی کو اس کا زیادہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر کو زیادہ سے زیادہ بہتر اور خوشگوار بنائے۔

جب پڑھی لکھی لڑکی اچھی بیوی ثابت نہیں ہوتی تو ان حالات میں ہم تعلیم کو ہرگز برا نہیں کہہ سکتے بلکہ اس میں قصور سراسر لڑکی کا اپنا ہے''۔

طالبات نے محترمہ کی تقریر کو بے حد پسند کیا۔ وہ ہمیشہ مختصر بولتی ہیں لیکن تقریر روانی سے کرتی ہیں۔ فنکشن کے بعد ہلکی سی چائے تھی۔ واپسی پر ہم نے گھر کے لیے پھل خریدے۔ محترمہ نے ضرورت کی کچھ اور چیزیں بھی خریدیں۔

آج رات کھانے پر ان کے چند مہمان آ رہے ہیں اور میں سوچ رہی تھی کہ محترمہ کی زندگی کتنی باقاعدہ ہے۔ وہ ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرتیں اور دن بھر مصروف رہتی ہیں۔ ہمیں ان کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔

25 مئی 1956

حسد اور عیب جوئی

آج محترمہ نے بہت پر لطف باتیں کیں۔ لیڈی ہدایت اللہ بھی موجود تھیں۔ بات کہاں سے شروع ہوئی، کچھ ٹھیک طرح یاد نہیں، بہر حال اتنا یاد ہے کہ حسد اور بغض کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ محترمہ کہنے لگیں۔

''حسد اور کینہ بہت گھناؤنی خصلتیں ہیں۔ بغیر کسی وجہ کے نقص نکالنا اور عیب جوئی کرنا ہماری فطرت بن چکی ہے۔ کسی محفل میں جائیں، شادی کا موقع ہو یا اور کوئی دعوت ہو تو خواتین ایسی باتیں کرتی ہیں۔'' کھانا اچھا نہیں تھا، جہیز کے جوڑے اچھے نہیں تھے۔ بری کے زیورات ہلکے تھے، انتظام ناقص تھا۔۔ کتنی عجیب بات ہے، ہم اچھی باتوں کو تو نظر انداز کر دیتے ہیں اور معمولی باتوں کو افسانہ بنا دیتے ہیں۔

کسی کی صورت، اچھی عادات یا سیرت میں عیب نکالنا بھی ایک طرح کا حسد ہی ہے۔ جانے ہم کیوں نہیں سمجھتے کہ اخلاقی حدود و قیود کتنی اہم ہیں۔ لیکن جہاں دو عورتیں ایک جگہ بیٹھیں، دوسروں کی عیب جوئی شروع کر دی۔ آخر ہم اپنا کردار اتنا بلند کیوں نہیں کر سکتے کہ دوسروں کی خوبیاں بیان کریں اور ان کی اچھی باتوں کو سراہیں۔ کسی اچھی صورت کو دیکھ کر بنانے والے کی تعریف کریں۔ کسی سلیقہ مند کو دیکھ کر اس کے مداح ہوں اور دوسروں کی خوبیوں اور اچھی باتوں کو اپنانے کی کوشش کریں۔

ہمیں حسد، بغض اور کینہ سے اپنے آپ کو دور رکھنا ہے ہر روز سونے سے پیشتر اپنا محاسبہ کرنا چاہیے اور اپنے دن بھر کے افعال کا جائزہ لینا چاہیے کہ آج ہم سے

کیا غلطی سرزد ہوئی ہے اور ہم اس میں کہاں تک قصوروار ہیں اور ہم کن خطوط پر چل کر اپنے آپ کو بہترین بنا سکتے ہیں۔

اپنی کمزوریوں کے متعلق سوچنا اور خود کو بہت انسان بنانا ایک ایسی خوبی ہے جس سے ہم کردار کی بلندیوں کو چھو سکتے ہیں۔ دوسروں کی عیب جوئی کرنے سے نہ تو ہم میں کوئی کردار رہتا ہے اور نہ اخلاص اور نہ ہی کوئی ایسی صلاحیت جس سے ہم خود کو ایک بہتر انسان بنا سکیں"۔

لیڈی ہدایت اللہ بولیں:

"ہم اپنے اندر خوبی اور صلاحیت پیدا نہیں کر سکتے لیکن دوسروں کے لئے تنگ دلی اور چھوٹے پن کا اظہار ضرور کرتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟"۔

محترمہ بولیں:

"اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دوسروں کی معمولی سی کوتاہی اور غلطی معاف نہیں کرتے لیکن خود ہمارے اندر بھی وہی باتیں ہوں تو جان بوجھ کر انجان بنتے ہیں۔ اس کے لئے ذہنی تربیت (TRAINING OF MIND) کی ضرورت اور اچھی ماؤں کی ضرورت ہے"۔

کاش! محترمہ جیسے خیالات سب کے ہوں۔ میں اس لئے یہ باتیں لکھ لیتی ہوں کہ ان باتوں، نصیحتوں اور بحثوں سے میں بہت کچھ سیکھ سکتی ہوں۔

"زندگی میں ہر قدم پر نئی باتیں سیکھنا ہی اصل زندگی ہے"

26 مئی 1956ء

اچھے اور برے والدین

بہت گرم دن ہے۔ تیز دھوپ کی تمازت سے ان دنوں باغ میں ایک پھول بھی شگفتہ نہیں، سب مرجھا گئے ہیں۔ محترمہ آج بھی مصروف رہیں۔ آج صبح بھی ان کے پاس کافی لوگ ملنے آئے حالانکہ عام طور پر شام کے وقت لوگوں سے ملاقات کا وقت طے ہوتا ہے۔ آج صبح سیکرٹری کچھ بیمار تھا اس لئے ڈاکٹر کے پاس گیا ہوا تھا۔ صبح اس کا سارا کام میں نے کیا۔ بے چارہ میرا شکرگزار ہوتا ہے جب میں اس کا کام نمٹا دوں۔ لیکن وہ کیا جانے کہ مجھے اس بہانے محترمہ کے قریب رہنے سے کتنا لطف آتا ہے۔ اردو کے خطوط اور اخبارات اب بھی میں ہی انہیں پڑھ کر سناتی ہوں۔

آج باتوں باتوں میں جانے کیسے ذکر آ گیا۔ کہنے لگیں:

"والدین تو سراپا ذمہ داری کا نام ہے۔ ان کے فرائض نہ صرف ان کے بچوں پر عائد ہوتے ہیں بلکہ اپنے معاشرے پر بھی۔ جہاں ان کے بچے مکمل اور اچھے شہری بن کر قوم و ملک کی خدمت کریں گے۔ گھروں میں حالات بہتر ہو جائیں تو ہماری تقدیریں بدل سکتی ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ پڑھے لکھے اور ماڈرن والدین کو اپنی مصروفیات سے فرصت نہیں۔ غریب اور متوسط طبقے کے والدین اپنی مشکلات ہی سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پاتے۔ والدین خاص طور پر ماؤں کو چاہئے کہ وہ سب کام چھوڑ کر اپنی ساری توجہ اپنے بچوں پر مرکوز رکھیں تاکہ ایک اچھا معاشرہ تشکیل دیا جا سکے"۔

میں نے کہا: ''بعض اوقات والدین بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر اور بعض اوقات حد سے زیادہ لاڈ پیار کر کے بگاڑ دیتے ہیں' حالانکہ ان کا رویہ اپنے بچوں سے متوازن ہونا چاہئے''۔

کہنے لگیں:

''کوئی ایک بات تو نہیں۔ کنجوس والدین' سخت طبیعت والدین' لڑکوں کو زیادہ ترجیح دینے والے والدین' اپنی مالی مشکلات کا ڈھنڈورا پیٹنے والے والدین------ یہ سب غلط والدین ہیں۔ والدین کے رویے میں ایک مکمل ہم آہنگی اور دوستانہ کیفیت ہونی چاہئیے------ ایک اچھے گھر اور والدین کے بچے یقیناً نہایت عمدہ شہری ثابت ہوتے ہیں اور قوم و ملک کے لئے باعث فخر بھی ہوتے ہیں۔ گھٹے گھٹے ماحول اور تنگ و تاریک گھروں میں پرورش پانے والے بچے زندگی بھر احساس کمتری کا شکار رہتے ہیں۔ قوم افراد سے بنا کرتی ہے۔ ایک صحت مند اور جوان مرد قوم کے لئے ایسے افراد کی کیا CONTRIBUTION ہو سکتی ہے؟''

محترمہ کی یہ تمام باتیں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

عموماً لوگ محترمہ کو بے حد خشک اور لطیف جذبات سے عاری خیال کرتے ہیں۔ ویسے بھی ان کی شخصیت ہی کچھ ایسی پر رعب ہے کہ دیکھنے والے مرعوب ہو جاتے ہیں اور خوف سا محسوس کرتے ہیں لیکن زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس سے محترمہ بے خبر ہوں اور کوئی رخ ایسا نہیں جس پر ان کی نظر نہ ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ زندگی کے پورے فلسفے پر اپنے تبحر علمی اور خداداد لیاقت کے باعث کچھ اس شدت سے حاوی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ محترمہ کا پورا کردار ایک ضخیم کتاب ہے۔

جب بھی میں اکیلی ہوتی ہوں تو پہروں ان کے متعلق سوچتی ہوں اور ان کی حکمت و معانی سے بھرپور باتیں میرے کانوں میں گونجتی ہیں۔ میں کوشش کروں گی کہ ان کی ہر بات پر زندگی میں عمل کر سکوں۔

آج دوپہر کے کھانے میں ہم نے صرف مونگ کی دال کی کھچڑی' چٹنی اور رائتہ کھایا------ خانساماں دو روز سے بیمار ہے۔ میں ہی کھانا پکا رہی ہوں۔ آج انہوں نے کھچڑی کی فرمائش کی تھی۔ کہنے لگیں:

''کبھی کبھی مجھے صرف کھچڑی' رائتہ اور دھنیے کی چٹنی کھانا بہت پسند ہے۔ قائداعظمؒ کو بھی یہ بہت پسند تھی اور بڑی خوشی سے کھایا کرتے تھے''۔

بڑے لوگ ایسے سادہ کھانے اتنے شوق سے کھاتے ہیں' دوسرے لوگ شاید نہیں جانتے کہ ایسی عظیم شخصیتیں کتنی سادہ طبیعت کی مالک ہوتی ہیں ان میں کسی قسم کا تصنع یا بناوٹ نہیں ہوتی لیکن یہ بھی افراد پر منحصر ہے کہ وہ کیسے ہیں؟

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

28 مئی 1956ء

وسیع القلب عورتیں

میں اور خورشید کل مری جا رہے ہیں۔ ہائی کورٹ میں دو ماہ کی چھٹیاں ہیں۔ ویسے بھی شادی کے بعد ہم ابھی تک کہیں باہر نہیں گئے۔ دو چار روز اباجی کے ساتھ گزاریں گے اور پھر مری جائیں گے۔ آج صبح محترمہ میرے کمرے میں آئیں۔ میں پیکنگ کر رہی تھی۔ دیکھ کر کہنے لگیں:

''میں تمہیں سچ بتاؤں، جب سے تم آئی ہو خورشید کا کمرہ اتنا صاف ہوتا ہے اور ہر چیز اتنے قرینے سے رکھی ہوئی ہے کہ میرا دل خوش ہو جاتا ہے۔ نوکر کبھی ان باتوں کا خیال نہیں رکھتے حالانکہ میں نے ایک خاص آدمی صرف خورشید کے لئے رکھا ہوا تھا کہ وہ اس کے سارے ذاتی کام کرے، لیکن مجھے خود ہر چیز پر نظر رکھنا پڑتی ہے۔ ایک اچھی عورت زندگی کی نعمت ہے۔ اگر وہ ان خوبیوں سے عاری ہو تو زندگی اجیرن ہو کر رہ جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شادی بہت بڑا جوا ہے۔ کبھی کوئی جیت جاتا ہے اور کبھی کوئی بری طرح ہارتا ہے''۔

بات انہوں نے دلچسپ چھیڑی۔ میں نے کہا:

''محترمہ! آپ کا کیا خیال ہے۔ شادی والدین کی رضا مندی سے ہونی چاہئے۔ جس میں کافی حد تک اس بات کا خدشہ ہوتا ہے کہ جانے دونوں کی طبیعتیں ملتی بھی ہیں یا نہیں۔ یا لڑکا لڑکی خود اپنی مرضی سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوں؟''

کہنے لگیں: ''دونوں قسم کے شادیوں کے نقصانات بھی ہیں اور فوائد بھی۔ بعض اوقات والدین کی رضا مندی سے ہونے والی شادیاں بھی کامیاب رہتی ہیں اور

بعض اوقات اپنی کی ہوئی شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں۔ بات پھر اپنی فطرت اور ذاتی عادات پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ کئی چیزوں کا شادی سے پہلے کچھ پتا نہیں چلتا۔ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو قریب سے جانتے بھی ہوں تو شادی کے بعد زندگی رخ بدل لیتی ہے۔ کہیں اقتصادی مشکلات ہیں، کہیں گھر چلانے کے لئے نئی ذمہ داریاں ہیں۔ کبھی سسرال والوں کا رویہ تلخی کا باعث بن جاتا ہے اور زندگی کا رومانی پہلو اتنا اہم نہیں رہتا۔

انسان کا صحیح امتحان اس وقت ہوتا ہے جب مرد اور عورت، شوہر اور بیوی کی حیثیت سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ غلطیاں دونوں کرتے ہیں لیکن عام طور پر عورت کی غلطی معاف نہیں ہوتی۔ مرد غلطی اور زیادتی کر کے بھی شرمندہ نہیں ہوتا۔ معاشرہ بھی اسے برا نہیں سمجھتا لیکن ایک بات میں تمہیں بتاؤں کہ تجربے سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک سمجھدار عورت اپنی نرمی، عقل مندی اور وسعت قلب سے مرد پر حکومت کرتی ہے اور مرد اس کی شخصیت کے سامنے بالکل بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ عورتیں بے وقوف ہیں جو رعب سے مردوں پر قابو پانا چاہتی ہیں اور اس طرح انہیں کھو دیتی ہیں اور کبھی ان کی سچی محبت انہیں نہیں ملتی۔ ایک کمسن بچے سے زبردستی آپ کوئی چیز نہیں منوا سکتے۔ مرد تو پھر مرد ہے جو خود کو کائنات کی برتر مخلوق سمجھتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اسے اسی طرح HANDLE کیا جائے''۔

میں نے کہا:

کئی بار یوں بھی ہوتا ہے کہ عورت مرد پر چھا جاتی ہے اور وہ اس کے سامنے دم نہیں مار سکتا اور لوگ مرد کو HUSBAND OF MRS SO & SO کے نام سے متعارف کراتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے اور مرد، عورت کو اس طرح خود پر مسلط کیوں کروا لیتا ہے؟''۔

کہنے لگیں:

''یہ سب وقتی ہوتا ہے۔ یا تو ایسے لوگ باہر کی زندگی میں فرار ڈھونڈتے ہیں اور بدکار ہو جاتے ہیں یا پھر اسے ایسا نیچا گراتے ہیں کہ عورت کی ساری زندگی تلخیوں میں گزر جاتی ہے۔ ایک POSSESSIVE عورت نہ کبھی اچھی بیوی ثابت ہو سکتی ہے اور نہ ایک اچھی ماں------ ہم نے ایسی عورتوں کو شوہروں کے گھر اجاڑتے دیکھا ہے اور ایسی ماؤں کو بچوں کے گھر جہنم بناتے دیکھا ہے۔ بیٹی کے سسرال اور شوہر کی ناجائز مداخلت' بہو سے وہ توقعات جو قطعاً جائز نہیں اور ایسی سختی 'جس کا کوئی جواز نہیں۔ ایک عجیب بات ہے کہ عورت ہمیشہ عورت کا گھر اُجاڑتی ہے۔ خواہ وہ ساس کی شکل میں ہو یا سوکن کی صورت میں' بہر حال عورت ہی عورت کی مجرم ہے۔ ہمارے بچپن میں ایک ساس اور بہو کے تعلقات اتنے خراب تھے کہ ساس رو رو کر دعا مانگا کرتی تھی کہ ''خدا کرے میرا بیٹا مر جائے تاکہ اس عورت کا مان ٹوٹ جائے''۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی بہو بھی قصوروار ہو لیکن ایک عورت کی حیثیت سے اور ایک ماں کی حیثیت سے اس کی یہ دعا آخر کیا تھی جو وہ مانگتی تھی؟

پھر عورت میں وسعت قلب نہیں۔ بنیادی طور پر وہ تنگ نظر واقع ہوئی ہے۔ اگرچہ سب عورتیں ایسی نہیں ہوتیں لیکن بہت حد تک خاندانی جھگڑے' گھروں کے تنازعے اور ناخوشگوار ماحول عورت کی وجہ سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ہمیشہ ایک وسیع القلب لڑکی ہی سے شادی کرنی چاہیے تاکہ وہ اپنے بچوں کو بھی وسیع القلبی کی تربیت دے۔ درگزر کی عادت کو اپنانا چاہیے ورنہ کسی بھی انسان کا گزارہ نہیں ہو سکتا------ چھوٹی چھوٹی باتیں انسان کی زندگی میں زہر گھول دیتی ہیں اور ذہن کو بری طرح متاثر کرتی ہیں۔ ان سے بچنے کا ایک ہی حل ہے کہ ہم میں وسعت ہو' ہر پہلو سے اور ہر شعبے میں وسعت''۔

آج گھر میں کافی لوگ رات کے کھانے پر مدعو تھے۔ مس جناحؒ کے قریبی دوست و احباب وغیرہ------ مجھے انہوں نے فالسہ کا شربت بنانے کو کہا۔ ملیر میں ان کا ایک باغ ہے وہاں سے بہت سے فالسے آتے تھے۔ فالسہ کا تازہ جوس انہیں بہت پسند ہے۔ دوسرے مشروبات کے ساتھ آج یہ بھی تھا۔

کہنے لگیں: ''قائداعظمؒ کو بھی فالسہ کا تازہ جوس بہت پسند تھا۔ ارغوانی رنگ کا یہ رس دیکھنے میں واقعی جاذب نظر ہے''۔

بند سٹور سے آج میں نے ان کے ساتھ دعوت کے لئے برتن نکالے۔ نہایت خوبصورت چینی تھی۔ بتانے لگیں کہ۔

''فلاں گلاس قائداعظمؒ نے پیرس سے خریدے اور فلاں سیٹ انگلستان سے آرڈر پر بنوایا''۔

نہایت عمدہ انتخاب تھا۔ چیزوں کی عمر کتنی زیادہ ہے لیکن انسان باقی نہیں رہتا۔ کتنا عظیم سانحہ ہے اور ان چیزوں کے ساتھ کیسی کیسی یادیں وابستہ ہو جاتی ہیں۔

عنابی رنگ کے ایک ڈنر سیٹ کو جس پر گولڈن حاشیے ہیں دیر تک دیکھتے ہوئے مجھے بتانے لگیں کہ یہ ڈنر سیٹ قائداعظمؒ کو بہت پسند تھا اور جب کبھی بمبئی اور دہلی میں بڑی دعوتوں میں نکالا جاتا تو خاص ہدایت کرتے کہ اس کی احتیاط کی جائے---- کتنا خوبصورت سیٹ ہے۔ میں نے احتراماً اسے چھو کر دیکھا۔ شاید اس برتن پر قائداعظمؒ کی انگلیاں بھی لگی ہوں۔

مس جناحؒ خوش ہیں کہ ہم چھٹیوں میں باہر جا رہے ہیں۔ مجھے کہنے لگیں:

''تم مجھے یاد آؤ گی۔ تمہاری وجہ سے یہاں رونق ہے اور میرے گھر کا یہ حصہ آباد ہے جو پہلے بالکل خالی پڑا ہوا تھا۔ بہت دفعہ سوچا اسے اپنا دفتر بنا لوں لیکن پھر نہ بنایا۔ اب تم لوگ یہاں رہتے ہو تو میں خوش ہوں''۔

16 اکتوبر 1957ء

یادوں سے بھرپور فلیگ سٹاف ہاؤس

ڈائری لکھنے والا بنیادی طور پر فوٹو گرافر ہوتا ہے جو زندگی کے بھاگتے ہوئے لمحوں اور جذبوں کو قید کر دیتا ہے تاکہ مستقبل میں ان تصاویر کو دیکھ کر ماضی کو دوبارہ زندہ کر سکے۔ میں نے بھی اسی جذبے کے تحت فلیگ سٹاف ہاؤس میں قیام کے دوران یہ ڈائری لکھی تاکہ محترمہ کے ساتھ گزارے ہوئے یادگار لمحے امر ہو جائیں۔ اب تو یہ سارے دن ایک البم کی طرح لگتے ہیں جو میں نے زندگی کے اس دور میں محترمہ فاطمہ جناحؒ کی رہائش گاہ پر گزارے۔ ان سب تصویروں میں جو یادوں کی اس البم میں لگی ہوئی ہیں ایک تصویر کا بہت نمایاں مقام ہے۔ اور وہ تصویر خاتونِ پاکستان کی ہے جن کا کردار بے حد زندہ اور انسانی کردار ہے۔ کسی ڈرامے کے متحرک کردار کی طرح زندہ اور قریب جو ڈرامہ دیکھتے یا پڑھتے ہوئے ہماری رگِ جان بن جاتا ہے۔ اس میں محترمہ فاطمہ جناحؒ دو مختلف حیثیت سے نظر آتی ہیں۔ ایک سطح بحیثیت دانشور خاتون' قائداعظمؒ کی عظیم بہن۔ جنہوں نے قائداعظمؒ کا بحیثیت ایک شفیق بہن بے حد خیال رکھا۔ مادرِ ملتؒ کے روپ میں وہ زندگی پر خاص طور پر سیاست' تاریخ اور عورت کے منفرد مقام پر گفتگو کرتی ہیں۔

لیکن دوسری طرف وہ ایک انسانی اور تحقیقی سطح پر بھی منفرد نظر آتی ہیں۔ جس میں وہ بطور ایک انسان ایک فرد اور ایک خاتونِ خانہ کے طور پر نظر آتی ہیں۔ جب ہم انہیں چلتے پھرتے صبح و شام کی ذمہ داریوں سے نپٹتے' ہم وطنوں کی بے حسی پر کڑھتے

اور پھر زندگی کو قبول کرتے دیکھتے ہیں۔ کبھی ہم انہیں کپڑا اور پھل خریدتے بوہری بازار اور الفنسٹن سٹریٹ میں جاتا دیکھتے ہیں' کبھی پھولوں کی نگہداشت نہ ہونے پر رنجیدہ اور کبھی احباب کی محفلوں میں اور کبھی کھانے کی تیاری میں خنداں دیکھتے ہیں۔ کبھی انہیں موسم اور تقریب کے مطابق لباس کی اہمیت پر غور کرتے اور کبھی کھچڑی اور دھنیے کی چٹنی پر اکتفا کرتے دیکھتے ہیں۔ غرض یہ کہ مختلف تصویریں اور مختلف روپ ہیں جن میں ان کی شخصیت کے کئی پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ مثلاً ملاقاتیوں کے ساتھ بہت رعب اور تدبر سے گفتگو کرتا ہوا یہ کردار جب قائداعظمؒ کے ذاتی کمرے میں ان کی چیزوں کو صاف کرنے جاتا ہے تو روایتی رعب کا لبادہ اتر جاتا ہے اور ہم انہیں ایک شفیق بہن کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ جن کے لئے موت جیسی ناگزیر حقیقت کا سامنا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر وہ سارے فاصلے ختم ہو جاتے ہیں وہ اپنے عظیم بھائی کی باتیں کرتی ہیں۔ ان کی چیزوں کو اسطرح ترتیب دے کر رکھتی ہیں گویا وہ ابھی یہیں کہیں موجود ہیں اور چند لمحوں میں یہاں آ جائیں گے۔ لیکن یہ کتنی تلخ حقیقت ہے کہ جانے والے کبھی واپس نہیں آتے۔

میں نے محترمہ کے ساتھ اپنے قیام کے دوران نہ تو انہیں تاریخ کے صفحات سے نکالا' اور نہ ہی ان کو ان کے سیاسی پس منظر کے پیشِ نظر سمجھنے کی کوشش کی۔ اس لئے میرے اور ان کے درمیان تعظیم کے ساتھ اپنائیت کا ایک بڑا خوبصورت رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ اور میں اپنی محسنہ کو اپنے بہت قریب محسوس کرتی تھی۔ میں ایک بہت حساس طالب علم رہی ہوں۔ شاید اس لیے میں پوری آنکھیں واہ کئے اور کان کھولے محترمہ فاطمہ جناحؒ کے ہر کام کا جائزہ لیتی رہی اور ایک طالب علم کی حیثیت سے ڈائری لکھتی رہی۔ جو ایک اچھے اُستاد کی ہر بات کو کاپی پر اور کتاب کے حاشیے پر لکھتا ہے۔ یہ میری

محمد طارق اقبال پاکستانی یو اسٹ ڈاٹ کام

خوش قسمتی ہے کہ وہ مجھ سے بہت مانوس تھیں، مجھے پسند کرتی تھیں ورنہ ان کی پسندیدگی محض کے ایچ خورشید کی بیوی ہونے کے ناتے شاید مجھے کبھی حاصل نہ ہوتی۔

مجھے فخر ہے کہ مجھے زندگی کے اس دور میں محترمہ فاطمہ جناح جیسا استاد اور فلیگ سٹاف ہاؤس جیسی درس گاہ ملی۔

محترمہ کے ساتھ قیام کے دوران ایک بات میں نے بہت محسوس کی کہ یہاں اس جگہ سب کی موجودگی کے باوجود ایک غیر حاضر کردار بھی ہے جس کی موجودگی ہر موقعہ اور ہر تقریب میں محسوس ہوتی ہے یہ کردار قائداعظم کا ہے جو موجود نہ ہوتے ہوئے بھی ہر وقت محترمہ کے ساتھ اور اس گھر میں موجود رہتے ہیں۔ عجیب سا احساس تھا۔ جو مجھے محسوس ہوتا تھا اور بقول غالب ''ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے''۔ شاید اسی لیے یہ محسوس ہوتا تھا کہ محترمہ باتوں میں اکثر اپنے عظیم بھائی کا ذکر کرتی تھیں۔ ان کی جدوجہد کا ذکر کرتی تھیں، ان کی قربانی اور محنت کا ذکر کرتی تھیں اور یہ بات کئی بار دھراتی تھیں کہ میں نے انہیں کہا: ''آپ کی زندگی قیمتی ہے آپکو اسکی حفاظت کرنی چاہیے۔''

ان کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرتے۔ وہ کہتیں: ''فردِ واحد کی صحت کیا حیثیت رکھتی ہے جبکہ میں ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی بقا کے لیے پریشان ہوں۔ کیا تم جانتی ہو کہ مسلمانوں کا سب کچھ خطرے میں ہے۔''

فلیگ سٹاف ہاؤس' اتنی شاندار اور خوبصورت عمارت ہے کہ افسانوی معلوم ہوتی ہے۔ محترمہ شام کو اپنی نشست گاہ میں اکثر مہمانوں کے ساتھ بیٹھتی ہیں۔ میں بھی ڈرائیو ان پر اکثر واک کرتی ہوں۔ خورشید شام کو آفس جاتے ہیں تو میں شام کا وقت کمرے میں نہیں گزارتی۔ گیٹ پر پہرے دار گشت کرتے نظر آتے ہیں۔ گیٹ کی روشنیاں بھی مدھم ہیں لیکن مجھے کبھی کبھی اداس اور دھیمی روشنیاں اچھی لگتی ہیں۔

یوں گویا کسی ویرانے میں کوئی بھولا بسرا مسافر اپنا راستہ بھول گیا ہو۔ پہرے دار بھی کبھی بڑے غیر جاندار لگتے ہیں..... محترمہ تو کہتی ہیں کہ حکومت نے انہیں اپنے لیے رکھا ہوا ہے کہ ان کے پاس آنے والے لوگوں کے متعلق انہیں معلوم ہوتا رہے۔ کیسی مضحکہ خیز بات ہے۔ کیا قائداعظم کی بہن کے متعلق ایسا سوچنا انسانیت ہے؟ اپنے محسنوں سے کبھی ایسا سلوک بھی ممکن ہے؟ کتنے افسوس کی بات ہے۔

میرا خیال تھا کہ فلیگ سٹاف ہاؤس حکومت کی بلڈنگ ہے۔ لیکن آج دوپہر کے کھانے کے بعد جب میں اور محترمہ کچھ دیر کے لیے اکٹھے بیٹھے تو انہوں نے فرمایا کہ قائداعظم نے یہ عمارت 1943ء میں کراچی کے ایک سابق میئر سہراب کاؤس جی سے خریدی تھی۔ قائداعظم تحریکِ آزادی کی جدوجہد کی وجہ سے دہلی اور بمبئی میں رہتے تھے اور قیامِ پاکستان کے بعد وہ گورنر جنرل ہاؤس میں مقیم رہے۔ جس کی وجہ سے انہیں کبھی بھی اس گھر میں رہنے کا موقعہ نہیں ملا۔ لیکن صرف چند بار اس پیلے پتھروں سے تعمیر شدہ دو منزلہ عمارت میں مختصر وقت کے لیے آئے البتہ تقسیم کے بعد دہلی سے 10 اورنگ زیب روڈ' گھر کا سارا سامان اس گھر میں آیا۔ اب محترمہ بھائی کی تمام تر یادوں اور ان کے ذاتی سامان اور چیزوں کے ساتھ یہاں رہائش پذیر ہیں۔ قائداعظم کی بہن کو یقیناً اپنے بھائی کے وجود کا یہاں احساس ہوتا ہوگا۔ لمس محسوس ہوتا ہوگا۔ میرا ایمان ہے کہ دنیا سے جانے والے اپنے وجود کا احساس ضرور اپنے پیاروں کو دیتے ہیں۔ عجیب سا خیال ہے لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے۔

یہ خوبصورت عمارت برطانوی طرزِ تعمیر کا شاہکار ہے۔ 10241 مربع گز پر محیط یہ عمارت' جس کا ڈیزائن جے-ایچ سومئک آرکیٹکٹ نے بنایا اور اسی کی زیرِ نگرانی ہی تعمیر ہوئی۔ سنِ تعمیر کا معلوم نہیں لیکن ٹائل کی پشت پر 1865 لکھا ہوا ہے۔

1940ء میں یہ گھر برٹش انڈین آرمی نے کرایہ پر لیا ہوا تھا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد محترمہ فاطمہ جناح 13 ستمبر 1948ء کو یہاں شفٹ ہوئیں۔

آج شام کے سائے جلد گہرے ہوگئے۔ میں اس عمارت اور اس کے مکینوں کا سوچ کر تصورات کی بڑی خوبصورت دنیا میں گم رہی۔ وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اتنے میں محترمہ فاطمہ جناح لیڈی ہدایت اللہ کے ساتھ باہر نکلیں۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ پوچھنے لگیں: "اکیلی یہاں کیوں گھوم رہی ہو؟ میرے پاس آجاتیں۔" میں عقیدت سے سرشار انہیں کیسے بتاتی کہ میں اس عظیم عمارت اور قائداعظم کے متعلق کیا سوچ رہی ہوں۔ لیڈی ہدایت اللہ عام طور پر صبح انکے پاس آتی ہیں اور روز آتی ہیں...... آج شام کو آئیں۔ بڑی باوقار خاتون ہیں مجھ سے بھی بڑی محبت کرتی ہیں اور محترمہ کے ساتھ تو بڑی بے تکلفی کی دوستی ہے۔

محترمہ اندر گئیں تو میں نے بھی لمبی ڈرائیوان کا ایک اور چکر لگایا۔ میرے ذہن میں اپنا وطن کشمیر آیا ہوا تھا۔ وہاں بھی ایسے پتھروں کی وسیع عمارتیں تھیں انگریز برصغیر میں قیام کے دوران گرمی کا موسم زیادہ سے زیادہ سرینگر اور اسکے گردونواح میں گزارتے تھے اور اپنی رہائش کے لیے چند ایسی عمارتیں بھی انہوں نے بنوائیں۔ انگریزوں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ وہ برصغیر چھوڑنے پر مجبور ہوجائیں گے۔ دو سو سال سے بھی کم عرصے کے لیے وہ یہاں قابض رہے اور اپنے ذاتی فائدے کے ساتھ خود بھی بہت قربانی دی۔ گوروں کے قبرستان اس ملک میں بے شمار ہیں۔ اقتدار کے دوران اور جنگوں میں بھی بہت انگریز یہاں مرے اور اسی مٹی میں دفن ہوئے۔ اقتدار کی ہوس انسان کو کہاں کہاں لے جاتی ہے لوگ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ دوسروں کی کسی بھی چیز پر انکا حق دائمی حق نہیں ہوتا اور پھر ملک گیری کی ہوس میں بے تحاشا بے گناہ لوگ بھی بے موت مر جاتے ہیں۔

13 مارچ 1959ء

خورشید بحیثیت صدر آزاد کشمیر

آج ہم دونوں محترمہ کے پاس "موہٹہ پیلس" گئے۔ ملاقات کے علاوہ خورشید ان سے آزاد کشمیر کی صدارت کی پیش کش کے متعلق بھی پوچھنا چاہتے تھے۔ ان دنوں حکومت کی طرف سے ان پر بڑا دباؤ ہے کہ وہ یہ عہدہ رول آف بزنس کے تحت لے لیں۔ بعد میں الیکشن ہو جائے گا۔"

خورشید نے جب یہ تذکرہ محترمہ سے کیا تو وہ کچھ دیر سوچتی رہیں۔ پھر انہوں نے فرمایا "تم میرے پاس رہتے ہوئے ملنے آتے ہو پھر NRM کی تحریک یہاں کامیاب طریقے سے چل رہی ہے جس میں حکومت پر خوب تنقید ہوتی ہے۔ تم اس میں سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے کافی کام کرتے ہو۔ شاید اس لئے تم کو کراچی سے بھیجنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں سوچتی ہوں تمہارا ملک ہے، تمہارے لوگ ہیں، شاید تمہارے جانے اور کام کرنے سے ان کا کچھ بھلا ہو جائے۔ اپنے اس جذبے کے تحت تم آزاد کشمیر کی صدارت قبول کرلو۔"

یہ محترمہ کی وجہ سے ہی تھا کہ خورشید نے آزاد کشمیر کی صدارت قبول کی۔

25مارچ1959ء

باصلاحیت قوم

25مارچ1959ء کومحترمہ فاطمہ جناح نے ہمیں افطار کے لئے بلایا اور یہ بھی کہا کہ کچھ دیر پہلے آ جانا۔ ان سے ملے کافی دن ہو گئے تھے۔ خورشید تو ایک بار ان دنوں شام کو اپنے دفتر سے واپسی پر اپنی محسنہ کو ملنے گئے تھے۔ میں نہ جا سکی تھی۔ اس لئے جب اُنہوں نے افطار کے لئے مدعو کیا تو میں نے اسے اپنی خوش قسمتی سمجھا کہ آج اتنے دنوں کے بعد محترمہ سے ملوں گی۔ دراصل فلیگ سٹاف ہاؤس میں عرصہ تک ان کی رفاقت میں رہنے سے میں ان کی موجودگی ان کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کے سحر میں اس طرح جذب ہو گئی ہوں کہ ان کا وجود میرے لئے بہت ہی کشش رکھتا اور جب کبھی اب ہم ان سے ملنے جاتے ہیں تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ ان کا دائرہ علم، سیاست پر ان کی باتیں، ان کی مثبت سوچ، قومی نقطۂ نظر سے ان کے افکار قائد کے حوالے سے ان کی محبت میں ڈوبی ہوئی باتیں، تحریک پاکستان کے دور کی آنکھوں دیکھی جدوجہد کی باتیں اور قوم کی زبوں حالی پر ان کی پریشانی، اتنی جامع باتیں ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ گھنٹوں ان کی باتیں انسان سنتا رہے اور میری عمر میں یہ باتیں شاید انسان کو بہت متاثر کرتی ہیں۔ اس لئے کہ ہم نے زندگی کی راہ پر شاید ابھی قدم رکھا ہے اور انسان خود کو آسمان کی بلندیوں پر لے جانا چاہتا ہے جہاں کردار ہو، اخلاق ہو، نیک نیتی ہو، خلوص اور ایمانداری ہو اور ہم انسانیت کے حوالے سے کچھ کر سکیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ صلاحیت مجھ میں پیدا کرے اور میں زندگی میں اچھے کام

کروں۔ اس سوچ کے ساتھ میرے لیے محترمہ کی محبت زندگی کا بڑا خوبصورت انعام ہے جس پر میں جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔

محترمہ ہماری منتظر تھیں۔ بڑی خوبصورت اور اپنی مخصوص مسکراہٹ سے انہوں نے ہم دونوں کو خوش آمدید کہا۔ سلک کے سفید براق بے شکن لباس میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ باتوں کا موضوع سیاست ہی تھا۔ وہ اور خورشید باتیں کرتے رہے، میں سنتی رہی اور اپنے ذہن میں ان کی باتیں محفوظ کرتی رہی۔

ان دنوں ملک میں سکندر مرزا کی حکومت کے بعد ایوب خان ملک کے صدر ہیں۔ محترمہ سکندر مرزا کی کارکردگی، اس کے کردار اور اس کے کام سے بڑی متنفر تھیں اور بار بار کہہ رہی تھیں کہ پاکستان ایسے حکمرانوں کے لئے معرض وجود میں نہیں آیا تھا جن کی اپنی سوچ نہیں، کردار نہیں اور ملک اور قوم کی بہتری ان کی غرض نہیں۔ صرف اپنی ذات کے حوالے سے وہ ملک کے سربراہ بن کر ہر ایسا کام کرتا ہے جو پاکستان کے نظریے کی نفی کرتا ہے۔

آج اُنہوں نے یہ باتیں نہیں کیں حالانکہ فوجی حکمران اور فوجی حکومت کی وہ بالکل قائل نہیں۔ کیونکہ یہ بھی پاکستان کے بنیادی نظریے کے خلاف ہے۔ فوج کو بیرک میں ہونا چاہیے لیکن سکندر مرزا کی وجہ سے جو ملک کا حال ہو گیا تھا اس کے جانے سے انہیں سکون ملا ہے۔ ایوب خان کو حکومت سنبھالے ابھی پانچ ماہ ہوئے ہیں۔ فرمانے لگیں۔ "حالات پر نظر رکھنی چاہیے۔ اس قلیل عرصہ میں ہم کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔ میں البتہ یہ ضرور سوچتی ہوں کہ ایوب خان کو زیادہ دیر تک حکومت کا سربراہ بننے کا خواب نہیں دیکھنا چاہیے۔ وقتی حالات پر قابو پا کر حکومت کو جمہوری تقاضوں کے حوالے سے چلنا چاہیے کیونکہ یہی قائداعظم کا خواب تھا اور یہی عوام کے ملک میں ہونا چاہیے تاکہ ہر ایک

کو موقع ملے۔ کون جانتا ہے کہ کس میں کتنی صلاحیت ہے۔ صلاحیت کو آگے آنے کا موقع تو صرف جمہوری قدروں اور نیک نیتی سے ہی دیا جا سکتا ہے۔ کہنے لگیں۔ عوام کا تعاون حکومت کے لئے بہت ضروری ہے۔ لیکن ہمارے لوگوں کی یہ عجیب عادت ہے کہ نکتہ چینی کرتے ہیں۔ بے شک خود کچھ کرنے کی صلاحیت نہ ہو۔ پھر ایک بات جو مجھے بہت پریشان کرتی ہے وہ یہ کہ WE LACK UNITY اور اتفاق میں برکت ہے۔ قائداعظمؒ نے جب تحریک پاکستان کی کٹھن جنگ اپنے ساتھیوں کے ساتھ لڑی تو FAITH, UNITY & DISCIPLINE کو اپنا نصب العین بنا کر قوم کو سکھایا۔

اس راستے سے ہم کو نہیں بھٹکنا چاہیے۔ ورنہ ہم ترقی پسند قوموں کی صف میں نہیں آئیں گے۔ دنیا بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ سائنس میں حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ مثبت سوچ کے ساتھ کام اور صرف کام کرنے کی ضرورت ہے۔ جس میں ایمانداری کو ہمیشہ اپنا نصب العین بنایا جائے۔ اپنی غرض اور صرف اپنی ذات کے لئے جو لوگ جیتے ہیں وہ قوم کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ خدا نہ کرے قائداعظمؒ اور ان کے ساتھیوں کی محنت ضائع ہو۔

پاکستان تو قائم رہنے کے لئے بنا ہے۔ مسلمانوں کے لئے گوشہ عافیت ہے۔ مساوی حقوق اور اخوت اور ایمانداری حکمرانوں کا نصب العین ہو جائے تو قوم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ اسی قوم نے سپین میں 700 سال حکومت کی۔ برصغیر میں 1000 سال حکومت کی۔ ہم میں صلاحیتوں کی کمی تو نہیں ہے۔

میں باتیں سنتی رہی۔ خورشید بھی ساتھ ساتھ بولتے رہے۔ اچانک محترمہ فرمانے لگیں۔ ''ارے! افطاری کا وقت ہونے والا ہے'' میری طرف دیکھ کر بولیں ''تم کچن میں ذرا جاؤ پتہ کرو باورچی کیا کر رہا ہے اور بیرے نے افطار کا سارا سامان

میز پر لگا دیا ہے یا ابھی کچھ دیر ہے؟''۔

میں فوراً اٹھی تو خورشید نے ہنستے ہنستے کہا ''کچن میں یہ جا کر ضرور کچھ الٹ پلٹ کر دے گی۔'' محترمہ مسکراتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں بولیں۔

"WHY DO YOU DENY THAT SHE IS A GOOD COOK AND IT IS A GREAT QUALITY IN WOMAN".

میں ان کی یہ بات سن کر جھوم گئی اور شکریہ ادا کر کے کچن کی طرف گئی۔ حالانکہ میں یہ خوب جانتی تھی کہ اس عمر میں مجھے بھی کھانا پکانا اتنا اچھا نہیں آتا۔ حالانکہ بی بی جی نے بڑی محبت اور سختی سے سب کچھ سکھایا تھا۔''

افطار پر بڑی لذیذ چیزیں تھیں۔ موسم کا مشروب' پکوڑے' کباب' فروٹ چاٹ' سینڈوچ اور گرم چائے۔

بڑی پر لطف شام تھی!

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

25 ستمبر 1964ء

انتخاب کی تیاری

پاکستان میں آئندہ سال کے شروع میں جو انتخابات ہو رہے ہیں اس کے لئے ملک کی پانچوں مخالف پارٹیز نے متحدہ طور پر مس فاطمہ جناح کو نامزد کیا ہے اور قوم اور ملک کی آواز پر انتخابات میں حصہ لینے پر تیار ہو گئی ہیں----- صدر ایوب اور حکومت کے حلقوں میں یہ خبر نہایت تعجب سے سنی گئی کیونکہ انہیں یقین کامل تھا کہ وہ کبھی کھڑی نہیں ہوں گی اور نہ اپوزیشن کی طرف سے کوئی ایسا آدمی کھڑا ہو گا جس کے لئے انہیں سخت مقابلہ کرنا پڑے۔ لیکن اب صورتحال بالکل بدل گئی ہے۔ مس جناحؒ ان دنوں مشرقی پاکستان کے دس روزہ دورے پر ہیں۔ لوگوں نے ان کی آمد پر جس جوش و خروش کا اظہار کیا ہے اس پر حکومت بوکھلا گئی ہے۔

محترمہ ہماری محسنہ ہیں۔ ایسے وقت میں ملک کی سیاست میں ہم سب کا فرض ہے کہ کچھ کریں بلکہ ہمارا اخلاقی فرض ہے۔ اس لئے خورشید مس جناحؒ کے کہنے پر ان کی انتخابی مہم کے منتظم بن گئے ہیں اور اب ان کے دورے میں بھی ان کے ساتھ ہیں۔

15 نومبر 1964ء

آمریت کا اندھیرا

محترمہ فاطمہ جناح صدارتی الیکشن کے سلسلے میں کل سیالکوٹ آئی تھیں۔ ایک پبلک جلسے سے مخاطب ہوئیں۔ لوگوں کے بے حد اصرار پر متحدہ محاذ کے امیدوار کے طور پر وہ ایوب خان کے خلاف الیکشن میں کھڑی ہوئی ہیں۔ قوم کے لیے بہت آزمائش کی گھڑی ہے۔ بڑی مشکل سے اس کٹھن کام کے لیے وہ تیار ہوئی ہیں۔ قائداعظمؒ کی عظیم بہن جنہوں نے زندگی کے تقریباً 30 سال اپنے بھائی کے ساتھ گزارے۔ اور ان کے سیاسی سفر میں پوری طرح شریک رہیں۔ ان سے قوم کو توقع تھی کہ اس مشکل وقت میں جب آمریت کا دور ہے اور ایک فوجی جرنیل ملک کا سربراہ بن گیا ہے وہ قوم کو مایوس نہیں کریں گی اور یہ حقیقت ہے کہ ایوب خان جیسے آمر کے ساتھ صرف محترمہ ہی مقابلہ کر سکتی ہیں۔ حالانکہ ابھی بھی شک و شبہات ہیں کہ حکومت ہر ممکن طریقے سے انہیں شکست دینے کی کوشش کرے گی۔ کیونکہ سرکاری ذرائع ان کے ساتھ ہیں۔ خدا کرے ایسا نہ ہو۔ آج انکے جلسے میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ لوگ ان کا دل و جان سے خیر مقدم کر رہے ہیں اور ان کا خوف و ہراس ختم ہو گیا ہے۔

محترمہ نے رات مرالہ ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا۔ جو سیالکوٹ سے صرف چند کوس پر ہے۔ سیالکوٹ میں کوئی اچھا ہوٹل نہیں پھر مرالہ پرسکون اور خاموش جگہ ہے۔ ان کے ساتھ آئے ہوئے لوگ ہمارے ہاں ٹھہرے۔ ہمارے گھر میں بہت رونق ہے۔ خورشید سارا وقت محترمہ کے ساتھ ہیں اور ہر جگہ ان کے ساتھ جاتے ہیں۔

ان کے چیف پولنگ ایجنٹ ہیں۔ اور خوش ہیں۔ یہ خدا نے انہیں محترمہ کے لیے کچھ کرنے کا ایسا موقع دیا۔ کہ ان کی مہربانی کا بدلہ وہ چکا سکتے کچھ اس کا انہیں اور مجھے بھی احساس ہے۔

کل رات میں خورشید کے ساتھ محترمہ کو ملنے مرالہ ریسٹ ہاؤس میں گئی تھی۔ ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے مجھے ان کے کھانے کی پسند کا علم ہے۔ پالک گوشت، ملی جلی سبزیاں، سادہ چاول، سلاد اور دیگی کباب بنوائے۔ میٹھے میں چاولوں کی کھیر اور انڈے کی سادہ پڈنگ بنائی۔ یہ دونوں میٹھے انہیں پسند ہیں۔ لیکن آج انہوں نے نہیں کھائے۔ کھانا بھی کم کھایا۔ شاید تھک گئی ہیں۔

میں بھی زیادہ وقت ان کے ساتھ نہیں بیٹھی۔ صبح روانگی ہے۔ اور وہی سفر اور وہی جلسے اور لوگوں سے ملنا ملانا۔ خدا انہیں صحت دے اور مدد فرمائے۔ الیکشن لڑنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ ویسے ماشاءاللہ پرعزم اور مطمئن ہیں۔

جب میں نے کہا کہ لوگ انکے ساتھ ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ کامیاب نہ ہوں۔ کہنے لگیں "حکومت یہ نہیں چاہتی اور وہ ہر حربہ استعمال کریں گے۔ یہ میری فتح شکست میں بدلنا چاہتے ہیں۔ پاکستان سے محبت کی وجہ سے اپنے لوگوں کے اصرار پر اس مشکل مہم پر نکلی ہوں۔ یہ نہیں چاہتی کہ قائداعظمؒ اور ان کے ساتھیوں کی محنت ضائع ہو۔ اگر میں الیکشن ہار گئی تو آمریت کا اندھیرا چھا جائے گا اور جمہوریت کا راستہ کھو جائے گا۔ پاکستان کی بنیاد جمہوریت کا استحکام ہے۔ اس میں ناکامی بھی ہوتی ہے لیکن ایک بار یہ سلسلہ استوار ہو جائے تو ملک ترقی کرسکتا ہے۔ ورنہ صرف ایک شخص کی مرضی اور عقل سے ملک اگر چلایا جائے تو بہتری کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوسکتی۔ باہمی مشاورت ضروری ہوتی ہے۔ اور یہی جمہوریت ہے۔ ایک شخص کی رائے اہم

نہیں ہوتی اور پھر ملک کو باوقار طریقے سے چلانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ اس لیے ڈکٹیٹر کو ملک کا سربراہ نہیں ہونا چاہیے' وہ اگر محب الوطن بھی ہو پھر بھی ایک فرد واحد کی سمجھ بوجھ پر ملک کی تقدیر حوالے نہیں کی جا سکتی۔

میں نے کہا "محترمہ آپ درست فرماتی ہیں' تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ فرانس میں نپولین اور جرمنی میں ہٹلر نے اپنے ملک اور قوم کو داؤ پر لگا دیا۔ شکست اور بربادی سے دوچار ہوئے۔ لیکن لوگ تاریخ سے سبق نہیں سیکھتے۔"

محترمہ اب سونا چاہتی تھیں۔ میں شب بخیر کہہ کر ساتھ والے کمرے میں سونے کے لیے آ گئی اور دل ہی دل میں ان کی کامیابی اور زندگی کے لیے دعا کی۔

محترمہ بچوں کی پرورش میں ماں کے رول کو بہت اہمیت دیتی تھیں۔ مجھے یاد ہے اُن کی بھانجی کی بیٹیاں گلشن اور زہرہ اکثر چھٹی کے دن محترمہ کے پاس پورا دن گزارا کرتی تھیں۔ ایک روز ایک بہن نے محترمہ کو کہا کہ اسکے بچے کا پیٹ کئی دنوں سے خراب ہے۔ کسی دوائی کا اثر نہیں ہوتا۔ چڑچڑا بھی ہو گیا ہے۔ روتا ہے' سمجھ نہیں آتی۔ محترمہ کہنے لگیں: "میں نے تمہیں کئی بار کہا ہے کہ بچے کو ہر وقت آیا کے حوالے نہ کیا کرو۔ اسکے کھانے اور نگہداشت پر تمہیں خود دھیان دینا چاہیے۔ ماں کا فرض ہے کہ بچے کو زیادہ سے زیادہ وقت دے۔ پھر تم مائیں فوراً ہی اپنا دودھ دینا بند کر دیتی ہو۔ آخر کیوں! قدرت نے ماں کے دودھ کو صحت اور نگہداشت سے نوازا ہے۔ پھر ماں اور بچے اس طرح قریب بھی ہوتے ہیں۔ ہر عمر میں والدین خاص طور پر ماں کی توجہ بچوں کے لیے اہم ہوتی ہے۔ لیکن اتنے چھوٹے بچے کو تو بہت ہی ماں کی ضرورت ہے۔ پھر آیا میں صفائی کا وہ معیار تو نہیں ہوسکتا۔

16 نومبر 1964ء

طوفانی جلسے

مشرقی پاکستان کا دس روزہ دورہ کر کے محترمہ 16 نومبر سے پھر مغربی پاکستان کا دورہ کر رہی ہیں۔ خورشید ان کے ساتھ ہیں۔ حالات ان کے حق میں ایسے ہیں کہ حکومت جلد سے جلد الیکشن کروانا چاہتی ہے۔ شاید جنوری کے شروع میں ہو جائیں۔ مس جناحؒ تحریک آزادی کی شمع ہیں اور موجودہ طرز حکومت کے مظالم کے خلاف ان کی آواز ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی ہے اور عوام نے اس نحیف لیکن سچ اور صداقت کی آواز پر لبیک کہا ہے۔ لگتا ہے محترمہ الیکشن یقیناً جیت سکتی ہیں اگر حکومت دھاندلی نہ کرے۔ ملک کے دونوں حصوں میں بنیادی جمہوریت کے الیکشن ہو گئے ہیں جن میں مس جناحؒ کے حامی لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کے سامنے آ جانے سے لوگوں کا ڈر اور خوف بالکل دور ہو گیا ہے۔ گویا یہ کوئی دوسرا ملک اور دوسرے عوام ہیں ورنہ ان کی کچلی ہوئی اور دبی ہوئی آوازیں کئی سالوں سے سسکیاں لیتی تھیں اور انہیں دم مارنے کی اجازت نہ تھی۔

خدا کرے حق کی کامیابی ہو اور اس ملک میں سچائی اور صداقت کا بول بالا ہو۔ چند لوگوں کے امیر بن جانے اور اکا دکا فیکٹریاں اور ملیں کھل جانے سے کسی ملک کی خوشحالی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ حالت تو یہ ہے کہ گزشتہ چند سالوں میں امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہو گیا ہے اور ہمارا متوسط طبقہ بالکل کچل کر رہ گیا ہے۔

آج انہوں نے سیالکوٹ کے جلسہ عام میں تقریر کی۔ رات ان کا قیام سرکٹ ہاؤس میں تھا۔ خورشید اور میں شام کو انہیں لینے گئے۔ وہ تو ان کے ساتھ ہی ہیں۔ ہمیں دیکھنے آئے تو میں بھی انہیں ملنے چلی گئی۔ گھر سے دو چار پکی ہوئی چیزیں ان کے پسند کی ان کے لیے لے گئی۔ اتنے کام اور سفر کے باوجود ان کے چہرے پر کوئی تھکاوٹ نہیں تھی۔ میں نے ان سے کہا:

''محترمہ! قوم اور ملک نے آپ کی ایسے حمایت کی ہے کہ لوگوں کا ڈر بالکل ختم ہو گیا ہے جو ایک معجزے سے کم نہیں۔ یوں لگتا ہے ہماری قوم جاگ اٹھی ہے۔''

کہنے لگیں: ''لوگ میرے ساتھ ضرور ہیں لیکن حکمران پارٹی ہر ممکن اور غلط طریقے سے بی۔ ڈی ممبرز کو بلیک میل کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ ان کے ساتھ طاقت ہے۔ ہر قسم کے ذرائع ہیں۔''

میں نے کہا: ''ہمارے ساتھ عوام اور اللہ کا ساتھ ہے جو چیز خدا کو منظور ہو، ہو جاتی ہے۔''

''کیسی عوام؟'' ذرا غصے سے بولیں: ''جو خریدی جا سکتی ہے جس کا ایمان کچا ہے۔ وقت آنے پر بہت کم ثابت قدم رہ سکیں گے۔''

خدا کرے ان کے خدشات درست ثابت نہ ہوں۔ ویسے صرف 80 ہزار بی۔ ڈی ممبرز اتنے لاکھ آبادی کی نمائندگی کریں گے۔ ڈر ہے لوگ ڈر نہ جائیں اور گھبراہٹ میں غلط فیصلہ نہ کر لیں۔''

حالات کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ حکومت جلد سے جلد الیکشن کروانا چاہتی ہے۔ شاید جنوری کے شروع میں ہو جائیں۔ مس جناحؒ کی آواز جو انہوں نے موجودہ فوجی حکومت کے مظالم کے خلاف اٹھائی ہے وہ ملک کے ہر کونے میں پہنچ گئی ہے اور

عوام نے اس نحیف لیکن سچی اور صداقت کی آواز پر بھرپور توجہ دی ہے۔ عوام کے بڑھتے ہوئے طوفانی جلسوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ محترمہ الیکشن میں ضرور کامیاب ہو جائیں گی اگر حکومت نے زیادہ دھاندلی نہ کی۔ حکمران پارٹی ہر قیمت اور ہر طریقے سے دن رات لوگوں کے ووٹ لینے کی کوشش کر رہی ہے تاکہ لوگ بالکل بے بس ہو جائیں۔ ملک کے دونوں حصوں میں بنیادی جمہوریت کے الیکشن ہو گئے ہیں۔ ان میں محترمہ کے حامی ووٹروں کی تعداد زیادہ ہے۔ آئندہ بھی یہ ہو سکتا ہے مس جناحؒ کے نڈر اور پراعتماد رویے سے لوگوں کا ڈر اور خوف دور ہو گیا ہے۔ گویا یہ کوئی دوسرا ملک اور دوسرے عوام ہیں۔ ورنہ ان کی آوازیں دبی ہوئی تھیں۔ مارشل لاء میں تو ویسے بھی عوام سہم جاتے ہیں۔ کچھ کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے ہیں۔

خدا کرے پاکستان میں سچائی اور صداقت کی فتح ہو۔ چند لوگوں کے امیر بن جانے سے کسی ملک کی خوشحالی کا اندازہ نہیں لگانا چاہیے۔ حالت تو یہ ہے کہ گزشتہ چند سالوں میں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہو گیا ہے اور متوسط طبقہ بالکل پچل کر رہ گیا ہے۔

12 دسمبر 1964ء

عوام کی حمایت

مس جناحؒ کو قوم اور ملک کی بے پایاں حمایت حاصل ہے۔ لوگوں کا ڈر ختم ہو گیا ہے۔ یوں لگتا ہے ساری قوم جاگ اٹھی ہے اور ان کے ساتھ ہے لیکن حکمران پارٹی ہر ممکن اور غلط طریقے سے بی ڈی ممبرز کو بلیک میل کرنے کی کوشش میں ہے۔ ان کے ساتھ طاقت ہے اور ہر قسم کے ذرائع ہیں۔ مس جناحؒ کے ساتھ عوام اور اللہ کا ساتھ ہے۔ جو چیز اللہ کو منظور ہو، ہو جاتی ہے۔ لیکن جانے اللہ کو اس قوم کی بہتری بھی منظور ہے یا نہیں؟ الیکشن میں چند دن رہ گئے ہیں اور آنے والے دنوں کا ہر لمحہ انتظار اور اضطراب بڑھاتا ہے۔

2 جنوری 1965ء

انتخابات میں دھاندلی

آج ملک کی تاریخ میں ایک اہم دن ہے۔ صدارتی اُمیدواروں کے پولنگ کا آغاز صبح ساڑھے آٹھ بجے ہوا۔ چار بجے شام تک غیر سرکاری طور پر انتخابات کے نتائج کا اعلان کر دیا گیا۔ مس جناح کو 28,691 ووٹ ملے اور صدر ایوب کو 49,951۔ انتخابی مہم کے دوران مشرقی اور مغربی پاکستان کے لوگوں کے جوش و خروش کے پیش نظر محترمہ فاطمہ جناح کی کامیابی یقینی نظر آتی تھی لیکن انتخابات میں وسیع پیمانے پر گڑبڑ کی گئی۔ مس جناح نے ملک میں جمہوریت کی جو شمع روشن کی تھی وہ وقتی طور پر بجھ گئی ہے۔ وہ اس عمر میں قوم اور ملک کی خاطر عملی سیاست میں آئیں۔ دن رات سفر کیا، محنت کی، کام کیا اور عوام کے سوئے ہوئے ضمیر کو جھنجھوڑا۔ لوگوں میں خوف و ہراس جس طرح ختم ہوا وہ حیران کن تھا۔ اس کے باوجود کہ حکومت کے سارے ذرائع الیکشن میں کام کر رہے تھے اور لوگوں پر تشدد اور دباؤ بھی تھا لیکن آخر وہ 28631 لوگ بھی تو ان ہی میں سے ہیں جنھوں نے انہیں ووٹ دیئے۔ اچھے اور مخلص لوگوں کی ابھی بھی کمی نہیں۔ لیکن بکنے والے لوگ ہمیشہ زیادہ ہوتے ہیں اور یہی قوم کا المیہ ہے۔

نوٹ: سرکاری طور پر انتخابات کے نتائج کا اعلان 8 جنوری کو کیا گیا۔

اگر مس جناح الیکشن جیت جاتیں تو ملک کی تقدیر بدل جاتی۔ سیاست بدل جاتی اور پاکستان کا مستقبل روشن ہو جاتا۔ جمہوریت کی شمع روشن ہو جاتی۔ کاش! ایسا ہوتا۔

الیکشن میں خورشید محترمہ کے الیکشن ایجنٹ بھی تھے۔ صدر ایوب کے چیف الیکشن ایجنٹ شیخ خورشید احمد تھے جو خورشید کے بہترین دوست تھے۔ دونوں مخالف سمت بیٹھے تھے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا بھی رہے تھے۔ حکومت کے کسی چھوٹے جب کاغذات نامزدگی داخل ہو رہے تھے کہا: ''خورشید صاحب محترمہ کے کاغذات نامزدگی کیسے داخل کروا سکتے ہیں۔ ان کا تعلق تو کشمیر سے ہے وہ تو پاکستانی نہیں ہیں۔'' محترمہ کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے کہا: ''اگر خورشید پاکستانی نہیں تو یہاں کوئی بھی پاکستانی نہیں'' اس سے بڑھ کر خراج تحسین خورشید کے لیے اور کیا ہو سکتا ہے۔

3 اپریل 1966ء

افسانوی موہٹہ پیلس

خورشید کی آزاد کشمیر کی صدارت سے استعفی اور دولائی جیل میں قید بندی کے بعد اب ہم لوگ پھر کراچی آگئے ہیں۔ نرسری میں ایک گھر کرائے پر لے لیا ہے۔ یاسمین اور ایرج سکول میں داخل بھی ہو گئے ہیں۔ خرم چھوٹا ہے سکول نہیں جاتا۔ میں اور خورشید مہینے میں کم از کم دو بار محترمہ کو ملنے جاتے ہیں۔ اب وہ فلیگ سٹاف سے موہٹہ پیلس میں رہائش پذیر ہیں۔ بڑا شاندار گھر ہے۔ چوڑی اونچی دیواروں میں خوبصورت پتھروں کی یہ افسانوی عمارت دیو مالائی کہانیوں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ بڑے بڑے کمرے اونچی چھتیں وسیع وعریض ایوان ہیں۔ گذشتہ صدی کی تعمیر شدہ یہ عمارت محترمہ کی رہائش گاہ ہے۔ محترمہ اکیلی اتنے بڑے گھر میں رہتی ہیں۔ لیکن یہ ان کی زندگی کے اوقات ہیں جنہیں وہ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد بہت خوبصورت انداز سے نبھا رہی ہیں۔ ہمت اور عزم کا مجسمہ ہیں۔ مصروفیت کے باوجود اتنے بڑے گھر میں رہنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن قائداعظمؒ کی بہن ہیں اور شاید قائداعظمؒ کی بہن کو ایسا ہی نڈر دلیر اور حوصلے والا ہونا چاہیے۔

آج عید تھی۔ ہم محترمہ کو عید ملنے گئے اور بچوں کو بھی ساتھ لے گئے۔ محترمہ کے پاس بہت لوگ تھے۔ عید ملنے کے لئے سب آئے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جاتے تھے۔ بچے باہر کھیلتے رہے۔ جب ذرا فارغ ہوئیں تو ہم نے بچوں کو بھی سلام کرنے کے لئے بلایا۔ یاسمین میں بڑا حوصلہ ہے کم سنی کے باوجود لوگوں سے گھبراتی

نہیں۔ آگے ہو کر ملتی ہے اور بڑی تدبر کا مظاہرہ کرتی ہے۔ ایرج اور خرم شرمیلے ہیں اور زیادہ لوگوں میں آگے نہیں بڑھتے۔ آج تینوں نے محترمہ کو سلام کیا اور شرما کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ محترمہ خوش ہوئیں اور تھوڑی دیر کے بعد 10 اور 5 روپے کے کچھ نوٹ ان کے سامنے رکھ دیئے اور کہنے لگیں ''ایک ایک نوٹ تم اپنی عیدی کے طور پر اٹھا لو۔ سب سے پہلے یاسمین نے 10 روپے کا ایک نوٹ اٹھایا اس کو دیکھ کر دونوں لڑکوں نے بھی 10 روپے کا ایک ایک نوٹ اٹھا لیا۔ محترمہ خوب ہنسیں اور کہنے لگیں: ''تمہارے باپ کو تو ابھی تک 10 اور 5 روپے کے نوٹ میں فرق محسوس نہیں ہوا تمہیں اس عمر میں فرق کیسے پتہ چل گیا ہے۔ یہ اچھا ہے۔'' لیکن بچے بھی باپ کی طرح ہیں۔ انہیں بھی 10 اور 5 کے نوٹ میں اب بھی فرق محسوس نہیں ہوا۔ شاید ماں باپ کی تربیت اور خون کا اثر لازمی طور پر بچوں پر پڑتا ہے۔

محمد طارق اقبال پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

16 مئی 1966ء

مغربی اقوام اور کشمیر

اس بار بہار چپکے سے آئی اور گزر گئی۔ بہار کی آمد کا احساس بھی نہ ہوا۔ میری نظریں چٹکتی کلیوں اور نیم واشگوفوں کو دیکھنے کے لیے ترستی رہیں۔ لیکن شاید کراچی میں بہار ہی نہیں آتی۔ سدا ایک سا موسم رہتا ہے۔ جو اُکتا دینے والا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ سمندر کی ہوائیں فرحت بخش ہیں اور تازگی کا احساس دیتی ہیں۔

خورشید نے مجھے صبح کہا کہ میں محترمہ کو فون کر کے پوچھوں کہ اگر وہ آج فارغ ہوں تو ہم اُن کے پاس آئیں گے۔

میں نے انہیں فون کیا اور آنے کی اجازت چاہی۔ فرمانے لگیں: "ضرور آؤ۔ شام چھ بجے وہ ہمارا انتظار کریں گی۔"

ہم دونوں گئے۔ ان دنوں وہ موہٹہ پیلس میں رہائش پذیر ہیں۔ جب ہم ان کے پاس رہتے تھے تو وہ فلیگ سٹاف ہاؤس میں رہتی تھیں۔ وکٹورین طرز کی وہ خوبصورت عمارت ابھی بھی میری یادوں میں بسی رہتی ہے۔

یہ گھر بہت بڑا اور وسیع ہے۔ کلفٹن کے پاس ہے۔ سمندر کی ہوائیں بہت خوشگوار ہیں۔ لیکن فلیگ سٹاف ہاؤس کی اپنی ہی ایک پہچان تھی۔ محترمہ کو بھی وہ گھر زیادہ پسند تھا۔ سوچتی ہوں کہ اتنے بڑے گھر میں وہ تنہا رہتی ہیں۔ نوکروں کے کوارٹر بھی گھر سے ہٹ کر ہیں۔ اتنے بڑے گھر میں اکیلی ہوتی ہیں۔ خدا نے انہیں بڑی ہمت سے نوازا ہے۔ فلیگ سٹاف ہاؤس سے بھی یہ بڑا گھر ہے۔ اتنے بڑے بڑے ہال نما کمرے اور محترمہ کا وجود جو تن تنہا یہاں ہمت اور عزم کے ساتھ اکیلی رہتی ہیں۔

قائداعظم کی بہن کو شاید ایسا ہی ہونا چاہیے۔ پاکستان حاصل کرنے کی جنگ میں وہ بھی تو اپنے عظیم بھائی کی شریک سفر رہی ہیں۔ اتنی نڈر اور بہادر نہ ہوتیں تو کیسے اس کٹھن منزل کی ساتھی ہوتیں۔ ان کی زندگی تو ہم سب کے لیے ایک سبق ہے۔ میں بہت کوشش کرتی ہوں کہ ان کی زندگی سے کچھ سیکھوں۔

خورشید سے انہوں نے انکے کام کا پوچھا انہوں نے بتایا۔ فرمانے لگیں کہ پروفیشن میں بریک آ جائے تو پریکٹس استوار ہونے میں دیر لگتی ہے۔ لیکن ہمت قائم رکھنی چاہیے۔ ملک کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ موجودہ حکومت کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا: "قائداعظمؒ کے ذہن میں ملک کے متعلق یہ تصور نہیں تھا جو حکمرانوں نے اپنا لیا ہے۔ کھلے ذہن اور تعصب سے ہٹ کر کام کرنا ہی اصل بات ہے۔ اہم باتوں پر حکمرانوں کی توجہ نہیں پڑتی۔ غیر ضروری باتوں پر وقت ضائع کرتے ہیں۔ خورشید نے ہنستے ہوئے کہا" میرے لیے بھی روز پولیس کی ایک گاڑی اور دو باڈی گارڈ میرا تعاقب کرنے آ جاتے ہیں۔ گویا میں کسی طرح سے وطن دشمن ہوں۔ حیرت ہے کہ حکومت کی یہ کیسی سوچ ہے۔"

محترمہ نے کہا: "اسی لیے فوج کی حکومت ٹھیک نہیں ہوتی۔ ان کی سوچ ان باتوں میں محدود ہوتی ہے جن حالات میں تم نے آزاد کشمیر کی حکومت سے استعفیٰ دیا ہے۔ تم یقیناً ان کے نزدیک محب الوطن لوگوں میں شمار نہیں ہوئے۔ اس لئے پیچھا کرتے ہیں۔ بحرحال دلچسپ بات یہ ہے کہ مخلص لوگوں کی انہیں پہچان نہیں۔"

باتوں باتوں میں کشمیر کا ذکر آ گیا۔ محترمہ فرمانے لگیں: "یہ مسئلہ دن بدن الجھتا جا رہا ہے اور اسکے حل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ حیرت ہے کہ یو این او کے ادارے جو دنیا میں امن قائم رکھنے اور انسانوں کے حقوق کی بحالی کی ایک موثر تنظیم

ہے نے ابھی تک کشمیر کے مسئلے کے حوالے سے کچھ نہیں کیا۔ یہ مغربی قوموں کی بے حسی اور عدم توجہ ہے۔ شاید اس میں ہماری کوتاہی بھی ہے پھر بھارت کا غاصبانہ حق اور جھوٹا پراپیگنڈہ بھی ہے۔ مغربی قومیں مسلمان کی دوست نہیں۔ ان سے ہمدردی کی توقع بھی فضول ہے۔ مستقبل قریب میں تو اس مسئلہ کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ شاید بعد میں کوئی بہتر صورت نکل آئے۔ لیکن ہمیں بھی خود کو منظم اور مضبوط کرنا چاہیے۔ اپنے حقوق منوانے کے لیے خود کو مضبوط کرنا بڑا ضروری ہے۔"

سوچتی ہوں، حکمران قابل اور مخلص لوگوں کی قومی مسائل پر آراء سے استفادہ کیوں نہیں کرتے۔ شاید اس سے کوئی راہ نکل سکے۔ محترمہ نے کشمیر کے حوالے سے کہا۔ اس مسئلے کے حل ہی میں برصغیر کا امن ہے۔ اور بین الاقوامی حالات کی بہتری ہے کیونکہ کشمیر کا محل وقوع اور جغرافیائی حیثیت منفرد ہے۔ خطے کے امن کے لیے کشمیر کا خطہ بڑا اہم ہے......"

قائداعظم کو بھی اس کا قلق تھا۔ زیارت میں اپنی جان لیوا بیماری کے دوران آخری دنوں میں ایک بار بے ہوشی میں انہوں نے کہا تھا: "کشمیر کمیشن کے ارکان نے مجھ سے ملنے آنا تھا۔" کشمیر ان کے اعصاب پر سوار تھا۔

28 جون 1966ء

انڈس واٹر ٹریٹی--ایک گھناؤنی سازش

کراچی میں ان دنوں بڑا حبس اور گرمی ہے۔ البتہ شامیں اچھی ہیں۔ شام کو ہم دونوں محترمہ کو ملنے گئے وہ اس وقت سمندر کے کنارے ڈرائیو کے بعد واپس آئی تھیں۔ سمندر انہیں بہت مرغوب ہے۔ جس طرح سمندر میں وسعت ہے اس طرح ان کے افکار و خیالات میں بھی وسعت ہے۔ ان کی نشست گاہ میں بیٹھے تو انہوں نے دن کی گرمی کا ذکر کیا۔ بڑھتی ہوئی آبادی کا بھی ذکر کیا۔ کہنے لگیں: "ملک کے ذرائع ہماری ضروریات کو شاید پورا نہ کر سکیں اس لیے کہ مستقبل کے متعلق حکومت اور کارکن نہیں سوچتے۔ مجھے لگتا ہے کہ چند سالوں میں پانی کا مسئلہ پاکستان کے لیے تشویش ناک ہوگا۔ اس بارے میں حکومت کی سوچ قابلِ مذمت ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور ہمارے محدود ذرائع باعثِ تشویش ہیں۔ سوچنے والی بات ہے کہ ایوب خان نے ہمارے تین دریا بیاس، راوی اور ستلج بھارت کے پاس 100 کروڑ روپیوں میں بیچ دیئے ہیں۔ انڈس واٹر ٹریٹی تو مجھے ایک گھناؤنی سازش لگتی ہے۔ میری بات یاد رکھنا۔ بھارت کے حکمران اتنے عیار ہیں کہ جگہ جگہ ڈیم بنا کر ان دریاؤں کا پانی اپنی طرف منتقل کر لیں گے۔

چناب اور جہلم پاکستان کے حصے میں ضرور آئے ہیں، لیکن بھارت ان پر بھی ڈیم بنائے گا۔ لگتا ہے ایسی صورتِ حال میں آئندہ 30 سالوں میں پاکستان پانی کی قلت کا شکار ہو جائے گا۔ یہ حکمران نہیں ہونگے لیکن آئندہ نسلیں تکلیف اٹھائیں گی۔

خورشید کہنے لگے۔ میرے استعفیٰ دینے کی اور وجوہ میں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے اس خدشے کا اظہار کیا تھا جو حکومت کو اچھا نہیں لگا۔

ملک میں ڈیم بننے چاہئیں محترمہ فرمانے لگیں: ''یہی ایک حل ہے کالا باغ ڈیم بننا بہت ضروری ہے۔ بڑا مسئلہ اس سے حل ہوگا۔ سندھ کا بہت سا پانی سمندر میں گر کر ضائع ہو جاتا ہے لیکن ہمارے بڑے بڑے لوگوں کی زمین اور ذاتی فائدے سدِ راہ ہیں اور یہ بہت تشویش ناک ہے۔

میں پانی سے سیراب چشموں، دریاؤں، ندی نالوں اور آبشاروں کے ملک کی پروردہ ہوں مجھے تو ویسے بھی بہتا پانی بہت اچھا لگتا ہے۔ پاکستان میں بھی کسی چیز کی کمی نہیں۔ قدرت نے بڑی نعمتوں سے اس ملک کو نوازا ہے لیکن حکمران ایسی اہم باتوں کو آخر کیوں نہیں سوچتے۔

واپسی پر دیر ہوگئی...... ہم کھانے کے لیے باہر چلے گئے...... کافی دیر سے واپس آئے اور مجھے اس لیے اچھا لگا کہ آج تاروں سے بھری ہوئی بھیگی بھیگی رات ہے۔ افسردہ سی لگتی ہے۔ لیکن مجھے ایسی راتیں اچھی لگتی ہیں۔ کراچی میں چمکتے ستارے روز نظر نہیں آتے۔ ایسی راتوں میں نظر آتے ہیں۔ کاش! ساتھ استادہ اونچے اونچے درخت بھی ہوں۔ سرسبز...... بھی ہوں جو اس رات میں اور حسن بھر دیں۔

9 جولائی 1967ء

محسنۂ ملت کا انتقال پُر ملال

9 جولائی 1967ء کو محترمہ فاطمہ جناحؒ اچانک وفات پا گئیں۔ یہ ایک ایسا سانحہ تھا جس سے خورشید بہت ہی دلبرداشتہ ہوئے۔ میں بچوں کی چھٹیاں ہو جانے پر اپنے والدین کے پاس کراچی سے سیالکوٹ آ گئی تھی۔ خورشید نے عدالتیں بند ہونے پر آنا تھا جہاں سے ہم نے مری جانا تھا۔ ان ہی دنوں ہم نے یہ فیصلہ بھی کرنا تھا کہ ہم کراچی سے لاہور منتقل ہو جائیں۔ آزاد کشمیر کی سیاست کی وجہ سے انہیں کراچی سے آنا پڑتا تھا۔ وہ اب مشکل ہو گیا تھا۔ بہت وقت ضائع ہوتا تھا اس لیے کچھ عرصہ سے لاہور منتقل ہونے کا سوچ رہے تھے۔

ان ہی دنوں محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ ایک رات پہلے وہ ایک شادی میں شریک ہوئیں اور صبح ان کے کمرے کا دروازہ نہ کھلا۔ ان کی عادت تھی کہ صبح 7 بجے اپنے کمرے کا دروازہ کھولتی تھیں۔ بیرا اخبار اور چائے لے کر ان کے کمرے میں آتا تھا اور وہ چائے پی کر اخبار دیکھ کر نیچے 8 بجے ناشتے کے لیے آتی تھیں۔ یہ اوقات ہم نے فلیگ سٹاف ہاؤس کے قیام کے دوران دیکھے تھے۔ ان دنوں محترمہ فلیگ سٹاف ہاؤس سے منتقل ہو کر ''قصرِ فاطمہ'' میں جس کا پہلا نام موہٹہ پیلس تھا، رہائش پذیر تھیں۔ اتنے بڑے گھر میں وہ بالکل اکیلی ہوتی تھیں۔ نوکروں کے کوارٹرز کافی فاصلے پر تھے۔ لیکن یہ ان کی زندگی کے اوقات تھے جنہیں وہ نہایت دلیری اور حوصلہ سے نبھا رہی تھیں۔ 8 بجے کے بعد ان کی مصروفیات شروع ہو جاتی تھیں۔ ان کی زندگی بڑی بھرپور تھی جس میں کوئی خلا نہ تھا۔

اس صبح جب دروازہ نہ کھلا تو نوکر نے کچھ دیر انتظار کیا۔ پھر دروازہ پر دستک دی۔ پھر بھی نہ کھلا تو اس نے لیڈی ہدایت اللہ کو اطلاع دی۔ یہ سر غلام حسین ہدایت اللہ کی بیگم صاحبہ ہیں جو سندھ کے گورنر تھے۔ محترمہ سے ان کی بہت دوستی تھی اور وہ تقریباً روز ہی انہیں ملنے آتی تھیں۔ لیڈی ہدایت اللہ خود آ گئیں لیکن دروازہ بدستور بند تھا۔ پریشان ہو کر غسل خانہ کی کھڑکی توڑی گئی کمرے میں جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ محترمہ خالقِ حقیقی سے جا ملی ہیں۔ چند گھنٹے پہلے بستر پر ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ غالباً دل کا دورہ تھا جو نیند میں پڑا اور جان لیوا ثابت ہوا۔ کمشنر کراچی کو اطلاع دی گئی۔ ڈاکٹر بھی آئے اور یہی تصدیق ہوئی کہ چند گھنٹے پہلے وفات ہوئی ہے۔

ان کی اچانک موت پر مختلف افواہیں پھیلیں۔ بہت باتیں ہوئیں کہ انہیں نیند میں گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے اور ان کے گلے پر نیل کے نشان تھے۔ لیکن اس المیہ کی تحقیقات نہ ہوئی نہ کبھی پتہ کروایا گیا۔ اس لیے ان کی موت معمہ ہی رہی۔ لیکن عام تاثر یہی تھا کہ طبعی موت تھی اور نیند میں جان لیوا دل کا دورہ پڑا۔

محترمہ کی ڈائری میں جن لوگوں کے نام تھے کہ ان کی موت یا بیماری کی صورت میں انہیں اطلاع دی جائے ان میں خورشید کا نام بھی تھا۔ مطلوب الحسن سید حسن اے شیخ اور حسن اصفہانی جو اتفاق سے ملک سے باہر تھے۔

خورشید فوراً چلے گئے۔ شہر میں یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں محترمہ کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ پولیس اور حکومت کے لوگ بھی آ گئے۔ شام تک یہ خبر سارے ملک میں پھیل گئی۔ جنازہ دوسرے روز صبح اٹھنا تھا۔ خورشید نے مجھے بعد میں بتایا کہ شام کے بعد سب لوگ اور دوست واحباب وہاں سے چلے گئے۔ وہ رات انہوں نے محترمہ کی میت کے ساتھ اکیلے ''قصر فاطمہ'' کی وسیع

نشست گاہ میں گزاری۔ سارے نوکر بھی چلے گئے کوئی موجود نہیں تھا۔ باہر پولیس کا پہرہ تھا۔ ''قصر فاطمہ'' کے کشادہ کمروں میں خورشید اپنی محسنہ کے ساتھ رات بھر رہے۔ قرآن مجید کی تلاوت کی اور وہیں صوفے پر نیم دراز رات کا پچھلا پہر بھی گزارا۔

صبح لاکھوں کے ہجوم میں محترمہ کی نمازِ جنازہ ہوئی۔ جنازے کے جلوس میں پولیس اور شہریوں میں تصادم بھی ہوا۔ لوگوں نے پولیس پر پتھر برسائے جس کے جواب میں پولیس نے آنسو گیس استعمال کی۔ اس ہنگامے میں ہماری موٹر کے بھی سارے شیشے ٹوٹ گئے۔ دراصل بعض محب الوطن یہ نہیں چاہتے تھے کہ انہیں پولیس کی معیت میں لے جایا جائے۔ وہ ہمیشہ ان باتوں سے متنفر تھیں۔ اس پر ہی جھگڑا ہوا۔ ہجوم کو قابو کرنا آسان نہیں ہوتا۔

محترمہ کو قائداعظمؒ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ نہایت اعزاز کے ساتھ۔ اس طرح ایک درخشاں باب ختم ہو گیا۔ ایک عہد ختم ہو گیا' ایک دور ختم ہو گیا۔ تحریکِ پاکستان کی ایک مجاہدہ' ایک عظیم خاتون کا انتقال ہو گیا جسے یہ اعزاز بھی حاصل تھا کہ وہ قائداعظمؒ کی نہ صرف بہن تھیں بلکہ اپنی زندگی کے تیس سال بھائی کے ساتھ گزارے تھے۔ اس عظیم جہاد میں شریک تھیں جس سے یہ ملک حاصل کیا گیا۔ سیاہ وسفید لمحے دیکھے۔ تحریک کی سرگرمیاں دیکھیں۔ وہ جلال دیکھا جو اس دور کے ساتھ وابستہ ہے جب برصغیر میں آزادی کی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ مایوسیاں دیکھیں جب آزادی کے اُفق پر سیاہ بادل بھی منڈلائے لیکن وہ دونوں ایک ایسے مقصد پر گامزن تھے' ایک ایسی راہ پر چل رہے تھے جہاں یہ باتیں غیر اہم تھیں۔

عظیم تھی وہ عورت جس کا نام فاطمہ جناحؒ تھا۔ نڈر اور بے باک۔ اصول ان کی زندگی تھے اس لیے بے خوف تھیں۔ میرے کانوں میں اب بھی کبھی کبھی ان کا یہ

جملہ گونجتا ہے جب 1958ء کے مارشل لاء کے بعد ملک میں ایوب خان صدر بن گئے تھے۔ باتوں میں بار بار وہ کہتیں:

"HE SHOULD GO TO BARRACKS"

وہ مارشل لاء اور فوج کی حکومت کو بہت برا سمجھتی تھیں۔ ہمیشہ کہتی تھیں کہ پاکستان میں صرف جمہوریت ہوگی۔ اس کی راہ کتنی بھی کٹھن ہو لیکن وہ ایک ہی راستہ ہے' وہی ایک نصب العین ہے جس کا خواب قائداعظمؒ نے دیکھا تھا۔ وہ تو اپنے بھائی کا "پرتو" تھیں۔ ان کی طرح سوچتی تھیں' ان کی طرح بات کرتی تھیں۔ ان کی طرح پاکستان سے محبت کرتی تھیں جو بقول قائداعظمؒ ہمیشہ قائم رہنے کے لیے معرض وجود میں آیا ہے......

شکر ہے محترمہ نے ایوب خان کے بعد اور مارشل لاء نہیں دیکھے۔ یحییٰ خان اور سب سے بڑھ کر ضیاء الحق کا طویل مارشل لاء نہیں دیکھا۔ یوں لگتا ہے کہ پاکستان شاید ان ڈکٹیٹرز کے لیے ہی بنا تھا۔ پاکستان کی تقریباً نصف صدی عمر میں زیادہ حکومت ان لوگوں نے ہی کی ہے جن کا پاکستان بنانے یا تحریک پاکستان کی قربانیوں میں ذرا بھر بھی حصہ نہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ ہم پاکستان کے اصل موقف سے ہٹ گئے ہیں۔ اس تحریک سے ہٹ گئے' ان قدروں سے ہٹ گئے جن کے لیے برصغیر میں مسلمانوں کے ایک الگ خطہ زمین کے لیے قائداعظمؒ اور ان کے مخلص ساتھیوں نے جدوجہد اور محنت کی تھی اور مسلمانوں کا سب سے بڑا ملک دنیا کے نقشے پر ابھرا تھا۔

16 اکتوبر 1966ء

اک شفیق خاتونِ خانہ

فلیگ سٹاف ہاؤس میں قیام کے دوران اکثر سوچا کرتی تھیں کہ ہم دونوں کو ان کا اتنا قرب حاصل ہے۔ وہ ذاتی شفقت کرتی تھیں جس کے متعلق خواب میں بھی کبھی نہیں سوچا تھا۔ ڈائری لکھنے والا بنیادی طور پر فوٹو گرافر ہوتا ہے جو زندگی کے بھاگتے ہوئے لمحوں اور جذبوں کو قید کر دیتا ہے تاکہ مستقبل میں ان تصاویر کو دیکھ کر ماضی کو دوبارہ زندہ کر سکے۔ میں نے بھی اسی جذبے کے تحت فلیگ سٹاف ہاؤس میں قیام کے دوران یہ ڈائری لکھی تاکہ محترمہ کے ساتھ گذارے ہوئے لمحے یادگار ہو جائیں۔ آپ کو یہ ساری باتیں ایک البم کی طرح لگتی ہیں۔ جو میں نے زندگی کے اس دور میں محترمہ فاطمہ جناحؒ کی رہائش گاہ پر گذارے۔ ان تصویروں میں جو یادوں کی اس البم میں لگی ہوئی ہیں۔ ایک تصویر کا مقام بہت ہی نمایاں ہے اور وہ تصویر خاتونِ پاکستان کی ہے جن کا انداز بے حد زندہ ہے۔ میں نے ان کی مصروفیات دیکھیں، ان کے شب و روز دیکھے، ان کے خیالات سنے۔ اس زمانے میں وہ بہت متحرک تھیں۔ ملک کے چوٹی کے لوگ اور سیاستدان صبح و شام ان سے ملنے آتے تھے۔ عام لوگ اور خاص طور پر طلبا بھی آتے تھے۔ کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرتیں۔ خوشامد خوف یا بناوٹ انہیں چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔

میں نے محترمہ کو اپنے قیام کے دوران دو مختلف حیثیت سے دیکھا۔ ایک سطح بحیثیت دانشور خاتون، قائداعظمؒ کی عظیم بہن۔ جنہوں نے قائداعظمؒ کا بحیثیت ایک

محمد طارق اقبال
پاکستان ورچوئل لائبریری ڈاٹ کام

شفیق بہن بے حد خیال رکھا۔ مادرِ ملتؒ کے روپ میں وہ زندگی پر، خاص طور پر سیاست، تاریخ اور ان کے منفرد مقام پر گفتگو کرتی تھیں۔ لیکن دوسری جانب وہ ایک انسانی سطح پر بھی منفرد نظر آتی ہیں۔ جن میں وہ بطور ایک انسان ایک فرد اور ایک خاتونِ خانہ کے طور پر نظر آتی ہیں۔ جب ہم انہیں چلتے پھرتے، صبح و شام کی ذمہ داریوں سے نپٹتے، ہم وطنوں کی بے بسی پر کڑھتے، اور پھر زندگی کو قبول کرتے دیکھتے ہیں اور کبھی ہم انہیں کپڑا اور پھل خریدتے بوہری بازار اور کلفٹن سٹریٹ میں جاتے دیکھتے ہیں، کبھی پھولوں کی نگہداشت نہ ہونے پر رنجیدہ، اور کبھی احباب کی محفلوں میں، کبھی انہیں موسم اور تقریب کے مطابق لباس کی اہمیت پر غور کرتے، کبھی کھچڑی اور دھنیے کی چٹنی پر اکتفا کرتے دیکھتے ہیں۔ غرض یہ کہ مختلف تصویریں اور مختلف روپ ہیں جن میں ان کی شخصیت کے کئی پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ رعب و آداب سے بھرپور یہ کردار جب قائداعظمؒ کے کمرے میں ان کی ذاتی اشیاء کو صاف کرنے کی غرض سے جاتا ہے تو متانت اور وقار کا لبادہ اتر جاتا ہے اور ہم انہیں ایک ایسی شفیق اور آبدیدہ بہن کے روپ میں دیکھتے ہیں جو قائداعظمؒ کو اپنے سے جدا تسلیم نہیں کرتی بلکہ ان سے باتیں کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے اور ان کی چیزوں کو اس طرح ترتیب دیتی ہے گویا وہ اب بھی یہیں کہیں موجود ہیں اور چند لمحوں میں آنے والے ہیں۔

میں نے محترمہ کے ساتھ اپنے قیام کے دوران نہ تو انہیں تاریخ کے صفحات سے نکالا اور نہ ہی ان کو ان کے سیاسی پس منظر کے پیشِ نظر انہیں سمجھنے کی کوشش کی۔ یوں میرے اور ان کے درمیان اپنائیت اور تعظیم کا ایک بڑا خوبصورت رشتہ قائم ہو گیا تھا اور میں اپنی محسنہ کو اپنے بہت قریب محسوس کرتی تھی۔ مجھے فخر ہے کہ مجھے زندگی کے اس خوبصورت دور میں محترمہ فاطمہ جناحؒ جیسا اُستاد اور فلیگ سٹاف ہاؤس جیسی درسگاہ ملی۔

محترمہ فاطمہ جناحؒ ایک سیاسی ذہن کے ساتھ تعلیم اور صحت جیسے اہم شعبوں میں بڑی واضح اور منفرد سوچ رکھتی ہیں۔ اکتوبر 1944ء میں وہ لاہور تشریف لائیں اور فاطمہ جناحؒ میڈیکل کالج کا افتتاح کیا۔ اس کی سرپرستی بھی اُنہوں نے کی اور آج اتنے سالوں کے بعد وہ کالج ملک میں خواتین ڈاکٹروں کی ایک بہترین درسگاہ ہے۔ اس کے علاوہ ملک میں بے تحاشا سکول اور ڈسپنسریاں کھولنے کے لئے اُنہوں نے عملی جدوجہد کی۔ کراچی میں خاتونِ پاکستان سکول جو صرف ان کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس وقت ڈگری کالج ہے۔ یہ محض ان کی ذاتی کوشش تھی۔ گو 56-1955 میں اتنا بڑا اور اچھا سکول کراچی میں قائم ہوا۔ اس کے لئے اُنہوں نے بڑا کام کیا۔ ایک بورڈ آف ٹرسٹیز بنایا۔ ایک گورننگ باڈی بنائی، جس کی سرپرستی وہ خود کرتی تھیں۔ ہفتہ میں دو بار سکول جاتی تھیں۔